پاکستان لوٹنے والے

بدقسمت پاکستان میں سیاستدانوں اور افسرشاہی کی کرپشن اور جرائم پر تحقیق

مجاہد حسین

Marfat.com

پاکستان لوٹنے والے

بدقسمت پاکستان میں سیاستدانوں اور افسرشاہی کی کرپشن اور جرائم پر تحقیق

ذخیرہ محمد اقبال مجددی لاہور

مجاہد حسین

تخلیقات

اکرم آرکیڈ، ۲۹۔ٹمپل روڈ (صفاں والا چوک) لاہور۔ پاکستان فون: ۷۲۳۸۰۱۴

136063

جملہ حقوق اشاعت بحق مصنف محفوظ ہیں

ناشر	:	لیاقت علی
		تخلیقات لاہور
پرنٹرز	:	طیب اقبال پرنٹرز لاہور۔
ٹائٹل ڈیزائن	:	امجد رفیق
سن اشاعت	:	جنوری 1997ء
کمپوزنگ	:	المدد کمپوزنگ سنٹر
قیمت	:	150 روپے

انتساب

پاکستان کی آخری امید

اللہ کے نام

Marfat.com

فہرست

دیباچہ 9

نارنگ میں جاگیریں سیاست اور جرم 13

لیاقت علی خان سے کھر تک

جنرل حمید گل نے سینکڑوں ایکڑ اراضی کیسے بنائی 29

پاکستان ریلوے کو لوٹنے والے کون 38

خالد احمد کھرل کا قبضہ گروپ 48

سوشل ایکشن بورڈز اربوں کے گھپلے 53

میاں اظہر نے زرعی فارم کیسے بنایا 60

مکئی خاندان کی کرپشن 65

مشتاق اعوان' مجبہ ڈوگر' رائے اعجاز جرائم کی پشت پناہ تکون 77

مراعات کی آڑ میں قومی خزانہ پر ڈاکہ 88

پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ میں کروڑوں کے گھپلے 96

پنجاب پبلک لائبریری کو کس نے لوٹا 105

میاں چنوں کے بہاری اور غلام حیدر وائیں کی کرپشن 111

زرعی یونیورسٹی فیصل آباد میں سیاستدانوں

کے پروردہ جرائم پیشہ گروہ 116

Marfat.com

زرعی یونیورسٹی میں کروڑوں کے گھپلے 125
غلام مصطفیٰ کھر نے سینکڑوں ایکڑ اراضی کیسے بنائی؟ 131
بیورو کریسی اور پولیس کا پروردہ کردار 136
محکمہ ہاؤسنگ پنجاب میں سیاست دانوں اور 143
بیورو کریسی کی لوٹ مار
"پولیس مقابلوں" کی آڑ میں قتل و غارت 150
جرائم پیشہ سیاستدانوں کا گڑھ .... گجرات 154
بی-ایل-ایف کے احسان اللہ کی لوٹ مار 178
سیاست اور جرم کا گڑھ "واھنڈو" 187
گوردوارے کی ہزاروں ایکڑ ارضی سیاستدانوں کے نرغے میں 192
منظور وٹو اور کروڑوں روپے کی کرپشن 197
سیاستدان سیلاب فنڈ بھی کھا گئے 207
عورتوں کی حالت اور ہمارا سیاستدان 213
زرداری کی پنجاب میں "کارروائی" اور گھپلے 220
ادارہ ثقافت اسلامیہ میں لوٹ مار 233
پیپلز پارٹی کا "منور منج گروپ" 245
35 ارب کے سندک پراجیکٹ میں گھپلے 254
قائد اعظم یونیورسٹی کی زمین کے گھپلے 260
چوہدری ظہور الٰہی خاندان اور پی پی ایل کی کرپشن 264
چوہدری برادری کا ایک اور کارنامہ 272
روزگار سکیم میں نواز شریف اور بینظیر کی کرپشن 280

Marfat.com

پہلی بات

گزشتہ چار برسوں سے میں اردو صحافت کی جس صنف یعنی تحقیقاتی رپورٹنگ سے وابستہ ہوں اس کو ہماری مروجہ اردو صحافت کوئی خاص اہمیت نہیں دیتی۔ "بیاناتی سرخیوں" سے مرتب پانے والے طرز صحافت میں زیادہ معتبر وہ قرار پاتا ہے جو برسراقتدار اور اقتدار سے باہر بیٹھے ہوئے طاقتور سیاستدانوں کے دھواں دھار بیانات کو احاطہ تحریر میں لا کر اپنے ایڈیٹر کے سپرد کرتا ہے۔ جبکہ اگر مجھ جیسا کوئی ہیچمدان کسی سیاسی رہنما یا قومی مصلح کے لامحدود اثاثوں' برسراقتدار ہوتے ہوئے اس کی کرپشن اور اس کی ایماء پر ہونے والی قتل و غارت اور دیگر جرائم کی تحقیق کے لیے سر مارتا پھرتا ہے، اور اخبار کی پالیسی سے لے کر جان کے خوف تک کی ہزار مصلحتوں سے گزر کر لکھنے کی کوشش کرتا ہے تو اسے فوراً "ایجنسیوں کا کارندہ" قرار دے دیا جاتا ہے۔ دوسری طرف "بیاناتی صحافت" کے ذریعے نمو پانے والا دانشور کا روپ دھارتا چلا جاتا ہے اور حکومتوں کا مقرب ٹھہرتا ہے۔ اس صورت میں لکھنا اور خصوصاً ان لوگوں پر لکھنا جن کے ایک اشارے پر درجنوں بے گناہ ذبح کر دیئے جاتے ہوں' ہزار مسائل کا موجب بن سکتا ہے۔ اس کتاب میں شامل اکثر رپورٹیں ہفت روزہ "آج کل" میں شائع ہو چکی ہیں جبکہ کچھ رپورٹیں گزشتہ چھ ماہ کے دوران لکھی گئی ہیں۔ پہلے سے شائع شدہ رپورٹوں میں وہ اعداد و شمار بھی شامل کر دیئے گئے ہیں جو شاید ایک جریدے میں نہیں چھپ سکتے تھے۔ چونکہ میں کوئی سیاسی یا نظریاتی وابستگی نہیں رکھتا' اس لیے میں نے جو کچھ لکھا ہے یا بدستور لکھ رہا ہوں' اس میں کسی نفرت یا کسی فرمائش کا قطعاً دخل نہیں۔ جو کچھ لکھا گیا ہے وہ حالات و شواہد کو مدنظر رکھتے ہوئے اور دستاویزی ثبوت سے مشروط رہ کر لکھا ہے۔ اس سارے عمل میں میری حوصلہ افزائی کرنے والوں عندلیب حیدر' زاہد حسین' خالد احمد' عبیداللہ بیگ' احمد سلیم' قریش پور' ثمینہ بٹ' محمد

شجاع الدین، سلیم خاں گمی، قیوم صدیقی، شیراز راج، عدنان عادل اور فاخرہ تحریم کا بے حد ممنون ہوں کہ ان سب کی بدولت میرے ارادے اور یقین کی آبیاری ہوتی رہی۔

مجاہد حسین

لاہور

پیش لفظ

پاکستانی ریاست اپنے پچاس سال پورے کرنے کے ساتھ ادھڑ بھی رہی ہے اور ادھڑنے کا عمل اپنی نوعیت میں نظریاتی ریاستوں کے ادھڑنے کے عمل سے مشابہت رکھتا ہے۔ یعنی مثالی سوچ پر قائم ریاست تخیلاتی تقاضے پورے کرتی کرتی شل ہو چکی ہے اور اس نقاہت کا سب سے نمایاں اشاریہ اخلاقیات کا زوال بنتا جا رہا ہے۔ جنرل ضیاء کے دور کے بعد جب نظریہ سازوں نے سوچا کہ ریاست کی سمت حتمی طور پر طے ہو چکی ہے تو اخلاقیات کا بحران صحیح معنوں میں شروع ہوگیا۔ اخلاقیات چونکہ تاریخی حوالے سے عبادات سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی' اس لیے عبادات سے بدعنوانیوں کے ارتکاب کے لیے ڈھال کا کام لیا جانے لگا اور نظام عدل عبادات اور اخلاقیات میں تمیز کرنے کا اہل نہ رہا۔ ریاست کے تمام کاموں کی کسوٹی معروضی مشاہدات پر مبنی ہوتی ہے' لیکن عبادات کا غلبہ اس کو مبہم بناتا ہے اور اچھے اور برے کے امتیازات کو مٹا دیتا ہے۔

مجاہد حسین کی کتاب ریاست کو معروضی زاویے سے دیکھنے کی ایک کوشش ہے اور اس کا لب لباب یہ ہے کہ ریاست کی عملداری خاتمے کی طرف رواں دواں ہے۔ یہ اجتماعیت سے انفرادیت کی طرف ایک سفر ہے جس میں مقتدر حلقے ریاستی کاروبار کو اپنے انفرادی مفادات کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ سیاست دان معاشرے میں قائم ہونے والی موضوعاتی قدروں سے ہم آہنگی کو مقدم جانتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو مذہبی حوالے سے مثالی کردار کا حامل ظاہر کرتے ہیں۔ تقریر میں وہ ریاستی آئین میں شامل روحانی معیار کی پاسداری کرتے ہیں' لیکن عمل میں وہ صرف انفرادی مفاد کی کسوٹی کو استعمال کرتے ہیں۔ وہ حج اور عمرہ کرتے ہیں' داتا دربار کو غسل دیتے ہیں لیکن اپنے علاقے میں اپنی مرضی کا تھانیدار اور مجسٹریٹ لگوانا اپنی نظریاتی پارسائی کا حصہ سمجھتے ہیں۔ عوام مجبور ہیں کہ وہ ریاست کے اپنے قائم کردہ پارسائی کے پیمانوں پر توجہ دیں اور اخلاقیات کو غیر ضروری سمجھ کر نظر انداز کریں۔ نظریاتی ریاست کی شکست و ریخت کا یہ قرینہ تاریخ میں بارہا دیکھنے

Marfat.com

میں آیا ہے اور اسے عوام اپنی سادگی میں منافقت کہتے ہیں۔ حالانکہ یہ ریاستی عمل کا ایک نہایت ہی اہم حصہ ہوا کرتا ہے۔

پاکستان میں نظریاتی پاکبازی کا مقابلہ کرپشن کا نہایت ہی نمایاں اظہار ہے۔ فرد اپنے اپ کو اردگرد کے ماحول پر اپنی نظریاتی سوچ کی بناء پر فوقیت دیتا ہے۔ ریاستی اداروں میں کام کرنے والے جب اپنی نظریاتی برتری کے بارے میں مکمل یقین کی حد تک پہنچ جاتے ہیں تو ریاستی املاک کو اپنے تصرف میں لانے کا جواز ڈھونڈ لیتے ہیں۔ یعنی اگر مجھ جیسے صحیح سوچ کے مالک کے پاس دولت آجائے تو یہ ریاست کے حق میں بہتر ہوگا' کیونکہ اس دولت کے بل پر میں ریاست کو ان عناصر سے پاک کرنے میں زیادہ موثر ہو سکتا ہوں جو اس کی نظریاتی اساس کو کھوکھلا کر رہے ہیں۔ اخلاقیات کی معروضی کسوٹی چونکہ نظریاتی علم الکلام میں دب جاتی ہے' اس لیے بددیانتی اور کرپشن کو پرکھنے کا معیار مبہم ہو جاتا ہے۔

جب سیاست دان یہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ اس کا اقتدار ریاست کی بقاء کے لیے ضروری ہے تو مخالفین پر فتح پانے کے لیے ہر قسم کے حربے استعمال کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ اس سوچ سے جرائم کی دنیا سے الحاق کا راستہ کھل جاتا ہے۔ ہمسایہ ممالک میں دو داخلی بحرانوں نے پاکستان میں جرائم پیشہ آبادیوں کے پیدا ہونے میں مدد دی ہے۔ مشرقی پنجاب میں خالصتان کی تحریک کے دوران ریاستی اداروں نے شمالی پنجاب کی بعض برادریوں سے ترسیل اسلحہ کا کام لیا' جس سے ماضی میں سمگلر کہلانے والے خاندانوں کو عزت کا مقام ملا۔ جرائم پیشہ عناصر جو منڈیوں پر قابض ہو کر بھتہ لیتے تھے اور مقامی اداروں کے انتخابات کے دوران ایک دوسرے سے برسرپیکار رہتے تھے' اب صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں کے امیدوار سیاست دانوں کے حواری بن گئے۔ اس رجحان نے دو تبدیلیوں کو جنم دیا' مقامی سطح پر سیاست دانوں نے انتخابی سرگرمیوں میں غنڈہ عناصر پر انحصار کرنا شروع کر دیا' وہ کئی لحاظ سے غنڈوں کی متحارب جتھے بندیوں کی سیاست کے اسیر ہوگئے۔ دوسری تبدیلی یہ آئی کہ جو جرائم پیشہ افراد مقامی اداروں میں منتخب ہوتے آئے تھے' وہ صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں کے انتخابات میں دلچسپی لینے لگے اور منتخب ہو کر صوبائی اور مرکزی سیاست میں داخل ہوگئے۔

قومی سیاست میں جو حریف قطبین قائم ہوئے' ان سے اخلاقیات پر مزید منفی اثر پڑا۔ ۱۹۸۸ء کے بعد مرکز اور پنجاب کے درمیان لڑائی کے دوران ہمہ گیر کرپشن کا انعقاد ہوا جس کے دوران پنجاب اسمبلی نے انتظامیہ کے بارے میں ضوابط میں ترمیم کر کے ریاست

Marfat.com

کو سیاسی مفادات کے مکمل طور پر تابع کر لیا۔ کرپشن کا دوسرا دور ۱۹۹۳ء کے بعد شروع ہوا۔ پنجاب کی مخلوط حکومت شہروں میں کمزور تھی اور ۱۹۸۸ء کے قائم کردہ پیمانوں کے مطابق اسی کمزوری کا ازالہ املاک کے حصول سے کیا گیا۔ یعنی برسراقتدار سیاست دان اپنے اور اپنے وفاداروں کے لیے اس قدر دولت جمع کر لیں کہ متوقع سقوط اقتدار کے بعد مخالفین کے غلبے کے دوران اپنا تحفظ ہو سکے۔ اس دوران علم الکلام کی سطح پر سیاست دانوں نے دینی اقدار کو استعمال کیا جو طرز عمل ریاست کے مثالی آئین کے مطابق تھا۔ سیاست دانوں نے بار بار عمرے کیے' دینی اجتماعوں میں شرکت کی' نظریہ پاکستان پر پرزور تقریریں کی' داتا دربار پر چادریں چڑھائی' تنازعہ کشمیر پر دھواں دھار جارحانہ تقاریر کیں' پاکپتن میں بہشتی دروازے میں سے بار بار گزرے' تاکہ اپنی شخصیت میں توازن پیدا کیا جا سکے۔ کیونکہ عدلیہ میں جج صاحبان بھی داڑھیاں بڑھا کر نعتوں کے مجموعے چھاپ رہے تھے اور تقاریر میں ریاست کے عباداتی پہلوؤں کو اجاگر کر رہے تھے۔ اس لیے سیاست دانوں کا طرز عمل کسی حد تک عوامی مقبولیت حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عوامی ذہن نے معروضی فعل کو نظرانداز کر کے سیاست دانوں کے علامتی کردار کو ترجیح دی۔ جب بھی پاکستان میں معروضی خطوط پر احتساب ہوا تو غیر مقبول ہو گا۔

ریاست کی عملداری کا بحران مذہبی سیاست میں سب سے زیادہ نمایاں رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دینی حلقوں کو یہ قدرت حاصل ہے کہ آئین میں مضمر دینی نظریے کی دینی زاویے سے ہی مخالفت کریں۔ دینی جماعتوں کی طرف سے تاثر دیا جاتا ہے کہ دینی ریاست ہنوز نامکمل ہے اور جب یہ تنقید احتجاج کی شکل اختیار کر لیتی ہے تو ریاست مجبور ہے کہ وہ اسے جائز قرار دے۔ آخر ریاست کی منزل بھی تو ویسی ہی تکمیل ہے جس کا عندیہ دینی حلقے دے رہے ہیں۔ چنانچہ نظریئے کی بنیاد پر ریاست کے خلاف احتجاج اور ریاست کی طرف سے اس کی بین السطور حمایت عوامی ذہن پر قابض ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عوامی سطح پر سیاست "کلیتا" مذہبی ہے۔ عوام عطیات اور چندے اپنے اپنے مذاہب کی جماعتوں کو دیتے ہیں اور جذباتی طور پر ان جماعتوں کی طرف سے پھیلائی گئی فرقہ واریت میں الجھ جاتے ہیں۔ جب ریاستی ادارے ان جذبات کی زد میں آتے ہیں تو ریاست کی عملداری ختم ہو جاتی ہے اور یہ عمل نظریاتی ریاست کے تمام عناصر کے اشتراک سے مکمل ہوتا ہے۔

اس وقت پاکستانی شہری ایک مخصوص ذہنیت کی گرفت میں ہے۔ نظریئے کی بنیاد پر

Marfat.com

وہ پاکبازی کے معیار قائم کرتا ہے جس کی بنیاد پر وہ اپنے آپ کو مستثنیٰ کر کے دوسرے شہریوں کے کردار کی خرابی پر نظر رکھتا ہے۔ دوسری طرف ریاست کا وجود کلیتاً" معروضی ہے' وہ ضوابط کی محتاج ہے اور روحانی پاکبازی کا ادراک کرنے سے معذور ہے۔ روحانی کسوٹی پر پورا اترنے والے سیاست دان ضوابط یا تو بدل دیتے ہیں یا انہیں نظرانداز کر دیتے ہیں۔ سرکاری افسران سیاست دانوں میں مقبولیت حاصل کرنے کے لیے ریاستی اداروں میں پارسائی کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ ضوابط سے پہلو تہی کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ریاست اپنے بنیادی معروضی معیار سے عاری ہو جاتی ہے۔ اس کی عملداری اس کے اپنے اداروں سے نکل کر ان حلقوں میں منتقل ہو جاتی ہے جو اس کے خلاف مصروف احتجاج ہوتے ہیں۔ یہی ریاست کی تدریجی مدت ہے۔

آج پاکستان میں عبادات کی سطح بلند ہے' لیکن اخلاقیات کا زوال عیاں ہے۔ مساجد میں نمازیوں کی تعداد ماضی کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ اس رجحان کی تسکین کے لیے نئی نئی مذہبی تنظیمیں وجود میں آ چکی ہیں جن کی اقتصادی قوت عبادات کے عروج کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ لیکن نمازیوں میں ان حضرات کی اکثریت ہے جو معاشرے میں جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں' کاروباری حضرات ٹیکس نہیں دیتے' سرکاری افسر رشوت لیتے ہیں اور مقامی اور قومی سطح کے نمائندے سرکاری املاک پر قبضہ کرتے ہیں۔ اسی طرح جیسے عوامی سطح پر نیکی اور بدی میں امتیاز ختم ہو گیا ہے' اسی طرح ریاستی کاروبار میں قانونی اور غیرقانونی افعال میں تمیز غائب ہو چکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج احتساب کا عمل مشکل بن گیا ہے۔ کیا عوام اب ایک ایسے معروضی معیار کو قبول کریں گے جو پاکبازی کو نظرانداز کر کے بدعنوانی کی گرفت کرے گا۔ عبادات پر پورا اترنے والا فرد تو ریاست سے بالاتر حیثیت کا حامل ہے' ریاست اس کا مواخذہ کس روحانی معیار کے مطابق کر سکتی ہے۔ ریاست دراصل معدوم ہو چکی ہے اور افراد نظریاتی خالصیت کا سہارا لے کر اس کی دولت پر اپنا تصرف جائز قرار دیتے ہیں۔

خالد احمد

Marfat.com

لیاقت علی خان سے کھر تک
نارنگ میں جاگیریں، سیاست اور جرم

لاہور کی نواحی آبادی شاہدرہ کے قریب جی ٹی روڈ پر واقع سابق وزیر اعظم میاں نواز شریف کے کارخانے اتفاق فاؤنڈریز کی بغل میں سے کالا خطائی روڈ نام کی ایک خستہ حال سڑک نکلتی ہے۔ چالیس کلومیٹر طویل یہ سڑک جی ٹی روڈ کو ضلع شیخوپورہ کی سب تحصیل "نارنگ منڈی" سے جوڑتی ہے۔ اگرچہ ایک اور سڑک نارووال مریدکے روڈ بھی نارنگ منڈی کو چھو کر گزرتی ہے اور مریدکے، کے قریب نارنگ منڈی کو جی ٹی روڈ سے ملاتی ہے لیکن نارنگ منڈی کی اصل پہچان اور مزاج کالا خطائی روڈ سے وابستہ ہے۔

اس خستہ حال روڈ کی وجہ شہرت اردگرد پھیلے درجنوں دیہات میں پناہ گزین پیشہ ور قاتلوں کے گروپ، نصف صدی پر محیط خونی دشمنیاں اور ان دشمنیوں کی وجہ سے اجڑے ہوئے دیہات، اشتہاری مجرموں کے غول، خطرناک اور امیر ترین سمگلر، ساتھ ساتھ چلتی بی۔ آر۔ بی نہر، جنرل محمد یحییٰ خان، جنرل ضیاء الحق، جنرل ٹکا خان اور جنرل غلام جیلانی سمیت درجنوں ریٹائرڈ جرنیلوں کو حکومت کی طرف سے الاٹ ہوئی زمینیں، پہلے وزیراعظم نواب زادہ لیاقت علی خاں کی متنازعہ اور خونیں اراضی، سابقہ وفاقی وزیر غلام مصطفیٰ کھر کی سو مربع اراضی پر پھیلی "سلطنت"، سابقہ گورنر پنجاب میاں محمد اظہر کا وسیع و عریض بابکوال زرعی فارم، دنیا بھر میں مشہور خوشبودار باسمتی چاول اور ریڈیوں کے عوامی فنکار نظام دین (مرحوم) کا آبائی گاؤں غوریاں مغلاں ہے۔

ضلع شیخوپورہ کا جی ٹی روڈ سے مشرق کی طرف کا یہ علاقہ اگرچہ تحصیل فیروزوالہ کا حصہ ہے لیکن عرف عام میں "نارنگ کا علاقہ" کہلاتا ہے۔ نارنگ کے علاقے کی مشرقی سرحد

Marfat.com

تقریباً ۳۷ کلومیٹر تک ہندوستان سے ملتی ہے۔ شاہدرہ کے قریب واقع "مسلم لیگ" نامی گاؤں سے موضع باٹھاں والا تک تقریباً ۲۵ دیہات ہندوستانی اضلاع امرتسر گورداسپور کی تحصیلوں اجنالہ اور لوکوکے کے دیہات کے آمنے سامنے واقع ہیں۔ ساتھ ساتھ دریائے راوی بہتا ہے جس کا کوئی مستقل بہاؤ نہیں کبھی رخ بدل کر ہندوستان میں جا گھستا ہے تو کبھی نارنگ منڈی کے دیہات کو تہہ و بالا کرتا ہوا پاکستان کے اندر آجاتا ہے۔ لیکن دریا کا زیادہ بہاؤ پاکستان کے اندر ہی رہتا ہے۔

یہی سرحدی علاقہ اور دریا کا وسیع و عریض بیلہ "نارنگ منڈی" کے علاقہ کو ایک مجرمانہ مزاج عطا کرتا ہے۔ علاقے میں روایت مشہور ہے کہ یا تو ہنستے بستے دیہات کو دریا برباد کرتا ہے یا پھر دشمنیاں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اس وقت نارنگ منڈی کے ۲۳ دیہات دریا کی وجہ سے مکمل طور پر برباد ہوئے ہیں تو تقریباً ایک درجن دیہات باہمی دشمنیوں کی وجہ سے اجڑے ہیں۔ نارنگ کے علاقہ میں یہ رواج عام ہے کہ جونہی کوئی گروپ مخالف گروپ کو قتل کرتا ہے تو اس وقت تک اپنی واردات کو ادھورا تصور کرتا ہے جب تک کہ مقتولین کے گھروں کو آگ نہیں لگا دیتا۔

پولیس کے اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ ہر سال سو سے زائد افراد قتل ہوتے ہیں۔ جبکہ مقامی ذرائع اس چھوٹے سے علاقہ میں ہر سال قتل ہونے والوں کی تعداد ۲ سو سے زائد بتاتے ہیں کیونکہ علاقہ میں یہ بھی رواج ہے کہ اکا دکا قتل کے واقعات کو پولیس تک نہیں لے جایا جاتا۔ ضلع گجرات میں قتل و غارت کی بنیادی وجہ "چودھراہٹ" کا حصول ہے۔ جب کہ نارنگ کے اس علاقے میں قتل و غارت کی تین بڑی وجوہات ہیں (i) زمین پر قبضہ کے لیے قتل (i) جنسی زیادتی اور اغوا کے بعد قتل (iii) سمگلنگ کے دوران ہونے والے جھگڑوں میں قتل وغیرہ۔

جنسی زیادتی کے رجحان کے اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ دو سال پہلے علاقہ کے ایک رکن قومی اسمبلی کے پاس نارنگ منڈی شہر کا رہائشی ایک غریب شخص اپنی انٹرمیڈیٹ پاس بیٹی کو ان ٹرینڈ ٹیچر لگوانے کے لیے لے کر پہنچا۔ مذکورہ رکن اسمبلی نے لڑکی کے باپ کو کہا کہ وہ ضلع شیخوپورہ میں واقع ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر کے دفتر میں میرا پیغام لے کر جائے، بچی کو میرے پاس چھوڑ جائے کیونکہ وہ کچھ دیر میں خود شیخوپورہ پہنچ رہا ہے۔ وہ شخص بے چارہ شیخوپورہ چلا گیا تو رکن اسمبلی نے اس کی جواں سال بیٹی کے ساتھ زبردستی زیادتی کی۔ مظلوم لڑکی شام کو اپنے باپ کے ساتھ واپس نارنگ منڈی چلی گئی لیکن

Marfat.com

اس نے باپ کو اس واقعہ کے بارے میں کچھ نہ بتایا۔ رات کو اس لڑکی نے رکن اسمبلی کے ڈیرے پر گزرے تمام حالات ایک کاغذ پر لکھے اور گلے میں پھندہ ڈال کر خودکشی کر لی۔

علاقہ میں سب سے زیادہ جرائم زنا اور اغواء کے ہوتے ہیں بلکہ تقریباً پندرہ دیہات میں خونی دشمنیوں کا آغاز کسی ایک گروپ کی لڑکی کے ساتھ دوسرے گروپ کے افراد کی زیادتی سے ہوا جن میں سینکڑوں افراد قتل ہو چکے ہیں۔

نارنگ منڈی شہر کی آبادی ۶ مارچ ۱۹۸۱ء میں نارنگ شہر کے ایک حصہ میں آنے والے خطرناک طوفان کو ایک بڑے دشمن دار گروپ کی طرف سے مقامی مسجد کے خطیب کی جواں سال بیٹی سے زیادتی اور بعد میں قتل کا نتیجہ قرار دیتی ہے۔ ۱۹۸۱ء میں آنے والے اس طوفان میں ۶۵ افراد ہلاک اور سینکڑوں زخمی ہوئے۔ جب کہ کروڑوں روپے مالیت کی عمارتیں اور سامان تباہ ہوگیا۔

ایک مقامی شخص نے بتایا کہ نارنگ منڈی شہر کے سب سے بڑے قبضہ گروپ کے سربراہ کے بیٹے نے مقامی خطیب کی بیٹی سے اپنے دو ساتھیوں سمیت زیادتی کی اور بعد میں اس لڑکی کا سر تن سے جدا کر دیا۔ لڑکی کے دھڑ کو اپنی زمینوں میں دفن کیا اور سر کو دریائے راوی میں پھینک دیا۔

نارنگ منڈی کے اخباری نمائندوں نے اس سانحہ پر طویل رپورٹیں شائع کرائیں تو آئی جی نے نارنگ منڈی کے ایس ایچ او عباس خان کو رپورٹ تیار کرنے کا حکم دیا۔ عباس خان نے تفتیش کی اور ملزمان کو گرفتار کر لیا گیا۔ ملزمان نے اقبال جرم کر لیا' لڑکی کا دھڑ بھی برآمد کر لیا گیا لیکن بعد میں ناکافی شہادتوں کی وجہ سے ملزمان رہا ہوگئے۔ ملزم نے رہا ہونے کے دو ماہ بعد نواحی گاؤں موضع بورے اوٹھ کے ایک لڑکے کو اغوا کر لیا اور بدفعلی کے بعد قتل کر دیا۔ یہاں بھی عدالتیں ملزم کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں اور ملزم ۸۶ء میں رہا ہو کر واپس نارنگ منڈی آگیا اور اس وقت اپنے باپ کے ساتھ "سرگرم" ہے۔

نارنگ منڈی کے علاقہ میں قتل و غارت گری اور دیگر جرائم میں اضافہ کی وجہ علاقہ کے غیر متوازن معاشی حالات ہیں۔ اگرچہ بظاہر نظر آنے والا بڑا ذریعہ معاش زراعت ہے کیونکہ زرخیز زمینیں دنیا کا اعلیٰ ترین چاول پیدا کرتی ہیں۔ لیکن سب سے بڑا ذریعہ معاش اور کاروبار ۳۷ کلومیٹر طویل سرحد کے ذریعے ہونے والی سمگلنگ ہے۔ نارنگ منڈی میں گزشتہ بیس برسوں کے دوران جتنے قتل ہو چکے ہیں ان میں ۶۰ فیصد لوگ بلاواسطہ اور

Marfat.com

بلواسطہ طور پر سمگلنگ کے دھندے کی وجہ سے قتل ہوئے۔ جن دیہات میں سمگلنگ کی وجہ سے بے تحاشہ دولت آئی اور جدید ترین اسلحہ خریدا گیا اور پھر "کاروباری مخالفین" کو قتل کیا گیا ان میں بابکوال' جنڈیالہ کلساں' رام پورہ' فتح پور' نہال پور' آلول پور' پسیان والا' شتاب گڑھ' لونگ والا' بے دین پور' علی وال' منڈیالی اور برج نام کے دیہات مشہور ہیں۔ حیران کن بات یہ ہے کہ ان میں سے ۸۰ فیصد دیہات اب دریا برد ہو چکے ہیں اور تقریباً ۱۰ فیصد دوبارہ نئی جگہوں پر آباد ہوئے ہیں۔

جن دیہات کے سمگلر بہت زیادہ مشہور ہوئے ان میں میرووال' مسلم لیگ' شریف پور میانہ' مقبول پور میانی اور جیو پور وغیرہ شامل ہیں۔ یہ وہ دیہات ہیں جن کے رہاشیوں نے صدر ضیاء الحق (مرحوم) کے دور میں ہندوستانی پنجاب میں جاری "تحریک خالصتان" میں سرگرم سکھوں کو اسلحہ سمگل کیا۔ ان سمگلر خاندانوں کے پاس دولت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی تمام دولت غیر ملکی بینکوں میں پڑی ہے' اسلام آباد اور لاہور میں بڑی بڑی جائیدادیں خریدی گئی ہیں اور اس وقت یہ خاندان اسلحہ کی سمگلنگ کو ترک کر کے سونا اور ہیروئن کی اسمگل کر رہے ہیں۔

نارنگ منڈی میں قتل و غارت گری کی وارداتوں کی دوسری بڑی وجہ زرعی زمینوں پر قبضے کرنے کا رجحان ہے۔ اس مقصد کے لیے سیاست دان قبضہ گروپ بنا کر صوبہ بھر کے اشتہاری ملزمان کو پناہ دیتے ہیں اور جدید ترین اسلحہ سے لیس کر کے مخالفین پر چڑھا دیتے ہیں۔ مخالفین قتل ہو جائیں تو ان کی زمینوں پر قبضہ کر لیا جاتا ہے۔ ایک گاؤں شریف پور خورد میں دو گروپوں انور توتی والا اور شناور گروپ کے درمیان زرعی زمین کے تنازعہ پر دشمنی چل نکلی۔ شناور گروپ نے انور توتی کو قتل کر دیا۔ جواب میں انور توتی والا کے لواحقین نے گوجرانوالہ کے تھانہ واہنڈو اور گجرات سے کرایہ کے قاتلوں کی ایک بڑی کھیپ منگوائی اور ایک دن شناور گروپ پر حملہ کر دیا اس حملے میں شناور گروپ کے پانچ افراد قتل ہوئے اور باقی لوگ عورتوں اور بچوں کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔ انور توتی والا گروپ کے لوگوں نے شناور کا پورا گاؤں جلا دیا اور شناور گروپ کی عورتوں سے شادیاں کر لیں۔

اسی طرح کی ایک اور جنگ دریا کنارے واقع ایک گاؤں جنڈیالہ کلساں میں ہوئی۔ جنڈیالہ کلساں کے شریف خان گروپ اور برکت گوندی گروپ کے درمیان سمگلنگ کے مال اور پانچ ایکڑ زرعی اراضی پر قبضہ کے تنازعہ پر دشمنی کا آغاز ہوا۔ شریف خان نے میانوالی اور شیخوپورہ کے علاقہ خانقاہ ڈوگراں سے اشتہاری ملزموں کو اکٹھا کیا اور برکت گوندی

Marfat.com

گروپ کے ۶ افراد کو ہلاک کر دیا۔ اس واقعہ کے بعد دونوں گروپوں نے ایک دوسرے کے گھر جلا دیے اور دونوں گاؤں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ یہ گاؤں اب ویران پڑا ہے۔

اس وقت نارنگ منڈی کے علاقہ میں سب سے بڑا زرعی فارم سابقہ وفاقی وزیر بجلی و پانی غلام مصطفے کھر کا ہے۔ غلام مصطفیٰ کھر نے غلام مصطفیٰ جتوئی کی نگران وزارت عظمیٰ کے دوران اولیا پور' دھیدو چک نام کے دریا برد دیہات کی دریا برد اور ناقابل کاشت اراضی خریدی۔ محکمہ مال کے اعداد و شمار کے مطابق اس وقت غلام مصطفیٰ کھر کے پاس سو مربع سے زائد قابل کاشت اراضی ہے۔ کھر زرعی فارم کو مکمل طور پر خاردار تاروں کی مدد سے باقی اراضی سے علیحدہ کر دیا گیا ہے اور رینجرز سمیت کسی بھی شخص کو اجازت نہیں کہ وہ فارم کی حدود میں داخل ہو سکے۔

غلام مصطفیٰ کھر نے اپنے زرعی فارم پر دھیدو چک کے مشہور سمگلر اور پیشہ ور اجرتی قاتل گجر گروپ کو پناہ دے رکھی ہے۔ دھیدو چک کے ارشد' ذوالفقار اور صفدر گجر وغیرہ کی دیرینہ دشمنی قریبی دریا برد گاؤں اولیا پور کے رہائشی رحمٰن عرف مناں جیڈو (نارنگ منڈی کا سب سے مشہور اور خطرناک سمگلر) کے بیٹے اصغر عرف بوگی کے ساتھ چلی آ رہی ہے۔ دونوں گروپوں میں جاری اس بیس سالہ قدیم جنگ میں پندرہ افراد قتل ہو چکے ہیں۔ ارشد گجر دو مقدمات میں سزائے موت پانے کے بعد جیل سے فرار ہو چکا ہے۔

ارشد گجر کا مخالف اصغر بوگی نارنگ منڈی کے ڈگرا گروپ میں شامل ہے اور ان دنوں دونوں گروپ لاہور کے میاں اسلم کی ۲۰۰ ایکڑ اراضی پر قبضہ کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ مصطفیٰ کھر یہ اراضی ارشد گجر کے ذریعے اپنے فارم میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔ جب کہ میاں اسلم نے ڈگرا گروپ اور اصغر بوگی کی خدمات حاصل کر رکھی ہیں۔

دھیدو چک اس وقت سمگلنگ کا سب سے بڑا مقام سمجھا جاتا ہے۔ دھیدو چک سے ہندوستان میں ہیروئن اور چرس کی سمگلنگ کی جاتی ہے جب کہ ہندوستان سے شراب' سونا' چھوٹی الائچی' چاندی' ۳۸۶ کی پگ اور لونگ وغیرہ سمگل کیے جا رہے ہیں۔

نارنگ منڈی ——— مختصر تاریخ

نارنگ منڈی کا قصبہ ۱۹۲۰ء میں آباد ہونا شروع ہوا۔ ۱۹۲۷ء میں اس قصبہ میں سے ریلوے لائن گزری اور چھوٹا سا ریلوے اسٹیشن قائم ہوا۔ بنیادی طور پر نارنگ منڈی پر سکھوں کا قبضہ تھا' جہاں دریا کنارے کے زمیندار سکھ دریا کی تباہی سے خوفزدہ ہو کر آباد

Marfat.com

ہوئے۔ شروع میں یہ علاقہ ضلع سیالکوٹ میں شامل تھا' بعد میں جب شیخوپورہ ضلع بنا تو نارنگ منڈی اور اردگرد کے دیہات کو بھی اس ضلع میں شامل کر دیا گیا۔

۱۹۳۰ء میں پہلی بار نارنگ منڈی میں مسلمان آباد ہونا شروع ہوئے۔ سب سے پہلے شیخ برادری کے دو چمڑے کے تاجروں حاجی خیر دین اور حاجی چراغ دین نے بھرو کے ضلع گوجرانوالہ سے نقل مکانی کر کے یہاں گھر بنائے اور چمڑے کا کاروبار شروع کیا۔

ریلوے لائین کی مغربی جانب ۵۰ مربع زمین صوبائی حکومت کی ملکیت تھی۔ جب نارنگ منڈی میں سکھوں' ہندوؤں اور مسلمانوں نے کاروبار شروع کیا تو حکومت نے اس جگہ پر غلہ منڈی اور سبزی منڈی بنا دی۔ آہستہ آہستہ آبادی بڑھنا شروع ہوئی اور قریبی دیہات کے لوگوں نے شہر میں اپنے گھر بنانا شروع کیے۔

اس وقت نارنگ منڈی ۱۳۲ دیہات پر مشتمل سب تحصیل ہے اور اس کی آبادی ایک اندازے کے مطابق ۵۰ ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔ شہر میں لڑکوں اور لڑکیوں کے انٹرمیڈیٹ کالج ہیں۔ ٹیلی فون کے دو ایکسچینج ہیں۔ شہر کے درمیان میں تھانہ کی عمارت ہے لیکن مقامی پولیس کے پاس گاڑی تک نہیں۔ جرائم کی وجہ سے اسے "پنجاب کا قبائلی علاقہ" کہا جاتا ہے۔

نوابزادہ لیاقت علی خان کی زمین اور قتل و غارت

نارنگ منڈی مرید کے روڈ سے ایک کلومیٹر شمال کی طرف واقع کرتو اور پنڈوریاں نامی دو دیہات کو پاکستان کے خوفناک ترین دیہات قرار دیا جاتا ہے۔ گزشتہ نصف صدی سے ان دیہات میں "دشمنی" کے نام پر قتل و غارت کا خوفناک سلسلہ جاری ہے۔ ایک مقامی پولیس آفیسر کے بقول "کرتو پنڈوریاں میں جس طرح مخالفین کو قتل کیا جاتا ہے۔ اس کی مثال پورے پنجاب میں نہیں ملتی۔ یہاں مخالف کو قتل کر کے اس کی لاش سمیت اس کا گھر جلا دینا ایک نہایت معمولی بات ہے اور قاتل کو اس عمل میں ایک طرح سے مجبور ثابت کرتی ہے کیونکہ اگر قاتل مقتول کے جسم کے ٹکڑے نہیں کر سکا اور اس موقع پر جشن نہیں منا سکا تو مقامی رواج کے مطابق اس کا یہ عمل ادھورا ہے"۔

کرتو اور پنڈوریاں میں جاٹ قوم کی گوت "ٹیڑ" آباد ہے۔ سبھی مقامی لوگ زراعت پیشہ ہیں اور علاقہ کی زرخیز ترین زمین کے مالک ہیں۔ پچاس سالہ پرانی زرعی چک بندی کے مطابق ان دیہات کا کل ملکیتی رقبہ ۲۰۰ مربع زرعی اراضی پر مشتمل ہے۔ جب کہ بعد

میں آبادی کے پھیلاؤ کے باعث اس میں کمی واقع ہو چکی ہے۔ دونوں دیہات میں تقسیم سے پہلے بھی "دشمنی" کا خونی عمل موجود تھا اور ایک اندازے کے مطابق ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۷ء تک سترہ برسوں میں درجن بھر افراد زمین اور دیرینہ دشمنی کی وجہ سے قتل کیے جا چکے تھے۔

کرتو اور پنڈوریاں میں قتل و غارت کا مستقل سلسلہ ۵۸ء سے شروع ہوتا ہے جس کی وجہ زرعی زمین تھی۔ پاکستان کے پہلے وزیراعظم خان لیاقت علی کو ہندوستان میں رہ جانے والی زرعی اراضی کے عوض یونٹوں کی صورت میں نارنگ منڈی کے دیہات کچلی، فرخندہ آباد، ننگل، بچھر، نواں پنڈ اور مانگٹ نام کے دیہات میں ۱۰۰ مربع زمین الاٹ ہوئی۔ لیاقت علی خان (مرحوم) کی ان زمینوں کی دیکھ بھال ان کی صاحبزادی ساجدہ لیاقت علی نے سنبھالی اور مقامی زمینداروں کو ٹھیکہ پر زمین دے کر کاشت کاری شروع کرادی۔ جب ساجدہ لیاقت علی اپنی زمینوں پر کاشت کاری کے لیے مزارعے تلاش کر رہی تھیں تو انہیں کرتو پنڈوریاں کے رہائشی چوہدری رحمت علی اور چوہدری فتح محمد بٹر کی طرف سے پیش کش ہوئی کہ وہ انہیں بہتر پیداوار دیں گے، لہٰذا انہیں بھی قریبی دیہات میں زمین ٹھیکہ پر دی جائے۔ چوہدری رحمت علی ان دنوں گورنمنٹ کالج لاہور میں زیر تعلیم تھا جب کہ چوہدری فتح محمد بٹر ایک بااثر زمیندار کی حیثیت سے علاقہ میں مشہور تھا۔

مقامی لوگ بتاتے ہیں کہ ساجدہ لیاقت علی نے چوہدری فتح محمد بٹر کو نظر انداز کرتے ہوئے موضع کچلی میں واقع آٹھ مربع زرعی اراضی نوجوان رحمت علی کو ٹھیکہ پر دے دی۔ مقامی لوگ یہ بھی انکشاف کرتے ہیں کہ چوہدری رحمت علی اور ساجدہ لیاقت علی ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے اور چوہدری رحمت علی کو ساجدہ لیاقت علی نے یہ پیش کش بھی کی تھی کہ اگر وہ اس کے ساتھ شادی کر لے تو اسے آدھی جائیداد دے دی جائے گی۔ ساجدہ لیاقت علی لاہور میں رہائش پذیر تھیں اور چوہدری رحمت علی بھی گورنمنٹ کالج لاہور میں زیر تعلیم تھا اس لیے رحمت علی اکثر اوقات ساجدہ لیاقت علی کی گاڑی میں لاہور جاتا اور واپس زمینوں پر بھی ساجدہ ہی کے ساتھ آتا۔

دوسری طرف چوہدری فتح محمد بٹر (پیپلز پارٹی کے سابقہ ایم۔ این۔ اے چوہدری نثار احمد پنوں کے ماموں) ساجدہ لیاقت علی اور چوہدری رحمت علی سے کچلی ورک کی زمین حاصل کرنے کی کوششوں میں تھا۔ ایک بار چوہدری فتح محمد بٹر کے مسلح آدمیوں نے ساجدہ لیاقت علی اور چوہدری رحمت علی کو اکٹھے قتل کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔

Marfat.com

چوہدری رحمت علی کا والد کرتو سے ملحقہ گاؤں موضع بھونڈری کا نمبردار تھا' اس نے بھی اپنے بیٹے کی حفاظت اور فتح محمد بٹر کے مقابلہ کے لیے علاقے کے جرائم پیشہ لوگوں کو بھرتی کرنا شروع کیا۔ دوسری طرف چوہدری فتح محمد بٹر کو ایک ایسا سخت گیر شخص میسر آگیا جو آسانی کے ساتھ رحمت علی وغیرہ کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ یہ شخص چوہدری اسلم بٹر تھا جو ان دنوں فتح محمد بٹر کے ساتھ مل کر چاول دوسرے اضلاع کو سمگل کرتا تھا کیونکہ وفاقی حکومت کی طرف سے ان دنوں ایک ضلع سے دوسرے ضلع میں چاول وغیرہ لے جانے پر پابندی تھی لیکن یہ دونوں افراد نارنگ منڈی میں تیار ہونے والی مٹی کی ہانڈیوں میں چاول وغیرہ بھر کر انہیں ضلع شیخوپورہ سے باہر لے جا کر مہنگے داموں فروخت کرتے تھے۔ لیکن کچھ عرصہ بعد چوہدری اسلم بٹر چوہدری فتح محمد بٹر کو چھوڑ کر چوہدری رحمت علی کے گروپ میں چلا گیا۔

۶۲ء میں ایک دن چوہدری اسلم بٹر کسی مقدمہ کی تاریخ کے سلسلہ میں کچہری جا رہا تھا کہ راجباہ کے کنارے فتح محمد بٹر اور اس کے ساتھیوں نے اسے بے دردی سے قتل کر دیا۔ اس قتل کیس میں چوہدری فتح محمد بٹر کو سزائے موت ہوئی جو بعد میں ۸۸ء میں معطل کر دی گئی۔ ساجدہ لیاقت علی کی زمین بدستور چوہدری رحمت علی کے پاس رہی اور مخالف پارٹی جیل میں چلی گئی۔ اس دوران دونوں گروپوں میں قتل و غارت کا سلسلہ جاری رہا اور فریقین کے لوگ قتل ہوتے رہے۔ مقامی پولیس کے مطابق اس جنگ میں زیادہ تر کرائے کے لوگ مارے گئے جن کی تعداد ایک درجن سے زائد تھی۔

اس کے چند سال بعد ساجدہ لیاقت علی خان نے اپنی زمین بیچنا شروع کر دی اور چوہدری رحمت کو بھی پیغام بھیجا کہ وہ زمین یا تو خود خرید لیں یا پھر اسے خالی کر دیں تاکہ کسی شخص کو فروخت کی جا سکے۔ چوہدری رحمت علی نے زمین خالی کرنے اور خود خریدنے سے انکار کر دیا۔ چوہدری رحمت علی کے انکار کے بعد ساجدہ لیاقت علی نے جیل میں چوہدری فتح محمد بٹر وغیرہ سے رابطہ کیا اور ان سے طے کیا کہ اگر وہ رحمت علی سے زمین حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اس صورت میں آدھی زمین اس کو مفت دے دی جائے گی۔

۸۸ء میں جب سزائے موت معطل ہونے کے بعد چوہدری فتح محمد بٹر وغیرہ رہا ہوئے تو انہوں نے آتے ہی پکی ورک کی زمین چوہدری رحمت علی سے حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ۹۲ء میں چوہدری رحمت علی گروپ نے چوہدری فتح محمد گروپ کے تین افراد کو

Marfat.com

قتل کر کے ان کی لاشیں راجباہ میں بہا دیں۔ رحمت علی کو مسلم لیگ کے سابقہ ایم۔ این۔ اے رانا تنویر اور چوہدری فتح محمد بٹر کو اپنے بھانجے چوہدری نثار احمد پنوں سابقہ ایم۔ این۔ اے پیپلز پارٹی کی حمایت حاصل تھی۔ تین افراد کے قتل کے بعد رحمت علی گروپ نے اپنا ایک آدمی خود قتل کر کے "دو طرفہ مقدمہ" کی صورت پیدا کرنا چاہی لیکن پولیس نے چوہدری رحمت علی اور اس کے بیٹے ثناء اللہ کو گرفتار کر لیا۔

رحمت علی گروپ جیل چلا گیا تو چوہدری فتح محمد بٹر نے ساجدہ لیاقت علی خان کی ملکیتی اراضی پر قبضہ کر لیا۔ تقریباً ڈیڑھ سال تک چوہدری فتح محمد بٹر گروپ کا اس زمین پر قبضہ رہا۔ اس کے بعد جب رحمت علی گروپ ضمانت پر رہا ہو کر آیا تو انہوں نے اس زمین کا دوبارہ قبضہ حاصل کر لیا۔ اس وقت زمین چوہدری رحمت علی گروپ کے پاس ہے اور دونوں گروپ جدید ترین اسلحہ سے لیس ہو کر ایک دوسرے کے کھوج میں ہیں۔

فتح محمد بٹر اور چوہدری رحمت علی کے علاوہ بھی کرتو پنڈوریاں میں دشمنیوں کا ایک طویل سلسلہ جاری ہے۔ "رحمت جھل" اور "بشیر نویاں وا" کے درمیان جاری دشمنی میں ۱۰ افراد قتل ہو چکے ہیں۔ ۹۰ء میں بشیر نویاں وا کو قتل کر دیا گیا اور اس کے ساتھیوں نے مخالف گروپ کے پانچ افراد کو قتل کرنے کے بعد ان کی لاشیں "پرالی" میں رکھ کر آگ لگا دی جس سے پانچوں لاشیں جل کر راکھ ہو گئیں۔ اس کے علاوہ ایک مقامی گروپ حاکم علی عرف حاکا اور بشیر نویاں وا کے گروپ میں بھی دشمنی چلی آ رہی تھی۔ اس دشمنی میں حاکم عرف حاکا قتل کر دیا گیا تو اس کے لواحقین علاقہ چھوڑ کر چلے گئے۔

کرتو میں قتل کرنے کے طریقے

دونوں دیہات میں چونکہ تقریباً نصف صدی سے بڑے بڑے گروپوں اور چھوٹے چھوٹے خاندانوں میں دشمنیوں کا سلسلہ چلا آ رہا ہے اس لیے قتل و غارت کی وارداتوں میں بعض اوقات ایسی وارداتیں بھی سامنے آئیں جن میں کسی قتل کا بدلہ لینے کے لیے مقتول کے ساتھ جو سلوک کیا گیا اس کی پہلے کہیں مثال نہیں ملتی۔

قتل کرنے کا سب سے ہولناک طریقہ ۱۹۶۵ء میں ایک مقامی شخص کے قتل کے وقت مقامی لوگوں نے دیکھا۔ کرتو کے ایک رہائشی بشیر احمد نے بتایا کہ قاتل پارٹی نے مقتول کو اس کے گھر سے غسل کرتے ہوئے اس وقت اٹھایا جب وہ اپنے چہرے پر صابن لگا رہا تھا۔ گھات میں بیٹھے ہوئے افراد نے جب یقین کر لیا کہ اس کی آنکھیں صابن کی جھاگ کی

Marfat.com

وجہ سے بند ہیں تو انہوں نے غسل خانے کی دیوار پھلانگ کر اس کو اٹھا لیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں باندھے اور اسے اپنے ڈیرے پر لے آئے۔ اغواء کنندگان کو شک تھا کہ مغوی نے ان کے دو افراد کو رات کے اندھیرے میں کاربین سے فائرنگ کر کے قتل کر دیا تھا۔ جب اغواء کرنے والوں کے تمام مقامی رشتہ دار ڈیرے پر اکٹھے ہوگئے تو اغوا کنندگان نے گاؤں کے ماشکی کو کہا کہ وہ پانی کی مشک بھر کر لائے۔ جب ماشکی پانی کی مشک لے آیا تو اغواء کرنے والوں میں سے ایک نے تیز دھار ٹوکے کے ساتھ مغوی کے جسم کو پاؤں کی انگلیوں سے کترنا شروع کیا۔ بشیر احمد کے بقول تقریباً ایک گھنٹہ میں تین چار افراد نے مغوی کا قیمہ کر دیا۔ اس دوران اغوا کنندگان کے رشتہ دار بڑھکیں مار کر خوشی کا اظہار کرتے رہے۔ جب مقتول کا جسم مکمل طور پر قیمے کی شکل اختیار کر گیا تو اس کے پانچ چھ حصے کیے گئے اور ان حصوں کو مقتول کے ہاتھوں قتل ہونے والے افراد کے لواحقین میں بانٹ دیا گیا۔ ان حصوں کو مذکورہ افراد اپنے ساتھ لے گئے اور یہ معلوم نہ ہوسکا کہ انہوں نے گوشت کے ان ٹکڑوں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ بعد میں مقتول کی لاش برآمد ہوئی اور نہ ملزمان کو سزا ہو سکی۔

بشیر احمد نے مزید بتایا کہ اس کے علاوہ کرتو اور پنڈوریاں میں یہ رواج عام ہے کہ مخالف کو قتل کرنے کے بعد اس کی لاش کو آگ لگا دی جاتی ہے۔ تقریباً چھ سال پہلے ایک گروپ نے اپنے پانچ مخالفین کو قتل کر کے ان کی لاشوں پر بھوسہ اور گھاس پھونس وغیرہ ڈال کر آگ لگا دی۔ پانچوں افراد کی لاشیں جل کر راکھ ہوگئیں اور صرف ان کی موٹی موٹی ہڈیاں باقی رہ گئیں۔

مخالف کو اغواء کر کے لاٹھیوں سے جسم کے تمام جوڑ توڑنے جیسے واقعات بھی ملتے ہیں۔ اس طریقہ قتل میں مغوی کے جسم کو رسی کے ساتھ باندھ دیا جاتا ہے اور اس کی انگلیوں کے جوڑوں سے لے کر ٹانگوں تک کے تمام جوڑ ضربیں لگا کر توڑ دیے جاتے ہیں۔

ڈگرا گروپ بمقابلہ غلام مصطفیٰ کھر

نارنگ منڈی شہر اور اس کے نواحی علاقوں میں سب سے زیادہ با اثر اور مسلح گروپ "ڈگرا گروپ" ہے۔ لاہور کے نواحی گاؤں "موضع ڈگرا" کے رہائشی دو بھائی قربان ڈگرا اور سلطان احمد ڈگرا اس کے سربراہ ہیں۔ ڈگرا برادران کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ لوگ شکرگڑھ کے رہنے والے ہیں اور ان کے آباواجداد انتہائی کسمپرسی کی زندگی

136063

Marfat.com

گزارتے چلے آ رہے تھے۔ شکرگڑھ میں ایک لڑکی سے زیادتی کے واقعہ کے بعد اس خاندان کو گاؤں چھوڑنا پڑا اور یہ لوگ لاہور کے نواحی گاؤں ڈگرا میں چلے آئے۔ ڈگرا میں دشمنی شروع ہونے کے بعد یہ خاندان نارنگ منڈی کے گاؤں " پکھیالہ" میں آ بسا جہاں اس خاندان نے ۱۹۶۶ء میں مقامی زیلدار کی سات مربع اراضی پر قبضہ کر لیا۔ مخالف گروپ کے سید مزمل شاہ عرف جنے شاہ اور قربان ڈگرا خاندان میں قتل و غارت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ صرف پہلے دو برسوں میں دونوں خاندانوں کے آٹھ افراد قتل ہوئے۔ ۸۹ء میں مزمل شاہ اور اس کے چار ساتھیوں کو قربان وغیرہ نے قتل کر دیا۔ ایک سال بعد ڈگرا گروپ نے یونس شاہ نامی مخالف کو سیداں والا کے قریب ٹرین سے اتارا اور اس کو زبردستی ریلوے لائن پر لٹا دیا۔ گاڑی آئی اور یونس شاہ کے ٹکڑے ٹکڑے کرتی ہوئی گزر گئی۔ ۹۲ء میں ڈگرا گروپ نے مخالفین کے ایک اور شخص مزمل شاہ عرف پلے شاہ کو بھی ٹرین کے نیچے دے کر قتل کر دیا۔

مخالفین کے تقریباً ڈیڑھ درجن افراد کے قتل کے باوجود ڈگرا گروپ پوری مسلح نفری کے ساتھ نارنگ منڈی میں موجود رہا اور مقامی پولیس اسے گرفتار نہ کر سکی۔ ڈگرا گروپ نے نارنگ منڈی شہر میں اپنی دھاک بٹھانے کے لیے شہر کے ایک نواحی علاقے میں ڈیرے ڈال دیے اور شاندار حویلی تعمیر کر لی۔ اس دوران ڈگرا گروپ نے ایک اور نواحی گاؤں **بسیاں** والا میں بھی وسیع و عریض اراضی پر قبضہ کر لیا۔ لیکن کچھ ہی عرصہ بعد **بسیاں** والا کی یہ اراضی دریا کے کٹاؤ کی نذر ہوگئی۔ اس کے علاوہ بی بی کوٹ نامی گاؤں میں بھی ڈگرا گروپ نے زرعی اراضی پر قبضہ کر رکھا ہے۔

ڈگرا گروپ نے اپنے مخالفین کے پانچ گریجویٹ لڑکوں کو محض اس لیے قتل کر دیا کہ یہ لڑکے زیادہ پڑھ لکھ کر ملازم ہو جائیں گے اور بعد میں ڈگرا گروپ کو تنگ کریں گے۔ قتل ہونے والے ان لڑکوں میں چار لڑکے سید خاندان اور ایک لڑکا موچی خاندان کا تھا۔ ڈگرا گروپ کا دوسرا کاروبار دریا کے کناروں پر اگے سرکنڈوں کا ہے۔ یہ خاندان لاہور کی کاغذ ساز فیکٹریوں کو بھاری مقدار میں سرکنڈے فروخت کرتا ہے۔ نارنگ منڈی میں تعینات حساس ادارے کے ایک آفیسر نے بتایا کہ ڈگرا گروپ سمگلروں کا مال تک اٹھا لے جاتا ہے۔ چونکہ اس گروپ کو سمگلروں کے ٹھکانوں کا علم ہے اس لیے یہ ہندوستانی اور پاکستانی سمگلروں کا "تبادلے" کی غرض سے چھپایا گیا مال اٹھا لیتا ہے۔

ڈگرا گروپ کا تعلق پیپلز پارٹی سے ہے اور اس وقت چوہدری قربان ڈگرا کا بڑا بیٹا

چوہدری سخاوت علی ڈگرا پیپلز پارٹی نارنگ منڈی سٹی کا صدر ہے۔ نارنگ منڈی کی تمام چونگیاں اور بس اور ویگن اڈوں کا ٹھیکہ بھی ڈگرا خاندان کے پاس ہے۔ مقامی پولیس پر ڈگرا خاندان کی دہشت کا یہ عالم ہے کہ کئی بار ڈگرا گروپ کے لوگ مقامی پولیس اسٹیشن جا کر پولیس ملازمین کو زدوکوب کر چکے ہیں۔ اس طرح کا آخری واقعہ گزشتہ سال ہوا جب ڈگرا گروپ نے ایس ایچ او نارنگ منڈی چوہدری لیاقت کو تھانہ کے اندر جا کر تھپڑ مارے۔

ڈگرا گروپ کے سربراہ چوہدری قربان ڈگرا کا چھوٹا بھائی چوہدری سلطان ڈگرا ان دنوں وفاقی وزیر غلام مصطفیٰ کھر سے مقابلہ کر رہا ہے۔ چوہدری سلطان ڈگرا نے ایک مشہور قاتل محمد اصغر بوگی اور اس کے مسلح ساتھیوں کی خدمات حاصل کر رکھی ہیں اور مصطفیٰ کھر کے مسلح گروپ "ارشد گجر گروپ" سے برسرپیکار ہے۔ واقعہ کچھ یوں ہے کہ غلام مصطفیٰ کھر اپنے زرعی فارم کے ساتھ ملنے والی لاہور کے ایک رہائشی میاں اسلم کی ۲۰۰ ایکڑ اراضی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ میاں اسلم کے انکار پر انہوں نے ارشد گجر اور دیگر مسلح افراد کو حکم دیا کہ وہ میاں اسلم کی گندم کی تیار فصل اٹھا لیں۔ مصطفیٰ کھر کے مسلح افراد میاں اسلم کی فصل اٹھا لائے۔ اگرچہ بعد میں فصل اٹھانے اور دیگر زرعی آلات کو نقصان پہنچانے وغیرہ کے الزامات کے تحت تھانہ نارنگ منڈی میں غلام مصطفیٰ کھر کے خلاف مقدمہ بھی درج ہوا لیکن پولیس کچھ نہ کر سکی۔

میاں اسلم نے غلام مصطفیٰ کھر کے مسلح آدمیوں سے اپنی زمین بچانے کے لیے ڈگرا گروپ کی خدمات حاصل کر لیں۔ ڈگرا گروپ نے اس سلسلے میں اصغر بوگی کی خدمات مستعار لے لیں اور ان دنوں دونوں مسلح گروپ ایک دوسرے کی تاک میں بیٹھے ہیں۔ ڈگرا گروپ کے حمایتی اور اصغر بوگی کے ماموں سابقہ اشتہاری ملزم چوہدری احمد خان لونگ والا نے بتایا "غلام مصطفیٰ کھر چاہتا ہے کہ علاقہ میں صرف اس کی زمین ہو اور جو بھی اراضی اس کے سامنے آتی ہے وہ اس پر قبضہ کرنا چاہتا ہے لیکن یہ مشکل ہے کیونکہ اسلحہ اور آدمی اور طاقت صرف غلام مصطفیٰ کھر کے پاس ہی نہیں' ان کے علاوہ بھی لوگ نارنگ منڈی میں رہتے ہیں"

غلام مصطفیٰ کھر نے تھانہ نارنگ منڈی کے ایس ایچ او کو کہا کہ وہ چوہدری سلطان اور اصغر بوگی وغیرہ کے خلاف مقدمہ درج کرے لیکن ایس ایچ او نے انکار کر دیا۔ جس پر غلام مصطفیٰ کھر نے اس ایس ایچ او کو لائن حاضر کرا دیا۔

Marfat.com

رمیدیاں اور شتاب گڑھ کی داستان

۱۹۷۱ء سے پہلے دریائے راوی رمیدیاں اور شتاب گڑھ نام کے ان چھوٹے دیہات کے مشرق میں بہتا تھا۔ جس کی وجہ سے دونوں دیہات کا رابطہ نارنگ منڈی سے خشکی کے ذریعے قائم تھا۔ ۷۲ء میں دریائے راوی نے اچانک کروٹ لی اور ان دونوں دیہات کو تہس نہس کرتا ہوا مغربی سمت چلا گیا اور دونوں دیہات کو نارنگ منڈی وغیرہ سے کاٹ کر ہندوستانی سرحد کے ساتھ چپکا دیا۔ مقامی لوگ جن کی گزر اوقات سرحد پار سمگلنگ اور چاول پیدا کرنے والی زرخیز ترین اراضی پر تھی' اپنی زمین سے محروم ہوئے اور سمگلنگ سے وابستہ ہو کر رہ گئے۔ حکومت نے ان کی دریا برد اراضی کو "سنٹرل گورنمنٹ کی ملکیتی اراضی" قرار دے دیا اور پاک فوج سے ریٹائرڈ ہونے والے اعلیٰ افسران کو ان کے عہدوں کے لحاظ سے طے شدہ کوٹے کے تحت زمین الاٹ کر دی۔ لیکن ان دیہاتیوں کو دریا برد ہونے والی اراضی کے عوض کہیں بھی الاٹ منٹ نہ کی گئی اور نہ ہی حکومت نے "تقاوی قرضہ اسکیم" کے تحت ان کی کوئی امداد کی۔

دریا کے اچانک رخ تبدیل کرنے سے رمیدیاں اور شتاب گڑھ کا رابطہ نارنگ منڈی سے کٹ کر ہندوستانی ضلع گورداسپور کی تحصیل لوکو کے اور دیگر قریبی دیہات سے بڑھ گیا۔ جو لوگ سمگلنگ کے دھندے سے وابستہ نہیں تھے اور ان کی ملکیتی اراضی بھی دریا برد ہو گئی تھی انہوں نے ان دیہات کو خیر آباد کہا اور نارنگ منڈی اور لاہور وغیرہ میں جا بسے جب کہ سمگلنگ پیشہ لوگوں نے اپنا دھندہ پورے زور شور سے شروع کیا۔ ہندوستانی سرحد سے قربت اور پاکستانی دیہات کی طرف راستہ میں دریا کا گہرا اور تیز بہاؤ والا پاٹ حائل ہونے کی وجہ سے ان لوگوں کا ہندوستانی دیہات پر انحصار اس قدر بڑھ گیا ہے کہ اس وقت دونوں دیہات میں روزمرہ استعمال کی ایک بھی چیز پاکستانی نہیں ملے گی۔ اس کی وجہ مقامی علاقے میں تعینات حساس ادارے ہیں جو ان دیہات کے لوگوں کو دریا عبور کرنے میں کوئی مدد نہیں دیتے جس کی وجہ سے وہ مجبور ہو جاتے ہیں اور اپنا ہر قسم کا رابطہ ہندوستان کے ساتھ قائم کرتے ہیں۔ ایک پاکستانی آفیسر نے بتایا کہ چونکہ راستہ میں حائل دریا کا پاٹ بہت خطرناک ہے اور ویسے بھی یہ لوگ برسوں سے سمگلنگ کا دھندہ کرتے چلے آ رہے ہیں اس لیے یہ ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے کہ دریا پار کر کے پاکستانی دیہات میں جائیں۔ مذکورہ آفیسر کے مطابق اس علاقے میں ضیاء دور میں سمگلنگ کا عروج ہوا اور مقامی لوگوں

نے دیگر تمام دھندے چھوڑ کر مستقل پیشے کے طور پر سمگلنگ کو اپنا لیا اور اب یہ لوگ تجربہ کار ہو چکے ہیں' ان کے پاس جدید ترین اسلحہ ہے اور اس کے ساتھ ساتھ پاکستان کے با اثر ترین افراد کی حمایت بھی انہیں حاصل ہے۔ اس لیے اگر کسی شخص کو گرفتار کیا جاتا ہے تو اس کا چالان ہونے سے پہلے اس کے سفارشی پہنچ جاتے ہیں۔ آفیسر نے مزید بتایا کہ رمیدیاں اور شتاب گڑھ کے ساتھ ملحقہ ہندوستانی سرحد میں سب سے زیادہ مال لاہور کے ایک معروف سیاسی خاندان کا جاتا ہے۔ کئی بار یہ مال پکڑا بھی گیا لیکن اس خاندان کے اثر و رسوخ کے باعث کوئی کارروائی نہیں کی جاسکی۔ تقریباً ایک سال پہلے اس خاندان کا مال پکڑا گیا جس میں دس کلوگرام سونا بھی تھا لیکن ۲۴ گھنٹے میں یہ مال اس با اثر "مالک" کو واپس کرنا پڑا۔

شتاب گڑھ اور رمیدیاں بالترتیب ۵۰ اور ۳۵ گھروں پر مشتمل چھوٹے چھوٹے گاؤں ہیں۔ ان دیہات کو ۱۹۵۵ء کے خوفناک سیلاب نے مکمل طور پر مٹا دیا تھا۔ صرف رمیدیاں گاؤں میں ۶۰۰ سے زئد افراد ہلاک ہوئے اور صرف ۳۴ افراد زندہ بچے جب کہ شتاب گڑھ میں بھی سینکڑوں افراد ڈوب کر ہلاک ہوئے۔ علاقہ کا سب سے خطرناک اور مہلک اسلحہ ان دو دیہات میں پایا جاتا ہے جب کہ مقامی سطح پر کاربین تیار کرنے کی تین عدد فیکٹریاں بھی موجود ہیں۔ مقامی لوگ ہندوستان سے لوہا سمگل کر کے لاتے ہیں اور اس سے کاربین تیار کی جاتی ہے جو سرحد پار بھیجی جاتی ہے اور نارنگ منڈی کے دیہات میں بھی آسانی سے مل جاتی ہے۔ یہ کاربین جو مقامی بولی میں "دیسی" کہلاتی ہے' ۷ سو روپیہ سے ۱۲ سو روپے تک بکتی ہے۔ اس کاربین کی اضافی خصوصیت یہ ہے کہ یہ عموماً اپنے استعمال کنندہ کو بھی زخمی کر دیتی ہے۔ اس کے علاوہ رمیدیاں اور شتاب گڑھ کی ایک اور "سوغات" روڑی برانڈ شراب ہے جو قریبی علاقوں میں منکوں کے حساب سے بکتی ہے۔ تقریباً تمام لوگ شراب کشید کرتے ہیں۔ نارنگ منڈی کی پولیس نے بتایا کہ علاقے کے تمام خطرناک اشتہاری مجرمان رمیدیاں اور شتاب گڑھ میں پناہ لیتے ہیں۔ نارنگ منڈی تھانہ کی تاریخ میں آج تک ایسا نہیں ہو سکا کہ پولیس نے کوئی اشتہاری مجرم رمیدیاں یا شتاب گڑھ جا کر گرفتار کیا ہو جب کہ پولیس کو معلوم ہوتا ہے کہ تمام بڑے ملزمان ان دونوں دیہات میں موجود ہیں۔ مذکورہ پولیس ذرائع نے اس بات کی تصدیق کی کہ مقامی لوگ اب کسی بڑی واردات کے بعد علاقہ غیر میں نہیں جاتے بلکہ انہیں چند میل سفر کرنے کے بعد بہترین پناہ گاہیں میسر آ جاتی ہیں۔

شتاب گڑھ اور رمیدیں میں مقامی لوگوں کی آپسی دشمنی بہت کم ہے اگر کوئی قتل ہوتا ہے تو صرف سمگلنگ کے لیے علاقے کی تقسیم یا مال وغیرہ کے سلسلہ میں جھگڑے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ گزشتہ بیس پچیس برس میں کبھی ایسا موقع نہیں آیا کہ سمگلنگ ایک دن کے لیے بھی بند رہی ہو۔ اگر کسی خاص ادارے کے سخت گیر آفیسر کی وجہ سے ایسا ہو تو فوراً اس آفیسر کا تبادلہ ہو جاتا ہے۔

مان گروپ اور سمرن جیت سنگھ مان

نارنگ منڈی کے نواحی گاؤں قلعہ ہرنام سنگھ کے سردار دولت مان اور سردار شبیر احمد مان کا گروپ بھی نارنگ منڈی کا بااثر ترین اور جدید ترین اسلحہ سے لیس، امیر ترین اور جارح گروپ جانا جاتا ہے۔ بنیادی طور پر یہ خاندان ایک بہت بڑا جاگیردار خاندان ہے۔ موضع مانانوالہ ملحقہ نارنگ منڈی، موضع مانانوالہ بشمولہ شیخوپورہ، موضع مان بشمولہ گوجرانوالہ اور موضوع قلعہ ہرنام سنگھ سردار خاندان کی ملکیت ہیں۔

سردار دولت خان اور سرادر بشیر احمد مان کے چچا سردار جوگندر پال سنگھ تقسیم سے پہلے آنریری مجسٹریٹ تھے۔ سردار جوگندر پال نے مانانوالہ میں سب جیل بھی بنا رکھی تھی جو آج بھی موجود ہے۔ سردار خاندان کے دولت مان اور بشیر احمد مان ۱۹۴۴ء میں مسلمان ہوگئے تو جوگندر پال نے انہیں کئی مقدمات میں الجھا کر جیل بھیج دیا۔ پاکستان بنا تو جوگندر پال سنگھ ہندوستانی صوبہ پنجاب میں چلے گئے۔ اکالی دل پنجاب کا موجودہ صدر سمرن جیت سنگھ مان انہی جوگندر پال سنگھ کا بیٹا ہے۔ جبکہ جوگندر پال سنگھ بھی پنجاب میں وزیر رہا ہے۔

سردار دولت مان اور بشیر احمد مان خاندان کی پہلی دشمنی قلعہ ہرنام سنگھ کے ایک بڑے زمیندار رانا افتخار خاندان سے شروع ہوئی۔ رانا افتخار ان دنوں ایوب خان مارشل لاء میں مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر لاہور زون تھے۔ دونوں خاندانون میں مسلح تصادم سے دو برسوں میں سات افراد قتل ہوگئے۔ رانا افتخار کے ایک بھائی رانا نثار احمد نے نارنگ منڈی کے نواحی گاؤں کوٹ محمد زمان عرف کوٹ محمد بی بی کی ایک عورت محمد بی بی (اس کے نام پر کوٹ کا نام ہے) کی بیٹی سے شادی کی اور اس کی ۲۰ مربع زرعی اراضی اپنے نام کرا لی۔ سردار خاندان اور رانا خاندان میں پانچ برس تک خونی دشمنی کا سلسلہ جاری رہا بعد میں رانا خاندان کے دوست جنرل عمران اللہ (گورنر بلوچستان) کی کوششوں سے دونوں خاندانوں میں صلح

ہو گئی۔

سردار خاندان کے رشتہ دار بہت بڑے سمگلر ہیں اور ان کا مال رکھنے کے لیے سردار خاندان نے بڑے بڑے گودام بنا رکھے ہیں۔ ایک بار ایک سرکاری خفیہ ایجنسی نے ان گوداموں پر چھاپا مار کر بھاری مقدار میں سمگلنگ کا مال برآمد کیا تھا لیکن سردار خاندان نے مسلم لیگ (ن) کے ایک مرکزی لیڈر کی وساطت سے مال چھڑوا لیا۔

جنرل حمید گل نے سینکڑوں ایکڑ اراضی کیسے بنائی؟

پاکستانی ذرائع ابلاغ میں فوج کے ایک متنازعہ اور مہم جو جنرل اور آئی۔ ایس۔ آئی کے سابق سربراہ حمید گل کا شمار اسلام پسند اور کسی حد تک بنیاد پرست جرنیلوں میں ہوتا ہے۔ اگرچہ آئی۔ ایس آئی کے ایک سابق اعلیٰ آفیسر بریگیڈیئر ارشاد ترمذی نے اپنی کتاب میں یہ انکشاف کیا ہے کہ افغان جنگ میں امریکی امداد کی پائپ لائن سے فوائد کشید کرنے والوں میں جنرل حمید گل کا نام بھی سرفہرست ہے لیکن میرے سامنے جنرل حمید گل کا جو حوالہ ہے وہ ان غریب اور پسماندہ کاشتکاروں کی زمینوں کا ہے' جو ہمارے قابل احترام جرنیل نے اپنے نام الاٹ کرا لیں۔

۱۹۸۶ء میں جنرل حمید گل کے خلاف ایک درخواست اس وقت کے وزیر اعلیٰ پنجاب میاں نواز شریف کو دی گئی جس میں تحصیل شکر گڑھ (اس وقت ضلع سیالکوٹ میں شامل تھی) کے ایک دریا برد گاؤں موضع آدا کے غریب باسیوں نے وزیر اعلیٰ سے التجا کی تھی کہ وہ اپنے اختیارات کو بروئے کار لاتے ہوئے فوج کے ایک اعلیٰ آفیسر حمید گل کے قبضے سے ان کی زرعی اراضی آزاد کرائیں۔

اس درخواست کی چوتھی شق کچھ اس طرح تھی "۱۹۶۶ء میں ہمیں معلوم ہوا کہ ہمارے دیہہ کا رقبہ بروئے دریا بردی ۱۹۵۰ء بحق سنٹرل گورنمنٹ انتقال ہو کر ریاستی مہاجرین کو الاٹ ہوتے ہوئے اس وقت کے سیکیورٹی آفیسر نارووال حمید گل اور ان کی اہلیہ اور لیفٹیننٹ کرنل محمد ہاشم خان (ڈائریکٹر بارڈر ایریا کمیٹی) کو معمولی داموں پر بیعہ ہو چکا ہے"۔ اس کے بعد چھٹی شق کچھ یوں تھی "ہم سائلان نے اس انتقال کے خلاف عدالت جناب مال افسر سیالکوٹ اپیل دائر کی' جس کا فیصلہ ہمارے حق میں ہو کر انتقال بحق سنٹرل گورنمنٹ خارج کر دیا گیا۔ بعد ازاں اعلیٰ عہدوں پر فائز مذکورہ افسران نے اپنی جدوجہد

Marfat.com

سے دوبارہ انتقال بحق سنٹرل گورنمنٹ کرا لیا اور اس طرح اپنی اراضیات قائم رکھنے میں کامیاب ہوگئے"۔ اس کے علاوہ درج تھا "بالاخر سائلان تعدادی ۷۵ نے عدالت عالیہ میں رٹ پٹیشن داخل کرا کر Satus Que حاصل کیا ہوا ہے مگر باوجود اس کے کاغذات مال میں ان افسران کے نام کا اندراج کیا جا رہا ہے اور ہماری کوئی شنوائی نہیں ہوئی"۔

"علاوہ ازیں بارڈر کمیٹی نارووال نے عدالت عالیہ میں ثبوت گزارنے کے لیے ہمارے رقبے میں ہی سے ہمارے چند اشخاص کے نام فرضی الاٹمنٹیں کر رکھی ہیں۔ حالانکہ ہم نے کبھی ایسی الاٹمنٹ کو قبول کرتے ہوئے دستخط یا نشان انگوٹھا نہیں لگوائے۔ اب ۱۹۷۸ء سے دریائے راوی نے تمام رقبہ معہ آبادی دیہہ دریا برد کر کے دیہہ ھذا کو بے چراغ کر چھوڑا ہے اور ہم سائلان بے خانماں اور بے زمین ہو کر خانہ بدوشوں کی طرح زندگی گزار رہے ہیں"۔

میں پیپلز پارٹی کے ایک سابقہ ممبر قومی اسمبلی نثار احمد پنوں کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنے لاہور کی نواحی آبادی شاہدرہ جا رہا تھا کہ ویگن میں فرش پر بیٹھی ہوئی چند عمر رسیدہ عورتوں اور مردوں کی گورداسپوری لہجے کی گفتگو نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ یہ لوگ غالباً کچہری سے واپس آ رہے تھے اور اپنے کسی مقدمے میں اگلی تاریخ کی طوالت اور جج صاحب کے رویے کے سرے جوڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے اچانک اپنی سیٹ کے ساتھ نیچے بیٹھی ہوئی ایک ضعیف عورت سے پوچھا کہ وہ شکرگڑھ کے ہیں اور کچہری کیوں آئے تھے؟ سوال کرنا تھا کہ اس عورت نے تھکے ہوئے لہجے میں مجھے کہا "وے پتر ساہنوں گل حمید جنرل نے لٹ لیا اے" (ہمیں جنرل حمید گل نے لوٹ لیا ہے) یہ حمید گل کی زمینوں والی کہانی کا پہلا سرا تھا۔ میں ان لوگوں کے ساتھ ویگن سے اتر گیا اور ان سے معلومات حاصل کرتا ہوا بالاخر ان خانماں برباد خاندانوں کے پڑھے لکھے سربراہ تک جا پہنچا، جس نے مجھے زبانی پوری کہانی سنائی اور پٹواری کی نشاندہی کر کے شکرگڑھ روانہ ہو جانے پر اکسایا۔

تحصیل شکرگڑھ کی عدالتوں کے احاطوں میں بیٹھے ہوئے حمید گل کی زمینوں کے پٹواری کے ریکارڈ نے پوری داستان میرے سامنے رکھ دی۔ "۱۹۷۶ء میں نارووال اور شکرگڑھ کے درمیان واقع ایک گاؤں مدوکے میں قریبی دیہات موضع آدا اور اولیا کے تقریباً پچاس مردوں اور عورتوں نے ایف۔ آئی۔ یو (سرحدوں پر تعینات پاکستان آرمی کی خفیہ ایجنسی فیلڈ انوسٹی گیشن یونٹ) کے کمانڈنگ آفیسر حمید گل (بغیر یونیفارم کے) اور اس کے

Marfat.com

تین ساتھیوں کو ان کی گاڑی کے سامنے رکاوٹیں کھڑی کر کے روک لیا۔ ان لوگوں کے بقول کمانڈنگ آفیسر حمید گل کے ساتھ مقامی محکمہ مال کے اہلکار تھے۔ بپھرے ہوئے ان دیہاتیوں نے حمید گل اور اس کے ساتھیوں پر حملہ کر دیا اور ڈنڈوں سے انہیں زد و کوب کرنے لگے۔ جب یہ لوگ حمید گل اور اس کے ساتھیوں کو مار رہے تھے تو اچانک حمید گل نے اپنا سرکاری پستول نکال کر دو تین ہوائی فائر کر دیے' جس سے یہ دیہاتی خوف زدہ ہوگئے اور انہیں زخمی حالت میں چھوڑ کر فرار ہوگئے۔

اس کے بعد نوجوان آرمی آفیسر حمید گل نے مقامی تھانہ شاہ غریب میں ان لوگوں کے خلاف ایف۔ آئی آر درج کرائی' جس کے تحت ان افراد میں شامل سات افراد مراد بخش' رحمت علی' محمد بوٹا' خادم حسین' بابا منگا' محمد شریف اور محمد اکرم کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ چالاک نوجوان آفیسر نے ایف۔ آئی۔ آر میں اصل واقعہ کو بیان نہ کیا اور صرف خدشہ نقص امن کی دفعہ ۱۵۱-۱۰۷ کے تحت یکطرفہ کارروائی گرفتار دیہاتیوں کے خلاف شروع کرا دی۔ پولیس نے ملزمان کا فوری چالان مکمل کر کے ریزیڈنٹ مجسٹریٹ شکرگڑھ کی عدالت میں بھیج دیا' جہاں غریب ملزمان تو باقاعدگی سے پیش ہوتے رہے لیکن مدعی ایک بار بھی پیش نہ ہوا ۔ تقریباً چار لگاتار پیشیوں کے بعد ریزیڈنٹ مجسٹریٹ نے ملزمان پر ترس کھاتے ہوئے انہیں بے گناہ قرار دے کر رہا کر دیا لیکن اس دوران یہ غریب دیہاتی دو ماہ تک جیل کی ہوا کھا چکے تھے۔

اس جھگڑے کی وجہ ایف۔ آئی یو کے نوجوان آفیسر اور اس کی اہلیہ کے نام الاٹ ہوئی وسیع و عریض زرعی اراضی تھی جس کا قبضہ ملکیت وہ نسلوں سے اس زمین کے مالک غریب دیہاتیوں سے لینا چاہتا تھا۔ مذکورہ اراضی ۱۹۵۰ء میں دیار برد ہونے کے بعد مقامی مالکوں کے علم میں لائے بغیر بحق سنٹرل گورنمنٹ انتقال ہو کر حمید گل اور اس کی اہلیہ کے نام نہایت معمولی داموں بیعہ ہو چکی تھی۔

حمید گل پر الزام ہے کہ انہوں نے دریا برد ہوئے دیہات موضوع' آدھا' اولیا اور بھوپا کے عارضی نمبردار خادم حسین کو ایک مقامی بااثر شخص کرم خان (کرم خان اس سرحدی علاقے میں "کنگ آف سمگلرز" کے نام سے جانا جاتا تھا) کی مدد سے ڈرا دھمکا کر مذکورہ اراضی کے انتقال اور قبضہ وغیرہ کے کاغذات پر دستخط کرا لیے اور انگوٹھے لگوا لیے تھے۔

آرمی کے اس نوجوان آفیسر نے اپنے آپ کو براہ راست الزام سے بچانے کے

Marfat.com

لیے اپنی اہلیہ شہناز بیگم کو غیر شادی شدہ ظاہر کیا اور محکمہ مال کے کاغذات میں شہناز بیگم کے خانے میں خاوند کے نام کی جگہ اس کی ولدیت لکھوائی۔ حمید گل نے شہناز بیگم کے کاغذات اراضی میں شہناز بیگم زوجہ حمید گل کے بجائے دختر محمد اکبر خان، قوم پٹھان یوسف زئی، ساکن سرگودھا درج کرایا۔ حالانکہ نہ صرف حمید گل کی شہناز بیگم کے ساتھ شادی کو کئی برس گزر چکے تھے، بلکہ حمید گل کے دو بیٹے بھی شہناز بیگم کے بطن سے تھے۔

ریکارڈ محکمہ مال موضع آدا تحصیل شکرگڑھ کے رجسٹر حقداران ۷۶-۱۹۷۵ میں آنسہ شہناز بیگم دختر محمد اکبر خان پٹھان یوسف زئی ساکن سرگودھا کے نام کھیوٹ نمبر ۱۸۲، ۱۳۹، کھتونی نمبر ۴۲۹ سابق خسرہ نمبر ۱۴۰۴ تا ۱۴۴۶ سے حال خسرہ نمبر ۱۳۹۳ تک کل ۳۱۷ قطعات اراضی کی صورت میں ۲۴۴۷ کنال ۸ مرلہ اراضی ہے جو مبینہ طور پر محکمہ مال کے کاغذات میں "مقبوضہ اراضی" کے طور پر لکھی گئی ہے۔

اس کے علاوہ محکمہ مال کے پٹوار حلقہ موضع آدا تحصیل شکرگڑھ کے ایک چھوٹے سے دریا برد ہونے والے گاؤں موضع اولیا میں بریگیڈیئر حمید گل ولد محمود خان قوم پٹھان، یوسف زئی ساکن سرگودھا کے نام ۲۱۸ کنال ۱۲ مرلہ زمین ہے (اس زمین میں فوج کی طرف سے الاٹ کردہ زمین کا ایک مرلہ بھی شامل نہیں)

اسی پٹوار حلقہ کا ایک اور قریبی گاؤں موضع "بھوپا" جو بعد میں دریا برد ہوگیا، اس گاؤں میں حمید گل نے موجود زمین اپنے بیٹوں کے نام منتقل کرا لی۔ حمید گل کے بیٹوں محمد عبداللہ گل اور محمد عمر گل کے نام جو زمین منتقل ہوئی، رجسٹر حقداران زمین میں اس کا ملکیتی خسرہ نمبر ۵۰ سے لے کر ۱۸۱ تک اور یہ زمین جو دریائے راوی کے زرخیز کنارے کے ساتھ ساتھ چلتی ہے، ۴۱۵ کنال ہے۔ واضح رہے کہ دریا برد ہونے والے اس گاؤں کی اراضی بعد ازاں بارڈر ایریا ایکٹ کے تحت ۱۹۷۴ء تک حکومت فوج سے ریٹائر ہونے والے کمیشنڈ افسران کو دو مربع فی کس اور نان کمیشنڈ افسران کو ایک مربع فی کس کے حساب سے الاٹ کرتی رہی ہے۔ کیونکہ دریا بردگی کے بعد اصولاً متاثر خاندانوں کو متبادل اراضی مہیا کرنا حکومت کا فرض ہے اور جو زمین دریا برد ہو، وہ خودبخود وفاقی حکومت کی ملکیت میں چلی جاتی ہے۔

اسی طرح جنرل حمید گل اور ان کے خاندان کے نام تحصیل شکرگڑھ ضلع نارووال کے پٹوار حلقہ آدا کے تینوں دیہات موضع آدا، موضع اولیا اور موضع بھوپا میں کل ۳۰۸۱ کنال، (۳۸۵ ایکڑ ایک کنال) جو ۱۵ مربع دس ایکڑ بنتی ہے، الاٹ ہے۔ موضع بھوپا والی

اراضی جو ۴۱۵ کنال کے لگ بھگ ہے' یہ تقریباً دو سال تک آباد رہی اور حمید گل کے ملازمین یہاں کھیتی باڑی کرتے رہے۔ اس دوران ان ملازمین سے ایک مغوی عورت برآمد ہوئی تو یہ ملازمین یہاں سے چلے گئے اور زمین ایک بار پھر غیر آباد ہوگئی۔

محکمہ مال شکرگڑھ اس زمین کی جو داستان رکھتا ہے' وہ حیران کن انکشافات ہمارے سامنے لاتی ہے۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہندوستان کے وقت ضلع گورداسپور جسے باؤنڈری کمیشن نے پاکستان میں شامل نہ ہونے دیا۔ اس کی ایک تحصیل شکرگڑھ جسے گورداسپور کے دیگر علاقوں سے دریائے راوی کاٹتا تھا' اسے پاکستان کو دے دیا گیا اور دونوں ملکوں کے درمیان دریائے راوی کے بہاؤ کو سرحد تصور کر لیا گیا۔ حالانکہ یہ دریا جو یہاں پہنچ کر پورے زور کے ساتھ میدانی علاقوں میں بہتا ہے' ہر سال رخ بدلتا ہے اور میلوں تک زمین کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔ نارووال شکرگڑھ روڈ پر بھٹیاں لنگا نام کے ایک سٹاپ سے پانچ میل جنوب کی طرف یہ دریا سرحد کے طور پر بہتا تھا اور قریبی گاؤں موضع اولیا' موضع آدا اور موضع بھوپا کا زرعی رقبہ دریا کے رحم و کرم پر تھا۔ چونکہ تقسیم کے وقت دریا کو ہی حد فاصل مان لیا گیا تھا' اس لیے مذکورہ دیہات جو بالکل دریا کنارے آباد تھے' ان کی بہت سی زرعی اراضی دریا پار ہونے کے باعث ہندوستان کو چلی گئی تھی۔

اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے مقامی محکمہ مال نے متاثر کاشتکاروں کو الاٹمنٹ کرنے کے لیے اردگرد کی زمینوں کو یونٹوں میں بانٹ دیا اور تقسیم کے ایک برس بعد جولائی ۱۹۴۸ء میں ان دیہات کے متاثرہ کاشتکاروں کو ایک قریبی گاؤں مدوکے میں زمین الاٹ کر دی گئی۔ کیونکہ سکھوں کا یہ گاؤں تقسیم کے بعد سکھوں کے سرحد پار چلے جانے سے خالی ہوگیا تھا' لیکن متاثرہ کاشتکاروں کو یہاں عارضی الاٹمنٹ کی گئی۔ اس دوران ان نئے الاٹیوں نے حکومت کی ہدایت کے مطابق دریا پار کی زرعی اراضی کے کلیم ۵۰' ۱۹۴۹ کے برسوں میں مقامی محکمہ مال کو جمع کرا دیے۔ اس عارضی الاٹمنٹ کے موقع پر دریا پار کی زمین کو پیداواری صلاحیت کے اعتبار سے یونٹوں میں بانٹا گیا اور دریا پار چلی جانے والی زمین کو (۱۰) یونٹ' دریا کے عین بہاؤ میں آنے والی اراضی کو (۳) یونٹ اور دیہات کے اردگرد واقع قابل کاشت اور نسبتاً زرخیز اراضی کو (۳) یونٹ کا درجہ دیا گیا۔

جن مقامی لوگوں کی زمین ۱۹۵۰ء میں دریائے راوی کی گزرگاہ تبدیل ہونے کی وجہ سے دریا کی لپیٹ میں آگئی' ان لوگوں کو اس موقع پر حکومت نے کوئی زمین الاٹ نہ کی اور یہ بے سہارا لوگ یہاں سے ہجرت کر کے بہاول پور' بہاول نگر اور صوبہ سندھ کے زرعی

Marfat.com

علاقوں میں چلے گئے۔ اسی دوران دریا نے ایک بار پھر کروٹ لی اور اب کی بار ہندوستان کے علاقے کو بہا کر لے گیا۔ دریا کے جنوب کی طرف چلے جانے کے بعد پاکستانی علاقہ میں وسعت آگئی اور زمین کو فوراً فیڈرل گورنمنٹ کی تحویل میں لے لیا گیا جبکہ پہلے سے محروم لوگوں کو کوئی زمین نہ دی گئی۔ کیونکہ جو زمین فیڈرل گورنمنٹ کی تحویل میں جا رہی تھی' اس کے اصل مالک قریبی دیہات میں زمین نہ ہونے کے باعث فاقوں مر رہے تھے لیکن حکومت نے زمین قبضہ میں لے کر فوجی افسران کو الاٹ منٹ شروع کر دی۔

۱۹۵۳ء میں ایک بار پھر دریائے راوی بپھر گیا اور دریا نے ہندوستان کی زمینوں پر آری چلا دی اور سینکڑوں ایکڑ اراضی بہا کر لے گیا اور اس نے جو زمین اپنی پشت پر چھوڑی' وہ پاکستان کے حصہ میں چلی آئی۔ اس بار پھر حکومت نے مقامیوں سے بے ایمانی کا قصد کیا اور حاصل شدہ زمین کو اس کے اصل مالکوں کے بجائے تقسیم کے وقت سی چلے آتے "ریاستی مہاجرین" کو یہ زمین الاٹ کرنا شروع کر دی۔ اس علاقے میں جو مہاجر حکومت نے آباد کیے ان میں قریبی ہندوستان سے پاکستان آنے والوں کی اکثریت شامل تھی۔

عارضی الاٹمنٹ اور دریا پار کی اراضی کے مالکوں کے کلیموں کی کنفرمیشن کا وقت آیا تو ۱۹۶۲ء میں جنرل ایوب خان کی کوششوں سے ہندوستان اور پاکستان میں سوائے کشمیر کی سرحد کے باقی تمام سرحدوں کی پختہ حد بندی کر دی گئی۔ اس دو طرفہ حد بندی کے باعث دریا پار کا وہ علاقہ جو تقسیم کے وقت سے اب تک ہندوستان کی ملکیت تصور کیا جاتا رہا تھا' وہ پاکستان کی ملکیت میں چلا آیا۔ جن لوگوں کو دریا پار اراضی کے عوض مقامی دیہات میں سکھوں اور ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی اراضی عارضی الاٹ کر دی گئی تھی' اصولاً ان کی یہ عارضی الاٹمنٹ توڑ کر انہیں ان کی اراضی واپس کی جاتی اور سکھوں اور ہندوؤں کی اراضی کو قانوناً حکومت اپنی ملکیت میں لیتی اور پھر اس کا جو استعمال چاہتی کرتی۔ لیکن ایسا نہ ہوا اور نہ ہی ان غریب دیہاتیوں کو دریا پار کی ان کی آبائی ملکیت اراضی دی گئی نہ ہی ان کے پاس عارضی طور پر الاٹ ہونے والی مقامی دیہات کی زمین رہنے دی گئی اور دریا پار کی اراضی ریاستی مہاجرین کو الاٹ کر دی گئی۔

اصل کرپشن یہاں شروع ہوتی ہے کیونکہ جب ریاستی مہاجرین کے کلیم آتے ہیں تو مقامی محکمہ مال اور مقامی با اثر سرکاری ملازمین ان پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ ان کلیموں میں شامل ایک ریاستی مہاجر خاتون مہربی بی کی زمین ایک کنال ۱۲ مرلہ کو مبینہ طور پر شکرگڑھ

Marfat.com

کے معروف پٹواری عبدالحمید آف مورلی اور پٹواری ہارون نے نائب تحصیل دار شکرگڑھ اور قانون گو شکرگڑھ تحصیل کے ساتھ مل کر جعل سازی کے ذریعے ۲۶۶۶ کنال اراضی میں تبدیل کر لیا۔ اب یہ زمین ۱۳ مربع ۷ ایکڑ اراضی کی صورت میں ایک بہت بڑے زرعی رقبہ کا روپ دھار چکی تھی۔ اس زمین کو بڑے بڑے پلاٹوں کی صورت میں موضع آدا اور بھوپا میں منتقل کر دیا گیا۔ ۱۹۶۶ء میں جب حمید گل نارروال میں فوج کی خفیہ ایجنسی کے کمانڈنٹ کے طور پر تعینات ہوئے تو انہوں نے اس زمین کو جو جعل سازی کر کے ایک کنال ۱۲ مرلہ سے ۱۳ مربع ۷ ایکڑ بنائی گئی تھی' اسے ان جعلسازوں سے مل کر بہت معمولی کی رقم کے ذریعے اپنی اہلیہ شہناز بیگم کے نام منتقل کروا لیا اور زمین کے ملکیتی کاغذات اور رجسٹر حقداران زمین میں شہناز بیگم کو اپنی اہلیہ ظاہر نہ کیا بلکہ اسے اس کے والد محمد اکبر خان کے نام کے ساتھ مالک زمین لکھوا لیا۔ کیونکہ اگر حمید گل جو اس وقت کیپٹن کے عہدے پر تعینات تھا' ساری زمین کو اپنی بیوی کے نام الاٹ کراتا اور کاغذات میں اسے اپنی زوجہ ظاہر کرتا تو پھر محکمانہ مسائل ہو سکتے تھے اور حمید گل کی ملازمت خطرے میں پڑ سکتی تھی۔ اس کے بعد حمید گل نے مقامی گاؤں موضع اولیا میں ۲۱۸ کنال ۱۲ مرلہ زمین اپنے نام منتقل کرا لی اور کاغذات میں یہ زمین مہربی بی سے بیعہ لینے کا ذکر موجود ہے حالانکہ مہربی بی کی اصل ملکیت صرف ایک کنال ۱۲ مرلہ تھی۔ اب یہ زمین حمید گل ولد محمود خان' قوم پٹھان یوسف زئی ساکن سرگودھا کے نام منتقل ہو چکی تھی۔

اس کے ساتھ ہی مقامی محکمہ مال کے کاغذات زمین میں ریاستی مہاجر مہربی بی بیوہ غلام محمد (لاولد) کے خانہ ملکیت کو ختم کر کے رجسٹر حقداران کے شروع میں مہربی بی کے خانہ ملکیت کو ایک دائرے میں کھینچ کر اس کا رخ تیر کی مدد سے حمید گل اور ان کی اہلیہ شہناز بیگم کے ملکیتی و مقبوضہ خانے کی طرف موڑ دیا۔ اس فیصلے کے تحت اب ساری اراضی حمید گل اور ان کی اہلیہ کے نام چلی گئی اور اس کے خلاف اپیل کرنے کے تمام امکانات ختم ہو کر رہ گئے تھے۔

اس کے علاوہ پٹوار حلقہ آدا کے تیسرے گاؤں "بھوپا" میں حمید گل کے بیٹوں محمد عبداللہ گل اور محمد عمر گل کی ملکیتی و مقبوضہ اراضی ۴۱۵ کنال (دو مربع ایک ایکڑ اور سات کنال اراضی) محکمہ مال کے رجسٹر حقداران زمین میں ملکیتی خسرہ نمبر ۵۰ سے ملکیتی خسرہ نمبر ۱۸۱ تک چلتی ہے۔ دونوں کے نام اکٹھی رجسٹری ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ حمید گل اور ان کی اہلیہ شہناز بیگم کے برعکس ان لڑکوں کو مقامی رہائشی ظاہر کیا گیا ہے۔

Marfat.com

دریا برد ہونے والے گاؤں کے ایک رہائشی ظہور احمد کے مطابق متاثرین کے مال آفیسر سیالکوٹ (اس وقت شکرگڑھ سیالکوٹ کی تحصیل تھی) کی عدالت میں اپیل دائر کی تو عدالت نے متاثرین کے حق میں فیصلہ دے دیا اور مذکورہ اراضی کی سنٹرل گورنمنٹ ملکیت کو توڑ دیا۔ اس طرح یہ اراضی خود بخود حمید گل وغیرہ کی ملکیت سے نکل کر زمین کے اصل مالکوں کو چلی جاتی۔ لیکن حمید گل اور لیفٹیننٹ کرنل ہاشم خان وغیرہ نے عدالت کے فیصلے کو دیگر عدالتوں سے تبدیل کرا لیا اور اپنی اراضیات قائم رکھنے میں کامیاب رہے۔ اس کے بعد اگرچہ متاثرین نے اعلیٰ عدالتوں کا بھی رخ کیا لیکن مذکورہ فوجی افسران ہر جگہ غالب آتے رہے اور بالآخر ان افسران نے ۸ جون ۱۹۶۷ء میں محکمہ مال کے انتقال نمبر ۲۵۰ کے تحت مذکورہ اراضی کو آخری بار سنٹرل گورنمنٹ کرا لیا اور یوں متاثرین بے بس ہو گئے اور زمین حمید گل وغیرہ کے پاس چلی گئی۔

جب حمید گل کو الاٹ کردہ زمین کی اصل ملکیت کا مقدمہ عدالتوں میں تھا تو ہر عدالت سے یہ حکم جاری ہوا کہ زمین کے کلیم کی اصل مالک مہر بی بی یا اس کے کسی رشتہ دار کو تلاش کر کے عدالت میں پیش کیا جائے' لیکن گزشتہ تیس (۳۰) برسوں سے کوئی بھی شخص نہ تو مہر بی بی اور نہ اس کے کسی رشتہ دار کا سراغ لگا سکا ہے اور اصل حقیقت یہ ہے کہ حکومت کی طرف سے اراضی سنٹرل گورنمنٹ کرنے کے جلدبازی میں کیے گئے فیصلے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مقامی محکمہ مال اور دیگر اعلیٰ حکام نے دوسرے نامعلوم افراد کے نام جعلی کلیم بنا کر مختلف لوگوں کو الاٹ کر دی۔ ان الاٹیوں میں ہمارے جنرل حمید گل بھی شامل تھے اور ان الاٹیوں کو ملنے والی زمین پر ان کی ملکیت کی بقاء اسی میں تھی کہ زمین سنٹرل گورنمنٹ کی ملکیت میں رہتی۔ لہٰذا ان اعلیٰ افسران نے چھوٹی عدالتوں اور حکومت پر دباؤ ڈال کر زمین کو سنٹرل گورنمنٹ کے زمرے سے نکلنے ہی نہ دیا اور یوں ان کی ملکیت دائمی ہو گئی اور بے سہارا غریب لوگ جو زمین کے اصل مالک تھے' دربدر دھکے کھانے لگے۔

حمید گل کو الاٹ ہوئی وسیع و عریض اراضی بعد میں جب حمید گل کے قبضہ میں آئی اور مقامی غریب مالک اس کو ہمیشہ کے لیے بھول گئے تو اس کی اصل وجہ علاقے کا خطرناک ترین اسمگلر کرم خان تھا' جسے "کنگ آف اسمگلرز" کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ حمید گل نے غریب لوگوں کو زمینوں سے اٹھانے کے لیے کرم خان کی خدمات حاصل کیں اور کرم خان نے ان لوگوں کو بھگا دیا۔

واقعہ اس کا یوں ہے کہ حمید گل جو سرحدی علاقہ میں ایف۔ آئی۔ یو (F.I.U)

Marfat.com

کے کمانڈنٹ آفیسر تھے' انہوں نے ایک بار کرم خان کو اسمگلنگ کے مال سمیت گرفتار کر لیا لیکن بعد میں اس شرط پر کرم خان کو چھوڑ دیا کہ وہ ان کی زمینوں پر انہیں کا قبضہ دلوائے گا۔

۱۹۷۸ء کے خوفناک سیلاب میں یہ دیہات بھوپا' آدا اور اولیا ایک بار پھر مکمل طور پر تباہ ہوگئے۔ چونکہ اس بار تباہ ہونے والے دیہاتیوں کے پاس زمینوں کا آسرا بھی نہیں تھا کہ وہ حمید گل اور کرم خان جیسے طاقتور لوگوں سے اپنی اراضی واپس لیتے یا عدالتیں ان کی شنوائی کرتیں۔ لہٰذا یہ مظلوم لوگ ان علاقوں سے ہجرت کر گئے اور فیصل آباد' ٹوبہ ٹیک سنگھ' گوجرہ اور لاہور کی نواحی بستی شاہدرہ کے گورایہ پارک میں آباد ہوگئے۔ اب یہ لوگ اگرچہ ان علاقوں میں مکمل طور پر بس گئے ہیں لیکن انہیں ان کی آبائی زمین نہیں بھولی۔ حالانکہ یہ زمین اس وقت بھی بڑی حد تک دریا کے رحم و کرم پر ہے لیکن ان کے پاس نہیں۔ اگرچہ حمید گل نے اس زمین پر قابض ہونے کا دعویٰ محکمہ مال کے کاغذات میں بھی کیا ہے لیکن اس وقت حمید گل اس زمین کو کاشت نہیں کر رہا۔

Marfat.com

پاکستان ریلوے کو لوٹنے والے کون؟

پاکستان ریلوے وفاق کے زیر انتظام چلنے والا غالباً واحد ادارہ ہے جو گزشتہ دو دہائیوں سے مسلسل اربوں روپے کا خسارہ برداشت کر رہا ہے۔ اس خسارے میں ٦٠ فیصد حصہ ان بدعنوانیوں کا ہے، جو ریلوے کے اعلیٰ افسران اور حکومتوں کے مقرر کردہ ریلوے کے وفاقی وزراء اور ریلوے کے پارلیمانی سیکرٹری کرتے ہیں۔ جب کہ باقی ٤٠ فیصد خسارہ سکریپ اور ویگنوں کی چوری، کرایوں کی وصولی میں ہونے والے گھپلوں، ناقص میٹریل کی خرید، ٹھیکیداروں کی بے ایمانیوں اور دیگر ناقص منصوبہ بندیوں کی مد میں چلا جاتا ہے۔

ہر وفاقی حکومت اپنے دور میں ریلوے کے بھاری خسارے اور بدعنوانیوں کی وجہ تلاش کرنے کے لیے محکمانہ اور پارلیمانی کمیٹیاں تشکیل دیتی ہے۔ یہ کمیٹیاں طویل عرصہ تک اپنے رشتہ داروں کو ریلوے کے ایئرکنڈیشنڈ سیلونوں میں چھوڑ دیتی ہیں تاکہ جب تک ان کی "تحقیقاتی عرض ریزی" چلتی رہے عوضانہ کے طور پر ان کے عزیز و اقارب مستفید ہوتے رہیں۔ یہی حال ریلوے ریسٹ ہاؤس کا ہوتا ہے، جہاں ہمارے وفاقی وزراء، ان کے عزیز و اقارب اور پارلیمانی سیکرٹریوں اور ان کی اولادیں، ان کے دوست اور دیگر بہت سے لوگ "محفلیں" منعقد کرتے ہیں اور اپنی "ذمہ داریاں" نبھاتے رہتے ہیں۔ یہ تحقیقاتی کمیٹیاں آج تک کسی ایک رپورٹ کو تیار کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکیں۔ ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ رپورٹ ابھی ادھوری ہوتی ہے کہ حکومت توڑ دی جاتی ہے یا رپورٹ اپنے مندرجات کے باعث حکومت کی بدنامی کا باعث بن سکتی ہے یا یہ رپورٹ امداد دینے والے بین الاقوامی مالیاتی اداروں کے ہتھے بھی چڑھ سکتی ہے اور اس صورت میں امداد بند ہونے کا خدشہ بھی لاحق رہتا ہے۔ اس لیے ریلوے کے ارباب اختیار حتی المقدور کوشش کرتے ہیں کہ ہر مالی سال کے شروع میں محکمانہ بدعنوانوں کی تحقیق کے لیے کچھ رقم بجٹ میں

Marfat.com

مخصوص کرائیں۔ بعد میں "زبردست" قسم کی تحقیقاتی کمیٹیاں ملک کے مہنگے ترین ہوٹلوں میں تحقیقات کا جال پھیلا دیں، لیکن کبھی بھی ایک بھی رپورٹ مکمل نہ ہو۔ کیونکہ اس صورت میں شاید ہر سال کی بے شمار انکوائریوں کی تعداد میں کمی آنا شروع ہو جائے اور ایک پورا طبقہ بے روزگار ہو جائے۔

اس کے برعکس حسب روایت حکومتیں جب اپنی سالانہ "شاندار کارکردگی" کی نمائش کے لیے محکمانہ رپورٹیں تیار کرواتی ہیں تو ان رپورٹوں میں موجود "سنسر شدہ" حقائق اور اعداد و شمار بھی رونگٹے کھڑے کر دینے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر حکومتی رپورٹ کے مطابق سال ۹۴-۱۹۹۳ء میں پاکستان ریلوے کو ۱۰ ارب روپے کے خسارے کا سامنا تھا۔

سالانہ رپورٹ کے اس خسارے میں پاکستان ریلوے کی ملکیتی ان وسیع و عریض زمینوں کی حالت اور ان کی قیمت شامل نہیں تھی جو پورے ملک میں بچھی ریلوے لائنوں اور ریلوے اسٹیشنوں کے ساتھ ملحق ہیں۔ واضح رہے کہ ایک اندازے کے مطابق اس وقت صرف پنجاب میں ریلوے کی ملکیتی ۸۰ ہزار ایکڑ اراضی یا تو قبضہ گروپوں کے پاس ہے یا پھر اس پر آبادیاں تعمیر ہو چکی ہیں اور یا پھر بااثر سیاست دانوں نے اس اراضی پر قیمتی پلازے تعمیر کر دیے ہیں۔

محکمہ ریلوے میں گھپلوں کا معروضی اندازہ اس کی ورکشاپوں اور بجٹ میں ظاہر کیے گئے نئے منصوبوں سے ہوتا ہے۔ لاہور میں مغلپورہ کے علاقہ میں واقع ایشیا کی سب سے بڑی ریلوے ورکشاپ میں ہر سال کروڑوں روپے کی بدعنوانیاں اور گھپلے ہوتے ہیں۔ ورکشاپ کے تمام شعبہ پر یونین کے اراکین کا اس قدر قبضہ ہے کہ ورکشاپ کی لوہا پگھلانے والی بھٹیاں، جو تکنیکی طور پر ہر وقت چالو رکھنا پڑتی ہیں، عرصہ دراز تک خالی چلتی رہتی ہیں۔ لیکن نہ ان میں ڈالنے کے لیے میٹریل موجود ہوتا ہے اور نہ کوئی کاریگر۔ کیونکہ کاریگر تو یونین سے مل کر اور اپنی تنخواہ کا کچھ حصہ یونین کو دے کر باقی کی تنخواہ لیتا ہے اور اپنا زیادہ تر وقت شہر کے نجی کارخانوں میں مہارت استعمال کرنے میں صرف کرتا ہے۔ جب کہ محکمانہ حاضری رجسٹروں پر باقاعدگی سے حاضری لگتی ہے اور ایک ماہر انجینئر کی رائے کے مطابق مغلپورہ ورکشاپ کی خالی بھٹیاں چلنے سے مجموعی طور پر محکمے کو روزانہ ۵ سے ۷ لاکھ روپے کا نقصان ہوتا ہے۔

سابق وزیراعظم میاں نواز شریف نے روایت ڈالی کہ ریلوے کے ماہر انجینئروں اور

Marfat.com

بیرون ملک تربیت یافتہ افراد کو بھاری معاوضوں پر اپنے کارخانے اتفاق فونڈریز میں کام کرنے پر لگا دیا۔ ورکشاپ کے ذرائع کے مطابق جب نواز شریف وزیراعظم تھے تو اس وقت ان کی تمام فیکٹریوں میں ریلوے کے باقاعدہ ملازمین کام کرتے تھے اور ریلوے کی اپنی ورکشاپیں کام کرنے والوں سے خالی پڑی رہتی تھیں۔ ریلوے باقاعدہ ان ملازمین کو بھاری تنخواہیں اور ان کی بیرون ملک تربیت پر بھاری اخراجات برداشت کرتا رہتا اور اس طرح ریلوے کے کاریگروں کی طرف سے ریلوے ورکشاپوں میں کام نہ کرنے کے باعث ریلوے کے چالو پراجیکٹس کے باعث ریلوے کو ماہانہ ایک کروڑ روپے تک کا نقصان برداشت کرنا پڑتا۔

یونین کے تسلط کا دوسرا بڑا شاخسانہ ریلوے ورکشاپوں سے سکریپ کی بڑے پیمانے پر چوری ہے اور یہ چوری پورے ملک میں پھیلے ریلوے ہیڈ کوارٹرز' ریلوے گوداموں اور ورکشاپوں میں جاری ہے۔ سکریپ کی چوری کا یہ حال ہے کہ ۱۹۹۵ء میں صرف راولپنڈی ریلوے ڈپو سے ۲ کروڑ ۳۲ لاکھ روپے کا سکریپ چوری ہوا۔ چوری کرنے والے ریلوے ملازمین تھے' جنہیں ریلوے پولیس سمیت اعلیٰ افسران کی معاونت حاصل تھی۔ اسی طرح ۹۵ء میں مغل پورہ ریلوے ورکشاپ سے تقریباً تین کروڑ روپے کا سکریپ اور دوسرا تیار شدہ سامان چوری اور غیر قانونی طور پر لاہور کی بڑی بڑی لوہا مارکیٹوں میں فروخت ہوا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق صرف مغل پورہ ورکشاپ سے ہر سال ایک کروڑ روپے مالیت کے ویٹ' ڈمبلز اور ورزش کا دوسرا سامان چوری ہو جاتا ہے اور ملک کی بیشتر مارکیٹوں میں کھلے عام فروخت کیا جاتا ہے۔

جہاں تک ریلوے کے منصوبہ سازوں کا تعلق ہے' ان کے پاس شاید ہی کوئی ایسا ایماندار شخص ہو' جو ریلوے ڈیپارٹمنٹ کی ابتری پر نالاں ہو اور سائنسی بنیادوں پر مستقبل کی منصوبہ بندی کرنے کا خواہاں ہو۔ مثال کے طور پر گزشتہ برسوں میں لاہور مغل پورہ ریلوے ورکشاپ میں ۲ ارب روپے کی کثیر رقم خرچ کر کے "لوکو موٹو" انجن بنانے کا منصوبہ شروع کیا گیا۔ اس مقصد کے لیے لاکھوں ڈالر خرچ کر کے غیر ملکی ماہرین کو پاکستان بلایا گیا تاکہ اس منصوبے کے لیے ان کی ماہرانہ رائے معلوم کی جا سکے۔ ان ماہرین نے جگہ کا جائزہ لے کر محکمہ ریلوے کے اعلیٰ حکام کو بتایا کہ "لوکو موٹو" انجنوں کی تیاری کے لیے انفراسٹرکچر کے لحاظ سے یہ جگہ قطعی طور پر ناموزوں ہے۔ لہٰذا مغل پورہ ورکشاپ میں "لوکو موٹو" انجن بنانے کا پلانٹ نہ لگایا جائے۔ لیکن محکمہ کے اعلیٰ افسران نے یہ تجویز

نامنظور کر دی اور مغل پورہ ورکشاب میں "لوکو موٹو" انجن تیار کرنے کا پلانٹ نصب کرا دیا اور اس کے باعث اخراجات میں غیر معمولی اضافہ ہوا اور ان اخراجات میں ۸۰ فیصد حصہ ان غیر ضروری اخراجات کا تھا' جو ایک نامناسب جگہ پر پلانٹ کی تنصیب کے باعث اٹھانے پڑے۔

اس پلانٹ کی تنصیب کے بعد جب مغل پورہ ورکشاپ میں پہلا "لوکو موٹو" انجن تیار کیا گیا تو اس پر کل ۷ کروڑ ۹۵ لاکھ اور ۴۰ ہزار روپے لاگت آئی جبکہ یہی "لوکو موٹو" انجن غیر ملکی فرموں سے تیار کروانے کے بعد اور درآمدی ڈیوٹی ادا کر کے بھی پاکستان میں ۶ کروڑ ۷۷ لاکھ اور ۱۰ ہزار روپے میں پڑتا۔

مغل پورہ ورکشاپ کی کارکردگی کے بارے میں محکمہ ریلوے کی طرف سے وفاقی حکومتوں کو مسلسل رپورٹیں دی جاتی رہی ہیں۔ ورکشاپ کے بارے میں ناقص کارکردگی کی پریشان کن رپورٹیں ۹۰ سے شروع ہوئیں اور میاں نواز شریف وزیراعظم پاکستان پر الزام لگایا جانے لگا کہ وہ مغل پورہ ورکشاپ کے معاملات میں دخیل ہیں اور ہر وقت ورکشاپ سے اپنے کارخانوں کو فائدہ پہنچانے کے جتن کرتے رہتے ہیں۔ اس سے قبل ۱۹۸۸ء میں ریلوے کو بھیجی جانے والی ایک رپورٹ میں الزام لگایا گیا تھا کہ ورکشاپ کا سکریپ اور بعض قیمتی مشینوں کے پرزے مبینہ طور پر میاں نواز شریف وزیر اعلیٰ پنجاب کے کارخانوں کو بھیج دیے گئے۔

محکمہ ریلوے نے مغل پورہ ورکشاپ کی طرز پر ملک کے کئی حصوں میں بین الاقوامی مالیاتی اداروں کے تعاون سے ورکشاپیں بنوائیں۔ اسی طرز کی ایک چھوٹی ورکشاپ صوبہ سندھ میں حیدر آباد میں قائم کی گئی' جس کو کیرج اینڈ ویگن شاپ حیدر آباد کا نام دیا گیا۔ کیرج اینڈ ویگن شاپ ورکشاپ حیدر آباد کا سالانہ بجٹ تقریباً چار کروڑ بیس لاکھ روپے ہے۔ گزشتہ دو برسوں میں پاکستان ریلوے نے ۹۳ ویگنیں مرمت کے لیے کیرج اینڈ ویگن شاپ ورکشاپ حیدر آباد کو بھیجیں۔ حکومت ان ویگنوں کی جلد مرمت کرانا چاہتی تھی کیونکہ ویگنوں کی عدم دستیابی کے باعث محکمہ نقصان اٹھا رہا تھا۔ مرمت کے لیے جانے والی ان ویگنوں کی مرمت معینہ مدت سے ۹ ماہ لیٹ کردی گئی۔ جس کے باعث محکمہ کو ۳۰ لاکھ روپے کا نقصان اٹھانا پڑا۔ مرمت کے لیے بھیجی گئی ان ویگنوں کا کام ایک ساتھ شروع نہ کیا گیا اور کئی ویگنیں زیادہ عرصہ پڑی رہنے کے باعث ناکارہ ہوگئیں اور ان کو دوبارہ ٹھیک کرنے کے لیے مزید ۲ کروڑ روپے خرچ کرنا پڑے۔

Marfat.com

جب یہ ویگنیں مرمت کے بعد ریلوے کو واپسی کے لیے تیار کھڑی تھیں تو حیران کن طریقے سے ان ویگنوں میں سے ۶۵ ڈیوہیکل ویگنیں سرے سے غائب ہوگئیں۔ ویگن اینڈ کیرج ورکشاپ کے ذرائع کے مطابق ان ویگنوں کی چوری سے محکمہ ریلوے کو ۳۸ کروڑ روپے کا نقصان اٹھانا پڑا۔ جب کہ ویگنوں کی چوری کا بھیانک کھیل ۹۶ء میں بھی جاری رہا اور پراسرار طور پر ۴۵ ویگنیں غائب کر دی گئیں اور درجنوں ویگنوں کی مرمت کا کام بہت زیادہ تاخیر کا شکار ہوگیا' جس کے باعث ریلوے کو ۵ کروڑ روپے کا خسارہ برداشت کرنا پڑا۔ کیرج اینڈ ویگن شاپ ورکشاپ حیدر آباد کے عملہ نے عام استعمال کی لوکل پرچیز میں بھی ۸ لاکھ روپے کا گھپلہ کیا اور ۵ لاکھ روپے کی خلاف ضابطہ اشیاء خرید لیں۔

مغل پورہ ورکشاپ میں ۱۹۹۲ء سے درمیانے درجے کے ریلوے انجن تیار کرنے کی صلاحیت موجود تھی اور چھوٹے پیمانے پر انجنوں کی تیاری جاری تھی لیکن ریلوے حکام نے وزیر ریلوے کی اجازت سے ایک جاپانی فرم سے ۲۳ ڈیزل اور الیکٹریکل انجن خرید لیے۔ یہ انجن بہت مہنگے داموں خریدے گئے جس سے ۱۵ کروڑ ۲۶ لاکھ روپے کا نقصان محکمہ کو پہنچایا گیا۔ حیران کن بات یہ ہے کہ ان انجنوں کی فراہمی اور خریداری کے لیے ٹینڈر بھی جاری نہ کیے گئے۔

اسی طرح ریلوے نے پاکستان اسٹیٹ آئل کو بلاجواز زائد نرخ لگا کر ۴۳ لاکھ روپے اضافی ادائیگی کر دی جب کہ وفاقی وزیر ریلوے نے اس بدعنوانی کی تحقیق کے لیے کمیٹی بنائی تو ایسے افراد کو بھی کمیٹی میں شامل کر دیا جو اس "سودے" میں شامل تھے اور انہوں نے کمیشن کھایا تھا۔

ریلوے کی گرتی ہوئی معاشی حالت کو سنبھالا دینے کے لیے وفاقی حکومت نے ۷۲ کروڑ روپے کی ہنگامی امداد دی جب کہ بیرونی مالیاتی اداروں سے ریلوے کو ۶۵ کروڑ روپے کا قرضہ بھی ملا۔ اس قرضے کی فراہمی کے بعد ریلوے پر غیر ملکی قرضوں کا بوجھ ۴ ارب ۲۰ کروڑ روپے تک پہنچ گیا اور اس ساری رقم پر سود کی سالانہ شرح ۵۰ کروڑ روپے سے زائد تھی۔

ایک رپورٹ کے مطابق ۳۰ جون ۹۴ء تک پاکستان ریلوے کا خسارہ ۹ ارب ۹۵ کروڑ ۱۷ لاکھ روپے تھا جو ۳۰ جون ۹۵ء تک بڑھ کر ۱۰ ارب' ۲۵ کروڑ روپے تک جا پہنچا تھا اور اس خسارے کی شرح مسلسل بلند ہو رہی تھی۔ واضح رہے کہ حکومت اب تک محکمہ ریلوے کو ۲۰ ارب روپے فراہم کر چکی ہے تاکہ ریلوے کے معاشی بحران پر قابو پایا جائے

لیکن یہ ممکن نہیں ہو سکا۔

صرف ۹۵ء میں ریلوے نے ۵ کروڑ روپے منظوری حاصل کیے بغیر خرچ کر دیے اور ان اخراجات کا ریکارڈ تک ضائع کر دیا گیا۔ حکومت کی طرف سے جو انکوائری کمیٹی بنائی گئی' اس کی تیار کردہ رپورٹ میں یہ رقم ۳ کروڑ درج کی گئی۔ اس کے علاوہ ریلوے کے ٹھیکوں سے ۲ کروڑ روپے کی وصولیاں نہ کی گئیں جب کہ ۲ کروڑ روپیہ بلاوجہ معاف کر دیا گیا اور ریکارڈ بھی ضائع کر دیا گیا۔

اسی طرح ملک کے تمام پرانے لائن سگنلز کو جدید بنانے کے لیے ورلڈ بینک کی ۷۰ کروڑ روپے کی امداد سے ایک پراجیکٹ شروع کیا گیا۔ اس پراجیکٹ کے تحت تقسیم ہند سے لے کر اب تک ملک کی ریلوے لائنوں پر لگے مٹی کے تیل سے چلنے والے سگنلز کو تبدیل کر کے ان کی جگہ بجلی کے بلب لگانا مقصود تھا۔ کیونکہ یہ "دیسی سگنلز" لاتعداد مہلک حادثات کا موجب بن چکے تھے۔ دو سالہ مدت کے اس پراجیکٹ کا صرف ۱۰ فیصد کام مکمل ہو سکا اور ریلوے کے مجاز حکام نے لاہور' کراچی اور دیگر چند بڑے شہروں کے قریب کے سگنلز تبدیل کر دیے لیکن باقی تمام جگہوں پر کام نہ کیا گیا اور یوں ۴۰ کروڑ روپے کی رقم بدعنوانیوں کی نذر ہو گئی۔

ان گھپلوں کے پیچھے سابق وزیراعظم بے نظیر بھٹو کے شوہر جناب آصف علی زرداری تھے جو وفاق میں ریلوے کا باقاعدہ وزیر نہ ہونے کی وجہ سے ریلوے کے معاملات میں وزیراعظم صاحبہ کی معاونت کرتے تھے۔ اول تو یہی حیران کن ہے کہ جہاں تقریباً ہر ایک بڑی اور اہم وزارت کے حصے بخرے کر کے اسے دو دو وزارتوں میں تبدیل کر دیا گیا تھا' وہاں بعض ایسی وزارتیں بھی تھیں' جن کا کسی کو وزیر نہ بنایا گیا اور سارا معاملہ ایڈھاک کے ذریعے چلتا رہا۔ اس کی بڑی مثال ریلوے اور لوکل گورنمنٹ کے محکمے تھے' جہاں کرپشن کا بازار گرم رہا اور وزیراعظم کے قریبی ساتھی ان محکموں کے فنڈز پر ہاتھ صاف کرتے رہے۔

۹۶ء کے شروع میں ریلوے کے اعلیٰ افسران نے فرائیٹ ویگنوں کے لیے رولرز اور دیگر فاضل پرزوں کی خریداری میں بڑے پیمانے پر گھپلے کیے۔ حالانکہ محکمہ کی طرف سے ان فاضل پرزوں کی خرید کا ٹینڈر بھی دیا گیا تھا لیکن ملی بھگت کے ذریعے غیر معیاری پرزے خرید لیے گئے جس سے محکمہ کو ۱۳ کروڑ روپے کا نقصان اٹھانا پڑا۔ کیونکہ خرید کے فوری بعد یہ پرزے بالکل ناکارہ ہو گئے اور ریلوے کی فرائیٹ ویگنیں ورکشاپوں میں کھڑی کر

Marfat.com

دی گئیں اور چند ماہ کے بعد یہ ویگنیں بالکل ناکارہ ہو گئیں۔

۱۹۹۵ء میں راولپنڈی ریلوے اسٹیشن کی تزئین و آرائش کا کام شروع کیا گیا۔ محکمہ کی طرف سے ٹھیکیداروں کو بروقت ادائیگی نہ کی گئی جس کے باعث ٹھیکیداروں نے کام بند کر دیا اور ادائیگیوں تک مزید کام کرنے سے انکار کر دیا۔ کام بند ہو جانے کے باعث محکمہ کو ایک کروڑ ۷۵ لاکھ روپے کا نقصان برداشت کرنا پڑا جب کہ اس سے پہلے محکمہ مذکور ٹھیکیداروں کو ۸۰ لاکھ روپے پیشگی رقم کے طور پر ادا کر چکا تھا۔ اس کے علاوہ راولپنڈی اسٹیشن پر ٹائلیں لگانے کا کام شروع کرایا گیا۔ ٹھیکیدار کو ۱۳ لاکھ روپے کی ادائیگی کر دی گئی۔ جب کسی شہری کی شکایت پر ٹائلیں لیبارٹری سے چیک کرائی گئیں تو معلوم ہوا کہ یہ ٹائلیں قطعی غیر معیاری ہیں۔ کام بند کر دیا گیا لیکن محکمہ اس مد میں ۹۰ لاکھ روپے کا نقصان اٹھا چکا تھا۔ اسی ریلوے اسٹیشن کے وی۔ آئی۔ پی لاؤنج کے لیے ۳ لاکھ روپے سے فرنیچر خرید لیا گیا اور یہ رقم ۵۰ ہزار روپے کے چھ ورک آرڈروں کی شکل میں خرچ کی گئی تاکہ ۵۰ ہزار سے زائد رقم خرچ کرنے کے لیے مجاز حکام سے اجازت نہ لینی پڑے۔

اسی سال ورلڈ بینک کے تعاون سے ریلوے کے ۴۶ ناکارہ انجن دوبارہ چالو کرنے کے پراجیکٹ کا آغاز کیا گیا۔ اس پراجیکٹ پر ۲۹ کروڑ روپے کی لاگت آئی۔ ابھی یہ کام تقریباً ۱۰ فیصد تک مکمل ہوسکا تھا کہ بعض سیاسی عناصر کی طرف سے اسے روک دیا گیا۔ محکمہ اس مقصد کے لیے ۱۴ ہزار فاضل پرزے خرید چکا تھا۔ محکمہ کے بعض افسران نے ان پرزوں میں سے ۵ ہزار پرزے "ناکارہ" قرار دے کر گوداموں میں ڈال دیے اور مرمت کا کام روک دیا۔ اس کے بعد مذکورہ مجاز افسران نے مطالبہ کیا کہ ان ۵ ہزار "ناکارہ" پرزوں کی جگہ نئے پرزے مہیا کیے جائیں جب کہ ان پرزوں کی چیک اپ رپورٹیں بھی غائب کر دی گئیں۔ ریلوے حکام نے اس سلسلہ میں کوئی تحقیقاتی کمیٹی قائم نہ کی اور یوں یہ سارا معاملہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا۔

۱۹۹۴ء میں دو سال کے لیے محکمہ ریلوے نے لاہور تا نارووال سیکشنوں پر نجی شعبہ کو ٹھیکہ دیا جس کی مالیت ایک کروڑ دس لاکھ روپے مقرر کی گئی۔ اس دوران محکمہ کی طرف سے ٹھیکیدار کو ۲۷۰۰ کوچز مہیا کرنے کا معاہدہ دستخط ہوا لیکن جنرل مینیجر ریلوے نے بھاری رشوت وصول کر کے اپنی طرف سے کوچز کی تعداد بڑھانے کا فیصلہ کیا اور ایکدم اس تعداد کو ۵۴۰۰ کر دیا جس سے دوسری ٹرینوں کو سخت بحران سے گزرنا پڑا جب کہ لاکھوں مسافروں کو روزانہ مسائل کا سامنا رہا۔ اس معاہدے میں ٹھیکیدار کو دس اقساط میں پوری

Marfat.com

رقم جمع کرانے کا اختیار دیا گیا تھا لیکن جنرل مینیجر نے پھر جان بوجھ کر اس تعداد کو ۱۲ کر دیا اور اقساط کی ادائیگی میں تاخیر کے باعث عاید ہونے والے جرمانے ۳۸ لاکھ روپے کی رقم بھی معاف کر دی۔ حالانکہ اس نوعیت کا کوئی اختیار جنرل مینیجر کو حاصل نہیں تھا۔

۹۵ء میں ریلوے کے اسٹیشنوں پر خورد و نوش کی اشیاء فروخت کرنے کے اسٹال سیاسی بنیادوں پر فراہم کیے گئے۔ سٹال حاصل کرنے والوں میں ۹۰ فیصد "جیالے" تھے جنہوں نے ٹھیکوں کی ابتدائی شرائط بھی پوری نہ کیں لیکن ناہید خان (سیاسی مشیر بے نظیر) اور وزیراعظم کے شوہر آصف علی زرداری کی سفارش پر ٹھیکے حاصل کر لیے۔

اس موقع پر محکمہ کی طرف سے بدعنوانی اس صورت میں شامل کی گئی کہ اے کلاس سیکشن میں ۵۰۲ سٹالوں کو بڑھا کر یکدم ۱۴۵۵ کر دیا۔ بی کلاس میں ۵۱۳ سٹالوں کو بڑھا کر ۹۸۵ کر دیا جب کہ سی کلاس میں ان کی تعداد کم کر دی اور سی کلاس سٹالوں کی تعداد ۵۲۲ سے کم کر کے ۵۱۳ کر دی۔

سیاسی بنیادوں پر سٹال حاصل کرنے والے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے رہے اور ناقص اشیاء بہت زیادہ نرخوں پر فروخت کرتے رہے اور ساتھ انہوں نے خود پیسے وصول کر کے جگہ جگہ خوانچہ فروش کھڑے کر دیے اور معاہدوں کے اختتام پر ریلیے کاپ اور ریل کبانہ کو ایک کروڑ ۶۰ لاکھ روپے کی رقم بھی ادا نہ کی گئی۔

اس برس کراچی میں ریلوے کے لیے غیر معیاری تار خرید کر محکمہ کو ۲۸ لاکھ روپے کا نقصان پہنچایا گیا۔ جب کہ کروڈ آئل کی جگہ استعمال شدہ لیوب آئل خرید لیا گیا جس سے ۱۰ لاکھ روپے کا نقصان اٹھانا پڑا۔ لاہور میں غیر معیاری سامان خرید کر محکمہ کو ۲ لاکھ ۱۲ ہزار کا نقصان پہنچایا گیا اور ساتھ ہی غیر معیاری بیٹنگ ربر خرید لیا گیا جس سے ریلوے کو ۱۹ لاکھ روپے کا نقصان اٹھانا پڑا۔ ٹریک کرین کے لیے ٹینڈر میں سب سے کم بولی دینے والی فرم کو نظر انداز کر کے محکمہ کو ۱۶ لاکھ روپے کا نقصان پہنچایا گیا اور ایک اہم سیاسی شخصیت کے دوست کو ٹھیکہ دے دیا گیا۔

فرائٹ ویگنوں کے لیے ۱۰ ہزار اڈاپٹر خریدنے کے لیے ٹینڈر میں سب سے کم بولی دینے والی فرم کو نظر انداز کر کے محکمہ کو ۲ کروڑ ۹ لاکھ روپے کا نقصان پہنچایا گیا۔ اس کے علاوہ ریلوے کے ایک اعلیٰ افسر کے لیے ۱۸ لاکھ روپے کا پلاٹ بغیر کسی منظوری کے خرید لیا گیا اور ادویات کی لوکل پرچیز میں ۷ لاکھ روپے کا نقصان برداشت کرنا پڑا۔

بڑھتے ہوئے بیرونی قرضے اور حد سے بڑھے ہوئے سٹیٹ بینک کے اوور ڈرافٹ

Marfat.com

بھی ریلوے کی تیزی سے گرتی ہوئی مالی حالت کو نہ سنبھال سکے بلکہ پاکستان ریلوے "معکوس" ترقی کی سمت برق رفتاری کے ساتھ بڑھتا رہا۔ ایک آڈٹ رپورٹ کے مطابق پاکستان ریلوے میں مالیاتی نظم کا کوئی وجود نہیں اور مجموعہ خسارہ ۱۵ ارب روپے سے تجاوز کر چکا ہے۔ خرچ اور آمدنی کے بڑھتے ہوئے فرق کو پاٹنے کے لیے ریلوے انتظامیہ نے سٹیٹ بینک آف پاکستان سے حد سے زیادہ اوور ڈرافٹ حاصل کرنا شروع کر دیے ہیں۔ ۱۹۹۳ء کے آغاز میں پاکستان ریلوے نے سٹیٹ بینک سے ایک ارب روپے سے زائد کا اوور ڈرافٹ لیا۔ واضح رہے کہ ۹۲ میں یہ اوور ڈرافٹ ۳۱ کروڑ روپے کا تھا جو ریلوے کی گزشتہ تاریخ میں سب سے زیادہ تھا۔ یہ صورت حال برقرار رہی اور پاکستان ریلوے نے مارچ ۹۵ء تک ساڑھے تین ارب روپے اوور ڈرافٹ کے طور پر حاصل کیے اور اپنے انتظامی اخراجات کو اس طرح پورا کیا۔ صرف آڈٹ کی مد میں ہونے والی بدعنوانیوں کا یہ حال ہے کہ ریلوے کا ڈائریکٹر جنرل ہر ۱۰ ہزار روپے کے آڈٹ کے لیے ۳ ہزار روپیہ وصول کرتا ہے۔

آڈٹ رپورٹوں میں ریلوے کی مجموعی آمدنی ۹.۱۷۵ ارب روپے ظاہر کی گئی ہے جب کہ سال ۹۴-۹۳ کے دوران ریلوے نے نقد رقم کی صورت میں ۹.۱۳۵ ارب روپے کمائے۔ اس نقد رقم میں وہ حکومتی امداد جو کہ ریلوے کو خسارے میں چلنے والے روٹوں کے لیے ملتی ہے، اس کو بھی شامل کر لیا گیا۔ واضح رہے کہ ۹۴-۱۹۹۳ء کے دوران ریلوے کو حکومت کی طرف سے خسارے کے روٹوں کے لیے ۱.۳۴۲ ارب روپے کی امداد ملی تھی لیکن ریلوے نے اپنی رپورٹوں میں اس رقم کو بالکل ظاہر نہ کیا جو اس نے وفاقی حکومت سے "سپلیمنٹری گرانٹ" کے نام پر ۴۸ کروڑ روپے حاصل کی۔ یہاں تماشہ یہ ہے کہ ریلوے نے اس گرانٹ کو استعمال نہ کیا اور حکومت کو اپنی ادائیگیوں کی مد میں ڈال لیا اور جس گرانٹ نمبر کے تحت یہ امداد حاصل کی تھی، ریلوے کے حسابات میں اسی گرانٹ نمبر کے تحت ۶۸ کروڑ روپے کا فائدہ ظاہر کر دیا گیا۔

جو بدعنوانیاں ریلوے ڈیپارٹمنٹ نے تسلیم کیں، ان کی مجموعی تعداد گزشتہ برس ۷۰ رہی اور ریلوے ڈیپارٹمنٹ کی رپورٹ کے مطابق ان واقعات میں ریلوے کو ایک ارب روپے کا نقصان پہنچایا گیا۔ ریلوے نے واپڈا سے کمرشل ریٹ پر بجلی حاصل کی اور اس کے بعد اس بجلی کو اپنے ملازمین اور دیگر افراد کو گھریلو نرخوں پر بیچ دیا، جس سے ریلوے کو ۲ کروڑ روپے کا نقصان ہوا۔ غلط رولر بیرنگ کی خریداری سے ۱۲ کروڑ روپے کا نقصان ہوا۔

ریلوے کواپریٹو سوسائٹی نے کروڑوں روپے مالیت کی ریلوے کی ملکیتی اراضی اعلیٰ افسران کی ملی بھگت سے بیچ دی۔ شاہدرہ ریلوے اسٹیشن جو لاہور کے نواح میں واقع ہے' یہاں ریلوے کی ملکیتی تین ایکڑ اراضی پر ایک مقامی ممبر قومی اسمبلی نے دکانیں اور آبادی تعمیر کرا دی اور کروڑوں روپے کما لیے۔ وھاڑی میں ۵۵۵۶ گز زمین فروخت کرنے کا ٹینڈر منظور کیا گیا۔ ریلوے انتظامیہ نے شرائط کے برعکس ٹھیکیدار کو اضافی زمین دے دی جس سے محکمہ کو ۵۵ لاکھ ۱۸ ہزار روپے کا نقصان اٹھانا پڑا۔ راولپنڈی میں ریلوے کی زمین کے ایک سودے میں محکمہ کو ۸ لاکھ ۴۷ ہزار روپے کا نقصان ہوا۔ ۱۹۹۵ء میں وزیر اعلیٰ وٹو کی کابینہ کے وزیر بلدیات سید ناظم حسین شاہ کے افسر تعلقات عامہ نایاب نقوی اور اس کے دو بھائیوں نے گلبرگ لاہور میں واقع لاہور کی ۴ سو کنال اراضی پر قبضہ کر کے ۵ مرلے کے ہزاروں پلاٹ ۵۰ ہزار روپیہ فی پلاٹ میں فروخت کر دیے۔ اس سے پہلے ریلوے کی ملکیتی اراضی واقع نثار آرٹ پریس تا سیون اپ چوک صوبہ سرحد سے آنے والے مزدوروں نے اپنی آبادی میں تبدیل کر لی اور غیر قانونی طور پر یہاں پکے مکانات کی تعمیر شروع کر دی۔ آبادی ختم کرنے کے لیے ریلوے حکام نے کارروائی شروع کی تو جماعت اسلامی کے امیر قاضی حسین احمد اپنی جنگجو تنظیم "پاسبان" کے ساتھ ریلوے حکام سے الجھ گئے اور احتجاجی جلسے جلوسوں کے ساتھ ریلوے حکام کو روک دیا۔

اس کے علاوہ پنجاب بھر میں موجود ریلوے کی تقریباً ایک لاکھ ایکڑ اراضی یا تو قبضہ گروپوں کے مکمل قبضے میں آ چکی تھی یا پھر اس پر قبضے کے لیے کوششیں جاری تھیں اور ریلوے افسران کا تعاون ان افراد کو حاصل تھا۔

Marfat.com

خالد احمد کھرل کا قبضہ گروپ

پاکستان پیپلز پارٹی کے ساتھ "سرکاری وفاداری" کی ایک طویل تاریخ کے مالک سابقہ وفاقی وزیر اطلاعات و نشریات خالد احمد خان کھرل کی کرپشن پر لکھنا بالکل ایسے تھا، جیسے آپ ایک چلتے ہوئے اخبار کو یک لخت بند کر دیں۔ سرکاری اشتہارات کی کنجی وزیر موصوف کے ازار بند سے بندھی تھی اور ساتھ ساتھ موصوف ایک بڑی "بڑھک دار" شخصیت کے بھی مالک تھے۔ میں نے وفاقی وزیر صاحب کے ایک کارنامے کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور پوری داستان لکھنے کے لیے ان کے آبائی علاقے کمالیہ گیا اور تمام ثبوت اکٹھے کر کے اپنے ایڈیٹر خالد احمد کے سامنے رکھ دیے۔ خالد احمد کچھ دیر سوچتے رہے، پھر فون پر اخبار کے مالک نجم سیٹھی سے تمام کہانی اور شواہد کا ذکر کیا اور مجھے کہانی چھاپ دینے کی اجازت دے دی۔ کہانی چھپنے کے تین دن بعد وفاقی وزرات اطلاعات و نشریات کی طرف سے ایک خط موصول ہوا جس میں اخبار کے مالک کی طرف سے سرکاری اشتہارات کی درخواست کو اس الزام کے تحت رد کر دیا گیا تھا کہ "آپ کا رسالہ ایک فحش رسالہ ہے جس کو حکومت پاکستان اپنے اشتہارات نہیں دے سکتی"۔

واقعہ یوں ہوا کہ وزیر موصوف کے ایک پرجوش صاحبزادے حیدر خان کھرل نے ۳ مئی ۹۶ء کو کمالیہ رجانہ روڈ پر واقع ۶ مربع اراضی کے پلاٹ پر قبضہ کر لیا اور برسوں سے اراضی پر قابض غریب مزاروں کی کاشت کی ہوئی بیس ایکڑ پر تیار کھڑی گندم کی فصل کاٹ کر اٹھا لی۔ ان کے مکانوں کو مسمار کر دیا اور کھیتوں میں بنی جھونپڑیوں کو آگ لگا دی۔ اس دوران اگر کسی مزارعے یا اس کے خاندان نے حملہ آوروں کو روکنے کی کوشش کی تو حملہ آوروں نے اسے مار مار کر ادھموا کر دیا۔

وفاقی وزیر کا بیٹا حیدر خاں کھرل جو اپنے ساتھ مسلح افراد کی ایک پوری فوج، ٹریکٹر،

Marfat.com

ٹرالیاں اور تھریشر لے کر آیا تھا' اس نے ساری تیار کھڑی فصل کٹوائی اور اس کو تھریشر کی مدد سے اناج اور بھوسے میں تبدیل کر کے اناج ٹرالیوں میں لادا اور جاتے ہوئے مظلوم مزارعوں پر مقامی پولیس اسٹیشن رجانہ میں زیر دفعہ ۳۲۴- ۳۸۲- ۵۰۶- ۱۴۸ اور ۱۴۹ تعزیرات پاکستان مقدمہ درج کرا دیا۔

واقعات کے مطابق ۳ مئی ۹۶ کی صبح خالد احمد کھرل کے بیٹے حیدر خان کھرل اور قریبی رشتہ دار فرحت خان کھرل' جاوید احمد خان کھرل اور محمد علی رضا وغیرہ نے ساٹھ ستر مسلح افراد اور ۲۵ پولیس ملازمین کو ساتھ لیا اور پولیس کی تین گاڑیوں' پانچ ٹریکٹروں اور ایک تھریشر کے ساتھ کمالیہ رجانہ روڈ پر موجود پولیس کے سابقہ ایس۔ پی عبیداللہ خان کی زمینوں پر حملہ آور ہوگئے۔ حملہ آوروں کے پاس جدید ترین ہتھیار بھی تھے اور جب حملہ آوروں نے پلاٹ پر تیار کھڑی گندم کی فصل کاٹنا شروع کی تو ان کے چند ساتھی ہوائی فائرنگ کرتے جاتے تاکہ کوئی مداخلت کی کوشش نہ کر سکے۔ متاثرین کا گناہ یہ تھا کہ انہوں نے گزشتہ انتخابات میں میاں نواز شریف کی حمایت کی تھی اور گزشتہ تیس برسوں میں اس اراضی پر مزارعے چلے آ رہے تھے۔ یہ حملہ آور مسلسل تین دن فصل کاٹتے رہے اور مزارعوں کے گھروں کو مسمار کرتے رہے۔ مزارعوں کے خاندان جو اس حملے کے بعد گھر بار چھوڑ کر بھاگ گئے تھے' جب تین دن کے بعد انہوں نے اپنی زمینوں پر واپس آنے کی کوشش کی تو انہیں بتایا گیا کہ اس زمین کا مالک اب خالد احمد کھرل اور اس کا خاندان ہے۔ اگلے روز تتر بتر مزارعوں کو مقامی پولیس نے گرفتار کرنا شروع کر دیا اور تھانے لے جا کر بدترین تشدد کا نشانہ بنایا۔ دو تین غریب مزارعے بھاگ کر لاہور پہنچے اور پنجاب اسمبلی کے اجلاس میں شریک اپنے ایم۔ پی اے مسعود خان گادھی سے فریاد کی لیکن اپوزیشن میں بیٹھے مسعود خان گادھی کچھ بھی نہ کر سکے۔ کیونکہ کوئی اخبار وفاقی وزیر خالد کھرل کے بارے میں کچھ چھاپنے کو تیار نہ تھا اور نہ ہی مسعود گادھی مقامی پولیس کو وفاقی وزیر کی مدد کرنے سے روک سکتے تھے۔

اس کے بعد متاثرہ خاندان عدالت عالیہ میں رٹ کے لیے لاہور چلے آئے لیکن خالد کھرل گروپ کے مسلح افراد نے انہیں لاہور پہنچ کر بھی دھمکیاں دیں کہ اگر انہوں نے عدالت میں جانے کی کوشش کی تو پھر کوئی بھی شخص زندہ واپس نہیں جا سکے گا۔ متاثرہ خاندانوں نے ماڈل ٹاؤن میں میاں نواز شریف کی رہائش گاہ کے باہر پارک میں ٹھہرنے کی کوشش کی لیکن پولیس نے انہیں وہاں سے بھگا دیا۔ بہرحال یہ خاندان مسعود گادھی ایم۔

Marfat.com

پی اے کے کہنے پر واپس کمالیہ اپنے رشتہ داروں کے پاس چلے گئے اور مزارعوں کے ایک ساتھی محمد علی نے عدالت عالیہ میں خالد کھرل کے بیٹے کے قبضے کے خلاف اور تیار فصل کاٹ کر لے جانے کے خلاف رٹ دائر کر دی۔ جو عدالتی عمل میں چلتی رہیں، لیکن نہ تو ان متاثرہ خاندانوں کو گندم واپس مل سکی اور نہ ہی ان کو ان کی مقبوضہ زمین ملی۔

اس اراضی پر خالد کھرل گروپ کے قبضے کی داستان کچھ یوں ہے کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کے ایک ایس پی پولیس عبیداللہ خان کو حکومت نے ۱۹۵۶ء میں زرعی اراضی کی آبادکاری سکیم "۲۰ سالہ ٹیوب ویل سکیم" کے تحت ٹوبہ ٹیک سنگھ کے ایک گاؤں چک نمبر ۲۷۰ گ ب میں ۱۲۴۳ کنال اور ۸ مرلہ اراضی الاٹ کی۔ مذکورہ ایس پی نے اس زمین کو آباد کرنا شروع کیا اور زمین کے کچھ حصے پر مزارعے بٹھا لیے اور انہیں کاشتکاری کے لیے زمین کو ہموار کرنے پر لگا دیا اور ساتھ ہی اجازت دے دی کہ وہ جب زمین کو قابل کاشت بنا لیں تو پھر آدھی پیداوار کے تناسب سے کاشت کاری کر لیں۔ دس سال کے بعد یہ تمام اراضی قابل کاشت ہوگئی اور اس پر کاشت کاری کا عمل شروع ہوا۔ اس دوران زمین کے الاٹی عبیداللہ خان اور مزارعوں میں معاہدہ ہوا کہ کل رقبہ کے نصف یعنی ۳ مربع اراضی پر خود عبیداللہ کاشت کاری کرے گا اور باقی رقبہ پر مزارے کاشت کاری کریں گے۔

ذوالفقار علی بھٹو دور میں کی گئی زرعی اصلاحات میں ایوب خان دور کی آبادکاری سکیم توڑ دی گئی لیکن عبیداللہ خان نے حکومت کے اس فیصلے کے خلاف عدالت سے حکم امتناعی حاصل کر لیا۔ حکم امتناعی حاصل کر لینے کے بعد زمین عبیداللہ خاں اور اس کے مزارعوں کے پاس رہی اور دونوں فریق اس پر کاشت کاری کرتے رہے۔ اس سے پہلے عبیداللہ خان ۹ ایکڑ اراضی مزارعوں کو فروخت کر چکے تھے اور مزارعوں نے رجسٹری بھی لکھوا لی تھی اور عبیداللہ خان سے اس اراضی کا قبضہ بھی حاصل کر لیا تھا لیکن محکمہ مال کے کاغذات حقداران زمین میں اس اراضی کا انتقال مزارعوں کے نام نہیں ہو سکا تھا۔ اس سودے کے فوری بعد عبیداللہ اور مزارعوں میں جھگڑا ہوگیا۔ عبیداللہ خان خریدی ہوئی زمین کے علاوہ مزروعہ زمین سے مزارعوں کو بے دخل کرنا چاہتا تھا۔ لیکن مزارعوں کا موقف تھا کہ چونکہ عبیداللہ کو زمین حکومت کی طرف سے الاٹ ہوئی ہے اور مزارعوں نے اس اراضی پر دس سال سے زائد عرصہ کاشتکاری کی ہے، اس لیے انہیں قانون کے مطابق مالکانہ حقوق دیے جائیں لیکن کوششوں کے باوجود مزارعے اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔

کچھ عرصہ بعد مزارعوں اور عبیداللہ کے درمیان صلح ہوگئی اور تین مربع اراضی پر

مزارعے کاشتکاری کرنے لگے اور باقی تین مربع عبیداللہ خان کے پاس رہی۔ عبیداللہ خان کی وفات کے بعد بھی مزارعوں اور عبیداللہ کے لواحقین کے مابین زمین کے معاملات خوش اسلوبی سے چلتے رہے۔ عبیداللہ خان نے خود کاشت کاری ترک کر دی اور زمین ٹھیکے پر دینا شروع کر دی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ خاندان بھٹو دور میں حاصل کیے گئے زمین کے حکم امتناعی کے تحت دائر دیوانی مقدمہ بھی لڑتا رہا۔ ۱۹۸۸ء میں اس خاندان نے اپنے حصہ کی تین مربع اراضی کا ٹھیکہ خالد احمد کھرل کو دے دیا جب کہ باقی نصف حصہ پر مزارعے قابض رہے۔

خالد کھرل کی طرف سے ٹھیکہ لینے کے بعد عبیداللہ خان کے بیٹے سعید اللہ اور بیٹیوں شہناز گل اور شہوار گل کو کہا گیا وہ یہ زمین فروخت کر دیں کیونکہ خالد کھرل خاندان اس اراضی پر ایک بڑی ٹیکسٹائل ملز لگانا چاہتا ہے۔ عبیداللہ کے بیٹوں کے انکار پر خالد کھرل نے پیر محل رجانہ روڈ پر ٹیکسٹائل ملز لگالی لیکن اس زمین کو حاصل کرنے کے جتن جاری رکھے۔ وفاقی وزیر حکم امتناعی کا کیس جو کمشنر فیصل آباد کی عدالت میں تھا' اسے تبدیل کرا کے کمشنر سرگودھا کے پاس لے آیا۔ چونکہ اس وقت خالد کھرل حکومت میں تھے' اس لیے انہوں نے کمشنر سرگودھا پر دباؤ بڑھایا کہ وہ کیس کا فوری فیصلہ کرے۔ کمشنر سرگودھا کے پس و پیش کے بعد خالد احمد کھرل اس مقدمہ کو کمشنر لاہور کی عدالت میں لے گئے۔ اس دوران خالد کھرل نے تمام اراضی خریدنے کی کوشش کی اور الاٹیوں کو ۸۷ لاکھ روپے کی پیش کش کی لیکن مزارعے آڑے آ گئے اور یوں زمین کا سودا نہ ہو سکا۔ اس دوران اس متنازعہ اراضی کا بیعہ نامہ کرنے کی بھی کوشش کی گئی لیکن مالکوں نے بیعہ نامہ کرنے سے انکار کر دیا۔

وفاقی وزیر خالد کھرل کی طرف سے معاملہ طے کرنے کے لیے مزارعوں کو پنچایت میں طلب کیا گیا۔ پنچایت نے فیصلہ کیا کہ اگر وفاقی وزیر زمین کے الاٹیوں سے زمین کا مختار نامہ حاصل کر کے عدالت سے مقدمہ جیت گئے تو پھر وہ صرف عبیداللہ خاندان کی زمین تین مربع اراضی اپنے پاس رکھیں گے اور مزارعے اسی طرح بدستور آدھے رقبہ پر کاشتکاری جاری رکھ سکیں گے اور جو زمین انہوں نے عبیداللہ خان سے خرید رکھی ہے' اس پر ان کا قبضہ رہے گا۔

۱۹۹۵ء میں کمشنر لاہور کی عدالت نے زمین کا فیصلہ حکومت کے بجائے عبیداللہ خاندان کے حق میں کر دیا۔ خالد کھرل کے دباؤ پر حکومت نے عدالت کے فیصلے کے خلاف

Marfat.com

کوئی اپیل نہ کی اور نہ ہی مزارعوں کی طرف سے فریق بننے کے لیے دی جانے والی درخواستوں کی شنوائی ہونے دی۔ جب عدالتی فیصلہ کے خلاف اپیل کرنے کی مدت گزر گئی تو خالد کھرل نے زمین کی ملکیت کا حتمی فیصلہ کرنے کے لیے مزارعوں کو طلب کر لیا۔

اس دوران خالد کھرل نے زمین کی ملکیت کے کاغذات الاٹیوں کے نام مکمل کرا لیے اور ساری زمین کا انتقال اپنے بیٹے حیدر خان کھرل کے نام کرانے کی کوشش کی۔ چونکہ عبیداللہ کی ایک بیٹی وفات پا چکی تھی' اس لیے مزارعوں نے ڈپٹی کمشنر کو درخواست دے دی کہ پہلے اس زمین کا انتقال اصل مالکوں کے نام ہو اور جو زمین مزارعے اصل مالکوں سے خرید چکے ہیں' اس کو مزارعوں کے نام منتقل کیا جائے اور اس کے علاوہ مزارعوں نے آباد کاری سکیم کی زمین کی ملکیت حاصل کرنے کے لیے جو درخواستیں دے رکھی تھیں' ان کے حتمی فیصلہ کا انتظار کیا جائے۔ یا پھر ان کو بھی ایک حصہ پر مالک تصور کیا جائے۔ کیونکہ اس زمین کو آباد کرنے میں انہوں نے ۳۰ برس تک محنت کی ہے۔ اس لیے پنچایت میں مزید فیصلہ نہ ہو سکا۔ اس کے بعد خالد کھرل کے بیٹے حیدر خان کھرل نے مقامی ڈی ایس پی پولیس کو ساتھ لیا اور مذکورہ اراضی کے پٹواری کو گھر سے اٹھا لیا اور اس کے پاس موجود مزارعوں کی خرید کردہ اراضی کے گرداوریوں والا رجسٹر بھی چھین لیا۔ اس رجسٹر کے چھن جانے سے مزارعوں کے پاس زمین کی خریداری کا کوئی ٹھوس ثبوت نہ رہا۔ صرف وہ فوٹو کاپیاں رہیں' جو انہوں نے رجسٹر کے مختلف صفحات کی بطور ثبوت کروا رکھی تھیں۔ زمین کے اصل مالک وفاقی وزیر کے آگے بے بس ہوگئے اور انہوں نے اپنی رہائش لاہور منتقل کر لی اور زمین سے ایک حد تک لاتعلقی اختیار کر لی۔ ظاہر ہے اس کے پیچھے وفاقی وزیر کی طاقت کا خوف تھا۔

اس کے بعد خالد کھرل کے بیٹے نے سینکڑوں مسلح افراد کو ساتھ لیا اور غریب مزارعوں کی بستی پر ہلہ بول دیا۔ مزارعے بھاگ گئے۔ حملہ آوروں نے عورتوں اور بچوں کو تشدد کا نشانہ بنایا۔ گھروں کو تباہ کر دیا اور ۲۰ ایکڑ پر کھڑی گندم کی فصل کاٹ لی۔ مزارعے جان کے خوف سے بھاگ گئے اور مالکان بھی روپوش ہوگئے۔ پولیس اور مقامی عدالتیں بالکل خاموش ہوگئیں اور ساری زمین خالد احمد کھرل کی ملکیت میں چلی گئی۔ نہ تو اصل مالک اور زبان کھولنے کو تیار ہوئے اور نہ ہی مزارعوں میں اتنی جرات تھی کہ وہ خالد کھرل سے ٹکر لے سکیں۔

Marfat.com

”سوشل ایکشن بورڈز“ اربوں کے گھپلے اور ہمارے سیاست دان

۸۸ء میں برسر اقتدار آنے کے بعد پیپلز پارٹی کی حکومت نے ”عوامی نمائندوں“ کے ذریعے ”عوامی فلاح“ کا نعرہ لگایا اور ایک طویل مارشل لاء کے بعد جمہوریت کی واپسی کے عوض پاکستان کو ملنے والی غیر ملکی امداد کے بہتر ”مصرف“ کے لیے صنعت و حرفت کے شعبہ کو نظر انداز کر دیا۔ اس کی جگہ ”عوامی نمائندوں“ کے ذریعے ”عوامی فلاح“ کا جو بڑا پراجیکٹ ترتیب دیا گیا' وہ صحت عامہ' تعلیم' سڑکوں' بجلی' پانی اور گیس کی فراہمی اور ملک کے دیگر پسماندہ علاقوں کے لیے ترقیاتی پروگراموں پر مشتمل تھا۔ بے نظیر حکومت نے اس پراجیکٹ کو ”پیپلز ورکس پروگرام“ کا نام دیا اور ایک ارب روپے کی خطیر رقم سے ان ”منصوبوں“ کا کام شروع کر دیا۔ وفاقی کابینہ نے فیصلہ کیا کہ فی رکن قومی اسمبلی ۷۵ لاکھ روپے اور رکن صوبائی اسمبلی ۵۰ لاکھ روپے ”ترقیاتی فنڈز“ کے طور پر تقسیم کیے جائیں گے اور یہ رقم ارکان قومی و صوبائی اسمبلی اپنے اپنے حلقوں میں ترقیاتی منصوبوں پر صرف کریں گے۔ حکومت دو سال چل سکی لیکن اس دوران ”پیپلز ورکس پروگرام“ کے تحت حاصل ہونے والی اربوں روپے کی رقوم منتخب ارکان اسمبلی اور اراکین سینٹ کھا گئے اور تخمینے کے مطابق صرف ۱۲ فیصد تک ترقیاتی کام ہو سکا جب کہ حکومت کا ہدف ۸۸ فیصد تک ادھورا رہ گیا۔ اگرچہ بعد میں برطرف حکومت نے اس ناکامی یا اس ناقص کارکردگی کو حکومت برطرف کرنے والوں کے ذمے ڈال دیا اور اپنے اراکین کی بدعنوانیوں کا صحیح اندازہ نہ کر سکی۔

۹۰ء میں معروف صنعت کار میاں نواز شریف نے حکومت سنبھالی اور ”پیپلز ورکس پروگرام“ کی جگہ ”تعمیر وطن پروگرام“ شروع کیا اور انتخابی گرانٹ اراکین کے لیے منظور

Marfat.com

کی، جتنی ان سے پہلی حکومت نے کی تھی۔ یہ حکومت تین سال چلی اور "تعمیر وطن پروگرام" کے تحت ملنے والی رقوم میں سے تین ارب روپے کی خطیر رقم اراکین قومی و صوبائی اسمبلی ہڑپ کر گئے۔ واضح رہے کہ گزشتہ دونوں حکومتوں نے پیپلز ورکس پروگرام اور تعمیر وطن پروگرام کے لیے صرف رقوم مہیا کیں، علیحدہ سے کوئی ڈپارٹمنٹ نہ بنایا اور نہ ہی باقاعدہ افراد کو بھرتی کر کے کوئی شعبہ قائم کیا گیا جو صرف ترقیاتی فنڈز مہیا کرتا اور ترقیاتی کاموں کا جائزہ لیتا۔

۹۳ء میں دوبارہ بے نظیر حکومت قائم ہوئی تو اس بار "ترقیاتی فنڈز" کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی کی گئی اور حکومت کے بہت ابتدائی اقدامات میں یہ بھی شامل تھا کہ اس نے ۶ دسمبر ۹۳ء کو وفاقی کابینہ کے اجلاس میں فیصلہ کیا کہ فوری طور پر ایک ارب ۱۰ کروڑ روپے سے ۸۸ء کا ترقیاتی پروگرام "پیپلز ورکس پروگرام" شروع کیا جائے۔ وفاقی کابینہ نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ اس بار ہر رکن قومی اسمبلی کو "ترقیاتی فنڈز" کے علاوہ ۵۰ لاکھ روپے فی کس کے حساب سے "خصوصی گرانٹ" بھی مہیا کی جائے گی۔ اس فیصلے کے چند دن بعد حکومت نے "پیپلز ورکس پروگرام" کا نام بدل کر "سوشل ایکشن پروگرام" رکھ دیا اور ساتھ ہی فیصلہ کیا کہ اس پروگرام کو چلانے کے لیے ضلعی سطح پر ایک "سوشل ایکشن بورڈ" بھی قائم کیا جائے جو ترقیاتی پروگرام کے سلسلے میں معاونت کا کردار ادا کرے۔

وفاقی حکومت نے ایک اور فیصلہ کیا کہ اپنے اراکین قومی اسمبلی اور اتحادی جماعتوں کے ارکان کو طویل عرصے تک "مطمئن" رکھنے کے لیے اور اس تاثر سے بچانے کے لیے کہ حکومت میں ان کا کوئی حصہ نہیں "سوشل ایکشن بورڈز" میں انہیں شامل کیا جائے۔ پیپلز پارٹی کی حکومت نے خصوصی طور پر اپنے ان اراکین قومی اسمبلی کو "سوشل ایکشن بورڈز" کے چیئرمین کے لیے چنا جو وزارتوں اور دیگر مراعات سے محروم تھے۔ پنجاب کے ۳۴ اضلاع میں سے دو اضلاع کے چیئرمین مسلم لیگ (ج) کے بنائے گئے جب کہ دو اضلاع میں ایسے آزاد ارکان قومی اسمبلی کو چیئرمین بنایا گیا جو حکومت کے اتحادی تھے۔ سیالکوٹ میں مسلم لیگ (ج) کے چودھری اختر علی وریو کو چیئرمین شپ ملی جب کہ مسلم لیگ (ج) ہی کے سردار طالب حسین نکئی کو ضلع قصور کا سوشل ایکشن بورڈ چیئرمین بنایا گیا۔ ان کے علاوہ بھکر سے آزاد رکن قومی اسمبلی رشید اکبر نوانی اور میانوالی سے عبیداللہ کو چیئرمین سوشل ایکشن بورڈ بنایا گیا۔ جب کہ باقی ماندہ ۲۹ اضلاع میں پی پی پی کے ارکان قومی اسمبلی اور الیکشن ہار جانے والے سیاسی کارکنوں کو "سوشل ایکشن بورڈز" کا چیئرمین بنایا

گیا۔

بہت ابتدائی اقدام کے طور پر تمام چیئرمینوں کو لینڈ کروزر گاڑیاں دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ دو ہفتوں بعد "سوشل ایکشن بورڈز" پنجاب کے تمام چیئرمینوں کو وفاقی حکومت نے ۶ کروڑ ۶۰ لاکھ روپے مالیت کی قیمتی اور جدید ترین گاڑیاں مہیا کر دیں۔ سوشل ایکشن بورڈز کے ۳۳ چیئرمین ہر سال وفاقی حکومت سے گاڑیوں کے تیل کے لیے ۲۳ لاکھ ۷۶ ہزار روپیہ وصول کرتے رہے اور اس طرح وفاقی حکومت نے اپنی تین سالہ مدت میں "سوشل ایکشن بورڈ" کے چیئرمینوں کو کل ۷۱ لاکھ ۲۸ ہزار روپیہ صرف تیل کی مد میں مہیا کیا۔ ان چیئرمینوں نے گاڑیوں کی مرمت کے لیے بھی وفاقی حکومت سے ڈیڑھ کروڑ روپیہ حاصل کیا اور جب تین برسوں کے بعد حکومت ختم کی گئی تو مذکورہ چیئرمین ۱۴ قیمتی گاڑیاں بالکل ناکارہ بنا چکے تھے---- وفاقی حکومت نے "سوشل ایکشن بورڈز" کے لیے قیمتی دفاتر کرایہ پر لے کر دیے۔ حکومت نے تین برسوں میں سوشل ایکشن بورڈ کے دفاتر کے لیے ایک کروڑ ۴۴ لاکھ روپیہ کرایہ ادا کیا جب کہ پنجاب میں ان دفاتر کی تزئین و آرائش اور فرنیچر کے لیے ۲۰ لاکھ ۸۰ ہزار روپے کی رقم خرچ ہوئی۔ اس میں لاکھوں روپے کی وہ رقم شامل نہیں جو ان دفاتر کے ٹیلی فون کے بلوں کی صورت میں وفاقی حکومت نے ادا کی۔ پنجاب میں خصوصی طور پر تمام ارکان قومی اسمبلی اور سینیٹرز کو یہ خصوصی اختیار دیا گیا کہ وہ دیگر ترقیاتی فنڈز کے علاوہ ۲۵ لاکھ روپیہ فی کس "سوشل ایکشن بورڈز" کے ذریعے اپنے علاقوں کی ترقی پر صرف کرنے کے مجاز ہیں۔

چونکہ مرکز میں لوکل گورنمنٹ کا باقاعدہ وزیر نہیں بنایا گیا تھا اس لیے دیہی ترقی کے تمام منصوبے وزیراعظم بے نظیر بھٹو کی پولیٹیکل سیکرٹری مس ناہید خان کی دسترس میں تھے۔ اس لیے ان تمام منصوبوں میں سے سب سے زیادہ فوائد محترمہ ناہید خان نے کشید کیے اور پنجاب میں انہوں نے جو "سبیل" لگائی اس میں پی پی پی کے صوبائی صدر اور پنجاب کے سینئر وزیر ملک مشتاق اعوان کو شامل کر لیا اور جب پنجاب سے ہونے والی "کمائی" بہت زیادہ بڑھ گئی تو پھر دونوں نے مل کر نیویارک کے ایک مہنگے ترین علاقہ میں ہوٹل بنا لیا۔ "سوشل ایکشن بورڈز" کے لیے ایک ایک پراجیکٹ ڈائریکٹر کی آسامی پیدا کی گئی۔ پنجاب میں پراجیکٹ ڈائریکٹر کی ۳۳ آسامیاں مس ناہید خان اور مسٹر مشتاق اعوان کی وساطت سے پر ہوئیں اور دونوں نے ان آسامیوں سے تقریباً ایک کروڑ روپیہ کمایا اور نااہل لوگوں کو پراجیکٹ ڈائریکٹر بھرتی کر لیا۔

Marfat.com

۱۹۹۴ء کا پہلا سال وفاقی حکومت کی طرف سے مہیا کی گئی اڑھائی ارب روپے کی رقم سے شروع ہوا اور پنجاب کے تمام اضلاع میں نواز شریف حکومت کی طرف سے مکمل کیے گئے ترقیاتی منصوبوں پر سے "تعمیر وطن پروگرام" کی تختیاں اور بورڈ اکھاڑ کر وہاں "سوشل ایکشن پروگرام" کے ترنگے بورڈ نصب کیے گئے اور پاکستان ٹیلی ویژن اپنے پروگرام "رفتار" میں ان کارناموں کو وفاقی حکومت کی انقلابی کارروائیوں کے طور پر ٹیلی کاسٹ کرنے لگا۔ ایک اندازے کے مطابق ۹۴ء میں حکومت کے مقرر کیے گئے ہدف میں سے صرف ۲۰ فیصد کام ہو سکا اور باقی رقوم قابل احترام ارکان پارلیمنٹ کھا گئے۔ ذرائع کے مطابق اس برس بھی تقریباً ایک ارب روپیہ بدعنوانیوں کی نذر ہوا۔ تمام چیئرمینوں نے ترقیاتی کاموں کا آغاز اپنے اپنے گھروں اور ڈیروں سے کیا اور بجلی و گیس کی فراہمی کے ساتھ ساتھ پختہ سڑکیں اور ٹیلی فون کنکشنز حاصل کر لیے۔

۹۵ء کے سال میں ۹۴ء والا تسلسل جاری رہا اور اپوزیشن ارکان پارلیمنٹ کو اس ترقیاتی پروگرام کے تحت ایک پیسہ بھی نہ دیا گیا۔

۹۵ء میں وفاقی حکومت نے اپنی گرتی ہوئی مقبولیت کے گراف کو بلند کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ "ترقیاتی کاموں" کا نعرہ لگایا اور مختلف کاموں کے لیے "پیکج" بنانا شروع کیے اور زیادہ سے زیادہ رقوم ترقیاتی فنڈز کے لیے مخصوص کی گئیں۔ اکتوبر ۹۵ء میں یہ سلسلہ زور پکڑ گیا اور حکومت نے "ترقیاتی پیکج" پیش کرنا شروع کر دیے۔ سب سے پہلے لسانی و سیاسی کشیدگی کے شکار شہر کراچی کے لیے "کراچی پیکج" کے نام سے ۶۲ ارب روپے کا منصوبہ پیش کیا گیا اور ساتھ ہی تمام صوبوں کے لیے ترقیاتی فنڈز کا اعلان کر دیا گیا لیکن ان فنڈز کے استعمال کے لیے کوئی طریقہ کار وضع نہ کیا گیا۔

اس موقع پر وفاقی حکومت نے سندھ کو دیگر صوبوں پر فوقیت دی۔ مجموعی طور پر سندھ کو ترقیاتی منصوبوں کے لیے ۷ ارب ۷ کروڑ ۵۷ لاکھ روپے فراہم کیے گئے۔ پنجاب کے حصے میں ۴ ارب ۳ کروڑ روپے کی رقم آئی۔ بلوچستان کو ایک ارب ۲ کروڑ روپے ملے جب کہ سرحد کو ایک ارب ۹۶ کروڑ روپے ترقیاتی منصوبوں کے لیے دیے گئے۔

اکتوبر ۹۵ء کے اس فیصلے میں خصوصی حکم دیا گیا کہ صوبوں کی ترقی کے لیے جو فنڈز دیے جائیں گے، وہ تمام منتخب نمائندوں کے ذریعے خرچ ہوں گے اور حکومت کا شروع کردہ ترقیاتی پراجیکٹ "سوشل ایکشن پروگرام" اس سلسلہ میں منصوبہ بندی کرے گا اور ہر ضلع کا سوشل ایکشن بورڈ ترقیاتی فنڈز کی تقسیم کا خود فیصلہ کرے گا۔ یہ نیا فنڈ بھی سوشل

Marfat.com

ایکشن بورڈز کے ذریعے استعمال ہوا اور برسراقتدار پی۔ ڈی۔ ایف کے ارکان اسمبلی نے کروڑوں روپیہ کما لیا۔

شروع میں وفاقی حکومت کی کوشش تھی کہ "سوشل ایکشن بورڈز" میں شامل افراد اور منتخب ارکان اسمبلی براہ راست فنڈز حاصل نہ کر سکیں کیونکہ اس صورت میں پوری رقم اور منصوبہ بدعنوانی کی نذر ہو جانے کا خدشہ تھا۔ اس لیے ایک "ترقیاتی سکیم" شروع ہونے سے پہلے "سوشل ایکشن بورڈ" اس کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس کے بعد ترقیاتی اداروں کے سربراہ اس سکیم کا تکنیکی جائزہ لینے کے مجاز تھے۔ اس جائزے کے بعد منظوری کی صورت میں وزارت خزانہ ٹھیکیدار یا تعمیراتی ادارے کو فنڈز مہیا کرتی۔

بظاہر یہ طریقہ کار رشوت اور بدعنوانی سے کسی حد تک محفوظ معلوم ہوتا ہے لیکن ایسا قطعاً نہیں ہو سکا اور ارکان اسمبلی اور سینیٹرز حضرات نے سوشل ایکشن بورڈز کے ممبران اور ترقیاتی اداروں کے سربراہوں سے مل کر ترقیاتی منصوبوں کی منظوری حاصل کرنے کے بعد وزارت خزانہ سے فنڈز نکلوا لیے۔ اور برائے نام "کام" شروع کروا کے حکومت کے سپانسر کردہ ٹی وی پروگرام "رفتار" کے لیے کام کے افتتاح کی ریکارڈنگ کرا لی اور ٹھیکیداروں سے اپنا حصہ وصول کر لیا۔ اگرچہ حکومت نے پروگرام کا اعلان کرتے وقت یہ اعلان بھی کیا تھا کہ ان فنڈز سے تمام ارکان اسمبلی کو حصہ دیا جائے گا کہ وہ اپنے حلقوں میں ترقیاتی کام کرا سکیں لیکن کسی بھی اپوزیشن رکن کو ایک پیسہ بھی نہ دیا گیا۔

"سوشل ایکشن بورڈز" کے ذریعے رقم ہونے والی بدعنوانیوں کی داستان اپنی مثال نہیں رکھتی۔ اگرچہ "تعمیر وطن پروگرام" میں بھی ایک اندازے کے مطابق ۳ ارب روپے مسلم لیگ اور دیگر اتحادی جماعتوں کے ارکان اسمبلی ڈکار گئے تھے لیکن "سوشل ایکشن پروگرام" نے ارکان اسمبلی کو دولت سمیٹنے کا نادر موقع تین برس تک مہیا کیے رکھا۔

۹۴ء میں "سوشل ایکشن پروگرام" کے تحت تقسیم کی جانے والی ۵۰ کروڑ روپے کی سائیکلیں اور سلائی مشینیں ایم۔ این۔ اے حضرات کے ڈیروں اور گھروں پر پڑی رہیں اور جو اشیاء تقسیم کی گئیں، وہ صرف ٹی وی فلم بنانے کے لیے تقسیم ہوئیں اور ان افراد کو دی گئیں، جو یا تو ایم۔ این۔ اے حضرات کے خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے، یا پھر ان کے مزارعے اور دیگر ملازمین تھے۔ صرف ایک رکن اسمبلی مسٹر جے۔ سالک کے بارے میں یہ انکشاف سامنے آیا کہ انہوں نے ملک بھر میں پھیلے ہوئے اپنے غریب ووٹروں میں خود اپنی موجودگی میں قرعہ اندازی کے ذریعے یہ سامان تقسیم کیا اور ایک پائی کی بدعنوانی نہیں کی۔

Marfat.com

ان تین برسوں میں اراکین قومی اسمبلی نے جس طرح "سوشل ایکشن بورڈز" کے تحت "سوشل ایکشن پروگرام" کے فنڈز کو استعمال کیا' اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اگرچہ "تعمیر وطن پروگرام" بھی تین ارب روپے کی بدعنوانیوں کا باعث بنا لیکن اس بار برسراقتدار پی۔ ڈی۔ ایف کے ارکان نے اودھم مچا دیا۔

پنجاب میں "سوشل ایکشن پروگرام" کے زیر اہتمام ہونے والی بدعنوانیوں میں گوجرانوالہ ڈویژن سرفہرست رہا۔ اس ڈویژن کے ضلع سیالکوٹ میں پہلے تو مسلم لیگ (ج) کے رکن قومی اسمبلی چودھری اختر علی وریو کو "سوشل ایکشن بورڈ" کا چیئرمین بنایا گیا لیکن بعد میں پی پی پی سیالکوٹ کے احتجاج پر سیالکوٹ "سوشل ایکشن بورڈ" کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا اور سیالکوٹ شہر میں "سوشل ایکشن بورڈ" کا چیئرمین پیپلز پارٹی کے ایک مقامی رہنما اور سابق ممبر صوبائی اسمبلی میجر محمد یوسف خلجی کو بنا دیا گیا جب کہ دیہاتی علاقوں کے لیے "سوشل ایکشن بورڈ" کا چیئرمین چودھری اختر علی کو برقرار رکھا گیا۔ چودھری اختر علی وریو اور میجر یوسف خلجی نے مبینہ طور پر ۴۰ کروڑ روپے کی رقم اکٹھی کی اور ضلع میں "تعمیر وطن پروگرام" کے تحت مکمل ہوئے ترقیاتی منصوبوں کی تختیاں اتار کر "سوشل ایکشن پروگرام" کی تختیاں نصب کر دی گئیں۔ یہ رقوم غلط ٹھیکوں اور کمیشن کے سلسلے میں اکٹھی کی گئیں۔

دوسری بڑی واردات گجرات کے "سوشل ایکشن بورڈ" میں ہوئی' جہاں پیپلز پارٹی کے ممبر قومی اسمبلی نوابزادہ غضنفر علی گل جو چیئرمین سوشل ایکشن بورڈ تھے' انہوں نے ۱۵ کروڑ روپے کمیشن اور دیگر بدعنوانیوں سے حاصل کر لیے۔ قصور سوشل ایکشن بورڈ کے چیئرمین اور پنجاب کے وزیراعلیٰ سردار عارف نکئی کے داماد ممبر قومی اسمبلی سردار طالب حسن نکئی نے بھی ۱۵ کروڑ روپے حاصل کیے اور علاقے کے تمام ترقیاتی کام صرف اپنے آبائی گاؤں واں آدھن اور اپنی جاگیروں کو لگنے والے دیہات میں کرائے۔ گوجرانوالہ سوشل ایکشن بورڈ کے چیئرمین چودھری محمد اشرف وڑائچ (قتل ہو چکے ہیں) نے بھی ۱۵ کروڑ حاصل کر لیے۔ لاہور "سوشل ایکشن بورڈ" کے چیئرمین خالد جاوید گھرکی پر بھی ۱۵ کروڑ کمانے کا الزام ہے جو انہوں نے کمیشن کے ذریعے حاصل کیے۔ سوشل ایکشن بورڈز کے ذریعے ۱۰ کروڑ روپیہ فی کس کمانے والوں میں راولپنڈی کے غلام سرور خان' جہلم کے چودھری محمد ثقلین' چکوال کے غلام عباس' سرگودھا کے لیاقت حیات بدرانہ' احسان الحق پراچہ' شیخوپورہ کے ملک مشتاق اعوان اور اوکاڑہ سوشل ایکشن بورڈ کے چیئرمین راؤ سکندر

Marfat.com

اقبال شامل ہیں۔

۷ سے ۹ کروڑ روپیہ فی کس کمانے والوں کی فہرست میں ڈیرہ غازی خان کے خواجہ کمال الدین' مظفر گڑھ کے غلام عربی کھر' لیہ کے نیاز احمد جھکڑ' بہاولپور کے ریاض حسین پیرزادہ' بہاولنگر کے اکبر مظہر وینس' رحیم یار خان کے مخدوم احمد عالم' نارووال کے ملک شاہ دین' ملتان کے ممتاز احمد نون شامل ہیں جب کہ ۵ سے ۷ کروڑ روپے فی کس کمانے والوں میں فیصل آباد کے بدر الدین چودھری' ٹوبہ ٹیک سنگھ کے چودھری محمد اشفاق اور جھنگ کے صاحبزادہ نذیر سلطان وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

ایک محتاط اندازے کے مطابق سوشل ایکشن پروگرام کے تحت تکمیل کو پہنچنے والے تقریباً ۲۰ فیصد کام "تعمیر وطن پروگرام" کے تحت مکمل تھے اور صرف ان پر نصب تختیاں اور بورڈ اتارے گئے اور نئے بورڈ لگائے گئے۔ چونکہ اس ترقیاتی پروگرام میں صدر فاروق احمد لغاری کے قریبی رشتہ دار بھی پوری طرح شامل تھے اور ان لوگوں نے بھی کروڑوں روپے کمائے۔ اس لیے جب وفاقی نگران کابینہ کی طرف سے "سوشل ایکشن بورڈز" کے چیئرمینوں کو برطرف کر کے سارا ریکارڈ سیل کیا گیا اور جھنگ کی بیگم عابدہ حسین کی زیر نگرانی ایک کمیٹی بنائی گئی تو یہ کمیٹی صرف آئندہ کے منصوبوں کی پلاننگ کے لیے تھی۔ اس کے ذریعے ماضی کی بدعنوانیوں کی تحقیقات کا کام نہ لیا گیا اور اس کی بڑی وجہ صدر کے قریبی عزیز تھے۔

Marfat.com

سابق گورنر میاں اظہر نے زرعی فارم کیسے بنایا؟

پاکستان مسلم لیگ (نواز گروپ) کے مرکزی لیڈر، لاہور کے سابقہ لارڈ میئر اور صوبہ پنجاب کے درویش اور "مسٹر کلین" گورنر میاں محمد اظہر کی ایمانداری اور دیانت کی داستانیں اگرچہ ہمارے اردو اخبارات کی ہمیشہ زینت بنتی رہی ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ میاں محمد اظہر ایک شریف سیاست دان اور بہترین انتظامی صلاحیت کے مالک واقع ہوئے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس امر سے بھی آنکھیں نہیں پھیری جا سکتیں کہ انہوں نے ملکی سیاست اور خصوصاً مقتدر سیاست میں شامل "روایتوں" کو اگر مکمل طور پر نہیں تو کسی حد تک ضرور اپنایا اور اس دور کے سیاست دانوں کے مرغوب شغل یعنی زمینوں کے حصول اور ان زمینوں کو زرخیز بنانے کے لیے حکومتی مشینری کے بے دریغ استعمال سے گریز نہ کیا۔ میں اپنے جریدہ کے لیے اس مشن پر تھا کہ موجودہ و سابقہ مقتدر سیاست دانوں کی زمینوں کے بارے میں لکھوں جو انہوں نے اپنے دور اقتدار میں بنائیں اور اس مشن میں حمید گل کی زمینوں کی دریافت کے بعد اگرچہ میں کچھ زیادہ پر امید نہیں تھا لیکن ایک دن اچانک مجھے میاں محمد اظہر کے ایک عالیشان زرعی فارم کے بارے میں پتہ چلا جو انہوں نے بڑی رازداری کے ساتھ لاہور کے ایک نواحی علاقے میں بنایا تھا۔

لاہور سے جی ٹی روڈ کے ذریعے گوجرانوالہ کی طرف سفر کریں تو شاہدرہ سے کچھ دور امامیہ کالونی نام کی ایک بستی آباد ہے۔ اس بستی کے سٹاپ کے بالکل سامنے سابقہ وزیراعظم میاں نواز شریف کی فیکٹری "اتفاق فونڈریز" واقع ہے اور اسی اتفاق فونڈریز کی بغل میں سے ایک خستہ حال سڑک نارنگ منڈی کو جاتی ہے۔ میاں محمد اظہر کا وسیع و عریض زرعی فارم اور سابقہ وفاقی وزیر اور گورنر ملک غلام مصطفیٰ کھر کا فارم اسی سڑک پر واقع ہے۔

Marfat.com

میاں محمد اظہر اور ان کے خاندان کی ملکیتی اراضی تقریباً ۲۰۰ ایکڑ کالا خطائی روڈ (ضلع شیخوپورہ) پر واقع ایک گاؤں بابکوال اور ایک چھوٹے سے گاؤں دھپ سڑی میں واقع ہے۔ یہ اراضی جو ۶۶-۱۹۶۵ء میں خریدی گئی، محکمہ مال کے مقامی تحصیل دار، اور پٹواری حضرات کی طرف سے اشتمال اور چک بندی کے مواقع پر کی گئی مستقل درجہ بندی کے لحاظ سے زرعی اراضی کے سب سے آخری درجہ "بنجر قدیم ناممکن" کے زمرے میں آتی ہے۔ واضح رہے کہ چک بندی اور اشتمال وغیرہ کے مواقع پر زمین کو اس کی زرخیزی کے اعتبار سے مختلف درجوں میں تقسیم کیا جاتا ہے اور عموماً قابل کاشت اراضی کے لیے اول، دوم اور سوم کے درجے رکھے جاتے ہیں۔ جو زمین کسی حد تک بنجرپن کا شکار ہو لیکن اس کے زرخیز یا قابل کاشت بنائے جانے کے امکانات ہوں تو اس کو زرعی زمین کا چوتھا درجہ یعنی "بنجر جدید ممکن" دیا جاتا ہے۔ پھر اس کے بعد کا درجہ "بنجر قدیم" کا آتا ہے اور سب سے آخر میں ایسی زمین کو رکھا جاتا ہے، جس کے کبھی بھی قابل کاشت ہونے کا امکان نہ ہو۔ اس زمین کو "بنجر قدیم ناممکن" کا درجہ دیا جاتا ہے۔ میاں محمد اظہر نے ۶۶-۱۹۶۵ء میں جو اراضی بہت ہی معمولی داموں خریدی، اس کا درجہ بھی چونکہ "بنجر قدیم ناممکن" تھا اور اس پر دس سے بارہ فٹ کے ٹیلے ا. ر دو سے تین فٹ تک سیم و تھور اور کلر کی تہہ تھی۔

میاں اظہر کی زمینوں کے پٹواری محمد بشیر کے بقول یہ اراضی چونکہ بالکل ناکارہ تھی اور سوائے کسی صنعتی یونٹ کی تنصیب کے لیے اس کو خریدا نہیں جا سکتا تھا لہٰذا میاں محمد اظہر نے یہ اراضی اس کے دیہاتی مالکوں سے ۲ ہزار روپے فی ایکڑ کے حساب سے خریدی اور اس اراضی کی ملکیت کے خانہ میں میاں محمد اظہر اور ان کے بھائی میاں محمد اشرف کے علاوہ خاندان کے دیگر افراد کے نام درج ہیں۔

اس کہانی میں جو بات حیران کن ہے اور اس نے میری توجہ اپنی طرف کھینچی، وہ اس زمین کا انتہائی زرخیز ہونا ہے۔ یہ علاقہ میں سب سے زیادہ فی ایکڑ پیداوار دیتی ہے اور یہاں صوبے کی سب سے بہترین مچھلی اور گندم پیدا ہوتی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے یہ اراضی جو "بنجر قدیم ناممکن" کی فضول درجہ بندی میں تھی، اب زرخیز زمین ہے اور اس کے تقریباً ۱۵ ایکڑ حصہ پر جدید ترین نوعیت کے مچھلی فارم ہیں۔ اس زمین کی حالت بدلنے کا آغاز ۱۹۸۸ء سے ہوتا ہے۔

میاں محمد اظہر ۲۱ جنوری ۱۹۸۸ء میں لاہور میٹرو پولیٹن کارپوریشن کے لارڈ میئر منتخب ہوئے اور انہوں نے یہ منصب سنبھالتے ہی ضلع شیخوپورہ میں کالاخطائی روڈ پر واقع

Marfat.com

اپنی اس بنجر اراضی کو قابل کاشت بنانے کا ارادہ کیا۔ اس سلسلہ کی پہلی کارروائی انہوں نے اس طرح کی کہ کارپوریشن کے دو ملازموں میاں منظور اور محمد اسلم عرف اسلو کو مشن سونپا کہ وہ لاہور شہر اور میونسپلٹی کی حدود میں موجود کوڑا کرکٹ اور خصوصاً گوبر ملی مٹی میٹرو پولیٹن کارپوریشن کے ۹۰ ٹرکوں پر لاد کر بابکوال اور دھپ سڑی (لاہور سے تقریباً ۳۰ کلومیٹر شمال کی طرف) میں ان کی ملکیتی بنجر اراضی پر پہنچائیں۔ اس کے ساتھ ہی میاں محمد اظہر نے بلدیہ کے ٹرکوں کو ملنے والے تیل ۳۵ لٹر یومیہ کو بڑھا کر ۴۵ لٹر یومیہ کر دیا۔

تیل محض اس لیے بڑھایا گیا کہ یہ ٹرک لاہور سے ۳۰ کلومیٹر دور ان کی اراضی تک جا سکیں۔ اس طرح کارپوریشن کے ٹرکوں کو یومیہ ملنے والا تیل ۳۱۵۰ لٹر سے بڑھ کر ۴۰۵۰ لٹر ہو گیا اور کارپوریشن کے ٹرک گوبر ملی مٹی اور کوڑا میاں اظہر کے زرعی فارم تک پہنچانے لگے۔ میاں اظہر نے دونوں ملازمین منظور اور محمد اسلم کو مستقل فارم پر تعینات کر دیا اور ٹرک ڈرائیوروں کا حاضری رجسٹر بھی بابکوال منتقل کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی تمام ٹرک ڈرائیوروں کو ہدایت کی گئی کہ وہ روزانہ دو پھیرے میاں اظہر کے فارم پر لگائیں اور کوڑا وہاں موجود منشی کی ہدایت پر بنجر زمین کے ایک کونے میں لگاتے جائیں تاکہ صفائی کے بعد اس کوڑے کو زمین پر تہہ در تہہ پھیلایا جا سکے۔

مسلسل سات ماہ تک کارپوریشن کے یہ ۹۰ ٹرک معمول سے ۹۰۰ لٹر زیادہ تیل یومیہ خرچ کر کے لاہور شہر کا کوڑا اور گوبر بابکوال پہنچاتے رہے اور لاہور کارپوریشن کے تقریباً ایک ارب روپے کے بجٹ میں کوڑا کرکٹ ضائع کرنے کے لیے مختص کی گئی کروڑوں روپے کی رقم ذمہ دار افراد آپس میں بانٹتے رہے۔

اس کے ساتھ ہی ناہموار زمین کو ہموار کرنے اور کلر اور سیم کی تین تین فٹ تہہ کو اٹھانے کے لیے لاہور کارپوریشن کے بلڈوزر، ڈیمپر اور بلیڈز والے بڑے ٹریکٹر بھی بابکوال روانہ کر دیے گئے۔ اس ساری مشینری کے لیے روزانہ تیل کی ایک بڑی مقدار کارپوریشن کے پٹرول پمپ سے بابکوال لے جائی جاتی اور پمپ انچارج محمد اشرف بٹ کسی نہ کسی طرح تیل کی اس فراہمی کو جاری رکھتا۔ یوں فارم کی زمین کی شکل و صورت تبدیل ہوتی رہی۔ جب کہ اس دوران تیل نہ ملنے کے باعث کارپوریشن کی درجنوں گاڑیاں گراؤنڈ کر دی گئیں۔ حتیٰ کہ تیل سے محروم رہنے والی گاڑیوں میں فائر بریگیڈ کی گاڑیاں بھی شامل تھیں۔ مذکورہ بالا بھاری مشینری مسلسل ایک سال تک میاں اظہر کی زمینوں پر کام کرتی رہی اور یوں میٹرو پولیٹن کارپوریشن کے کروڑوں روپے میاں محمد اظہر کی ذاتی جائیداد پر خرچ ہوتے

Marfat.com

رہے۔

انہی دنوں میاں محمد اظہر نے لاہور میں ناجائز تجاوزات گرانے کے لیے آپریشن شروع کرا دیا اور تجاوزات کے ملبے کو بھی کارپوریشن کے ٹرکوں میں بابکوال لے جایا گیا۔ تجاوزات سے حاصل ہونے والا یہ ملبہ فارم کی سڑکوں اور کچے راستوں پر ڈال دیا گیا جب کہ کچھ ملبہ مچھلی فارموں کے کناروں کو پختہ کرنے میں بھی صرف ہوا۔ جب کہ صاف اینٹوں سے ایک کلومیٹر لمبی سولنگ لگوائی گئی۔ ایک سال کی محنت کے بعد چار چار فٹ بعض جگہوں پر تین تین فٹ تک پھیلا کلر اٹھا کر کناروں پر ڈال دیا گیا جب کہ کلر کی کچھ مقدار ٹرکوں پر لاد کر باہر لے جائی گئی۔ خالی ہونے والی جگہ پر لاہور سے لائی گئی گوبر ملی مٹی (دیسی کھاد) ڈالی گئی۔ اس دوران کارپوریشن کی افرادی قوت بھی فارم پر جھونک دی گئی اور سینکڑوں افراد نے سارے کوڑے کرکٹ سے شاپنگ بیگ اور دوسرا فضول مواد علیحدہ کر دیا اور خالص کوڑے کو زمین کی تہہ میں بچھا دیا۔ اس دوران تقریباً چھ ماہ تک بلڈوزر اور ٹریکٹر کھدائی کرتے رہے اور ۱۵ ایکڑ پر وسیع و عریض مچھلی فارم بنائے گئے۔ بلڈوزر مٹی اٹھا کر کناروں پر چڑھاتے رہے جب کہ ٹریکٹر اسی مٹی کو ہموار کر کے کناروں پر سڑکیں بناتے رہے۔

جب زمین کی ابتدائی شکل زرعی اراضی کا روپ دھار گئی تو میاں اظہر نے زرعی ٹیکنالوجی، محکمہ انہار اور محکمہ زراعت کے ماہرین کو بھی زمین کو سائنسی بنیادوں پر زرخیز ترین اور چھوٹے چھوٹے قابل کاشت قطعات میں تبدیل کرنے پر معمور کر دیا۔ ذرائع کے مطابق ساری اراضی پر کلر کے دائمی خاتمے کے لیے تقریباً ایک ہزار ٹن جپسم ڈالا گیا اور جپسم کی قیمت ادا نہ کی گئی بلکہ متعلقہ محکمے کو محض رسیدوں کی تیاری کا حکم دیا گیا۔ زرعی ٹیکنالوجی کی جدید ترین مشینری جو زمین کی اوپری سطح مزید ہموار کرنے کے لیے استعمال کی گئی، اس کا تقریباً اڑھائی لاکھ روپے کا بل بھی رسیدوں کی تیاری تک محدود رہا۔ محکمہ انہار نے زمینوں کو نہری پانی کے لحاظ سے ہموار کرنے میں کردار ادا کیا۔

بابکوال فارم جو اب مکمل طور پر زرعی پیداوار کے لیے تیار ہو چکا تھا، اس کو منڈی سے جوڑنے کے لیے خصوصی طور پر کام شروع کیا گیا اور میئر کے حکم پر ساڑھے تین کلومیٹر لمبی کچی سڑک کو جدید ترین طریقے سے "میٹلڈ" روڈ میں بدل دیا گیا۔ ساتھ ہی فارم کو بجلی مہیا کر دی گئی اور ایک عالیشان گھر بھی فارم کے وسط میں بنا دیا گیا۔ اگر آج بھی آپ اس فارم پر جائیں تو آپ کو لاہور کے کوڑا کرکٹ کی نشانیاں بے شمار مقامات پر ملیں گی۔ جہاں

Marfat.com

شاپنگ بیگ اور دیگر کچرا اب بھی پڑا ہے۔

جیسے ہی میاں اظہر نے کارپوریشن کے تمام وسائل اپنے فارم پر جھونک دیے' کارپوریشن میں بدعنوانیوں کا سلسلہ مزید تیز ہوگیا۔ میاں اظہر کی آشیرباد سے ایک مسلم لیگی رہنما اور ڈپٹی میئر خواجہ ریاض محمود نے پکی ٹھٹھی سمن آباد کے علاقہ میں پٹرول پمپ بنا لیا۔ بابکوال فارم کے بارے میں خبریں روکنے کے لیے میاں اظہر نے یونین کے ایک لیڈر ٹکا خاں کو ملازمین کی ہاؤسنگ سوسائٹی بنانے کا مشورہ دیا اور خود اس ہاؤسنگ سوسائٹی کے سرپرست بن گئے۔ ہاؤسنگ سوسائٹی نے غریب ملازمین سے ۶۰۰ روپیہ فی کس وصول کیا اور یوں کروڑوں روپیہ غریب ملازمین کا ڈوب گیا لیکن ہاؤسنگ سوسائٹی کاغذی ثابت ہوئی۔

اس وقت پنجاب میں سب سے زیادہ فی ایکڑ پیداوار میاں اظہر کا فارم دیتا ہے اور علاقہ کا زیادہ تر نہری پانی ان زمینوں کے لیے "وقف" ہے اور میاں اظہر کروڑوں روپے صرف اس فارم اور ۱۵ ایکڑ پر پھیلے ہوئے جدید ترین مچھلی فارموں سے حاصل کر رہے ہیں جبکہ لاہور میٹروپولیٹن کارپوریشن دیوالیہ ہوگئی ہے۔ واضح رہے کہ میاں اظہر نے اس علاقہ میں چھپے خطرناک بدمعاشوں کے خلاف ایک بہت بڑا آپریشن بھی کرایا تھا اور اس کا محرک بھی ان کا زرخیز ترین زرعی فارم تھا۔

عارف نکئی کا خاندان اور نکئی کی کرپشن

سابق وزیر اعلیٰ سردار محمد عارف نکئی پنجاب کے غالباً واحد وزیر اعلیٰ تھے جو بیک وقت اردو پریس اور اپنے ماتحت اداروں اور افراد کے لیے بڑی حد تک تفریح کا سامان رہے۔ میاں منظور وٹو کی وزارت اعلیٰ کے عہدے سے برطرفی کے بعد پی ڈی ایف پنجاب میں پھوٹ پڑنے والے اختلافات کے باعث جب وزیراعظم بے نظیر بھٹو پنجاب میں پیپلز پارٹی کا وزیر اعلیٰ بنانے میں ناکام رہیں۔ تو انہوں نے اپنی اتحادی جماعت مسلم لیگ (ج) کے ایک ایسے بے ضرر شخص کو وزیر اعلیٰ کے لیے چنا جو ایک اوسط درجے کا سیاست دان اور کسی حد تک ایک غیر سنجیدہ منتظم تھا۔ جس نے اپنی بہت ابتدائی انتظامی تقریر میں اپنے سامنے قطار اندر قطار کھڑے پولیس افسران کی پہلے پتلونیں اور بعد میں پیٹیاں اتارنے کی بھڑک مار کر عملاً وزارت اعلیٰ کی شروعات کی۔

اگر نکئی خاندان کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو اس خاندان کی تاریخ پنجاب کی سکھ تاریخ کا ایک نمایاں باب ہے' کیونکہ اس خاندان کا براہ راست تعلق مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار اور خاندان سے تھا' بلکہ نکئی خاندان کی ایک خوبرو دوشیزہ مہارانی نکئین رنجیت سنگھ کی چہیتی بیوی تھی۔

لاہور سے سڑک کے ذریعے ملتان کی طرف سفر کرتے ہوئے تقریباً تقریباً ۶۰ کلومیٹر کے فاصلے پر "بھائی پھیرو" نام کا ایک تاریخی قصبہ واقع ہے۔ اس قصبہ کا نام جو سابقہ وزیر اعلیٰ غلام حیدر وائیں کے دور میں تبدیل کر کے ایک مقامی مسلم لیگی سیاست دان رانا پھول محمد کے نام پر "پھول نگر" رکھا گیا تھا اب بیک وقت "بھائی پھیرو" اور "پھول نگر" کے ناموں سے لکھا اور پکارا جاتا ہے۔ بھائی پھیرو یا پھول نگر سے تقریباً بیس کلومیٹر کے فاصلے پر عین ملتان روڈ کے اوپر بھوئینکے موڑ نام کا ایک سٹاپ واقع ہے۔ یہاں سے شمال مغربی

کونے میں تقریباً تین کلومیٹر کے فاصلے پر ایک گاؤں موضع "بہڑوال" آباد ہے۔ اس چھوٹے سے گاؤں کی زیادہ تر آبادی تقسیم کے بعد پاکستان آنے والے مہاجر خاندانوں پر مشتمل ہے۔ اس گاؤں کی تاریخ ہی اصل میں مذکورہ بالا نکئی خاندان کی تاریخ ہے۔

بہڑوال نامی اس گاؤں کو پندرھویں صدی کے آخری عشرے میں آروڑا قوم کے ایک شخص "بہڑ" نے آباد کیا اور اسی کے نام پر گاؤں کا نام "بہڑوال" مشہور ہوا۔ سکھ روایت کے مطابق سکھ مذہب کے پانچویں گرو شری ارجن دیو جی اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ ننکانہ صاحب (شیخوپورہ) سے قصور جاتے ہوئے اس گاؤں میں آرام کی غرض سے ٹھہرے۔ یہاں کے باسیوں نے گرو جی کی موجودگی کی کوئی خاص پروا نہ کی تو گرو صاحب بہڑوال میں قیام کو ملتوی کر کے قریبی گاؤں "جمبر" چلے گئے۔ جمبر گاؤں کے لوگوں نے بہڑوالیوں کے برعکس گرو جی کی خاطر سیوا کی اور انہیں پورے گاؤں نے خوش آمدید کہا۔ گرو جی ایک درخت کے نیچے آرام کر رہے تھے کہ بہڑوال کا چودھری ہمراج وہاں آ پہنچا اور انہیں سویا ہوا سمجھ کر چارپائی سمیت اٹھا کر بہڑوال لے آیا۔ روایت کے مطابق جب گرو ارجن دیو جی بہڑوال میں رکے تو اس وقت ہمراج گاؤں میں موجود نہ تھا۔ ہمراج کے اس عمل سے گرو جی بہت خوش ہوئے اور انہوں نے پانی طلب کیا۔ جواب میں گرو جی کو بتایا گیا کہ بہڑوال کے اکلوتے کنویں کا پانی کھاری (کڑوا) ہے۔ گرو جی نے گڑ کی ایک روڑی (ڈھیلی) منگوائی اور اس کو کنویں میں ڈال دیا جس سے کنویں کا پانی میٹھا ہو گیا اور یہ پانی روایت کے مطابق آج تک میٹھا ہے اور متبرک جانا جاتا ہے۔ اس موقع پر گرو ارجن نے چودھری ہمراج کو دعا دی کہ تیرے گھر میں ایک ایسا بچہ پیدا ہوگا' جو بڑا طاقتور رئیس بنے گا۔ تاریخ کی بعض مقامی کتب میں درج ہے کہ اس کے بعد ۱۵۹۵ء میں چودھری ہمراج کے خاندان نے سکھ مذہب قبول کر لیا۔ یہ کنواں آج بھی بہڑوال کے گردوارہ "پنجم پادشاہی" کے احاطے میں موجود ہے۔

گرو ارجن دیو جی کی وفات ۱۶۰۶ء کے تقریباً ایک سو برس بعد چودھری ہمراج کے خاندان میں ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام "ہیرا سنگھ" رکھا گیا اور اس کو گرو ارجن دیو جی کی پیش گوئی کا نتیجہ قرار دیا گیا۔ اسی ہیرا سنگھ نے جو بعد میں ایک طاقتور سردار بن گیا' اٹھارہویں صدی کے وسط میں لاہور اور گوگیرہ کے درمیانی علاقہ پر قبضہ کر لیا اور وسیع و عریض جاگیر پر واحد حکمران بن بیٹھا۔

ہیرا سنگھ کے اس مقبوضہ علاقہ کو "نکے کا علاقہ" کہا جانے لگا۔ واضح رہے کہ "نکا"

Marfat.com

پنجابی میں کنارے یا دھانے کو کہا جاتا ہے۔ یہ علاقہ چونکہ دریائے راوی کا کنارہ تھا' اس لیے اس علاقے کو نکا اور اس علاقہ پر حاکم خاندان کو "نکے والا خاندان" کہا جانے لگا۔

پنجاب میں اٹھارہویں صدی کے اواخر کی بدامنی میں سردار ہیرا سنگھ نکے والا نے بھی اہم کردار ادا کیا اور اس نے اپنا ایک جنگجو گروپ بنا لیا جو آس پاس کے علاقوں پر حملہ آور ہوتا اور چھوٹے زمینداروں کی زمینوں پر قبضہ کر کے انہیں یا تو قتل کر دیتا یا پھر قید میں ڈال دیتا اور ان کی زمین اپنے علاقے میں شامل کر لیتا۔ بعد میں یہ گروپ نکئی مسل کے نام سے مشہور ہوا اور لفظ نکے والا نکئی بن گیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اس گروہ نے چونیاں پر قابض افغانوں کو شکست دے کر شہر پر قبضہ کر لیا اور اس طرح یہ مسل ایک طاقتور مسل کے طور پر سامنے آئی۔ اس کے بعد ہیرا سنگھ نے کنھیوں اور مشہور بھنگیوں کی مسل کے ساتھ مل کر مغل سلطنت کے خلاف بغاوت کر دی اور بہت سے علاقے پر قبضہ کر کے حکمران بن گیا۔

اس کے کچھ عرصہ بعد ہیرا سنگھ نکئی نے پاک پتن کے حکمران اور سجادہ نشین شیخ شجاع چشتی کے علاقہ پر حملہ کر دیا۔ اس لڑائی میں ہیرا سنگھ مارا گیا۔ یہاں بھی ایک روایت ملتی ہے کہ گرو ارجن دیو جی نے پیش گوئی کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ یہ بچہ (ہیرا سنگھ) ایک مسلمان فقیر سے الجھ جائے گا لیکن یہ اس کے اختیار میں ہوگا کہ اگر وہ اس موقع کو ٹالنے میں کامیاب ہوگیا تو وہ ایک دن ہندوستان کا حکمران بنے گا اور اگر اس وقت یہ بے قابو ہوگیا تو پھر مارا جائے گا۔ لہٰذا ہیرا سنگھ پاک پتن پر چڑھائی کے دوران ہلاک ہوگیا۔ ہیرا سنگھ کی موت کے وقت اس کا بیٹا دل سنگھ کم سن تھا اس لیے ہیرا سنگھ کا بھتیجا نار سنگھ مسل کا حکمران بنا۔

اب نکئی خاندان کو قریبی علاقوں کو فتح کرنے کا چسکا پڑ چکا تھا اور ہر نیا حکمران مزید علاقے اپنی گرفت میں کرنا چاہتا تھا۔ لہٰذا اسی طرح ایک اور معرکہ میں جو کوٹ کمالیہ کے علاقہ میں ہوا' نار سنگھ بھی مارا گیا۔ اس کی موت کے بعد اس کا بھائی مان سنگھ حکمران بنا' جس نے اپنی مسل کی طاقت اور مسل میں مزید اضافہ کیا اور پہلے سے کہیں زیادہ علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ مان سنگھ کے عروج کے دوران نکئی مسل کے قبضہ میں ۹ لاکھ روپیہ مالیت کی جاگیر تھی اور ان کے قبضہ میں چونیاں' قصور' شرق پور اور گوگیرہ کا علاقہ تھا۔ کچھ عرصہ کھرل قوم کا صدر مقام کوٹ کمالیہ بھی نکئی مسل کے زیر تسلط رہا۔ اس دوران نکئی خاندان کے پاس چار ہزار ایکڑ سے زائد زرعی زمین تھی۔

مان سنگھ کے بعد اس کا بیٹا بھگوان سنگھ نکئی مسل کا حکمران بنا جو کہ ایک کمزور اور بزدل سردار کے طور پر مشہور ہوا۔ اس دوران ایک قریبی مسل سید والا کے حکمران قمر سنگھ نے نکئی مسل پر حملہ کر دیا اور بہت سا علاقہ اپنے قبضہ میں لے لیا۔

بھگوان سنگھ جتنا کمزور اور بزدل تھا' اتنا ہی منصوبہ ساز تھا۔ اس نے سوچا کہ خود لڑنے اور وسیع و عریض جائیداد گنوانے کے بجائے اگر کسی طاقتور کے ساتھ دوستی کر لی جائے تو اس طرح آس پاس کے سردار نکئی خاندان کی جاگیر پر قابض نہیں ہو سکیں گے۔

انسائیکلوپیڈیا آف سکھ لٹریچر کے مطابق یہ سوچ کر بھگوان سنگھ نے اپنی چھوٹی بیٹی "راج کور" کی منگنی گوجرانوالہ کی مشہور اور طاقتور مسل سوکر چاکیہ مسل کے کمیدان سردار مہان سنگھ کے بیٹے سردار رنجیت سنگھ (بعد میں حکمران پنجاب) کے ساتھ کر دی۔ یہ مسل اس وقت پنجاب کی سب سے طاقتور مسل تھی۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے والد مہان سنگھ نے بھگوان سنگھ اور وزیر سنگھ نکئی کو ۱۷۸۵ء میں اس غرض سے امرتسر بلوایا کہ وہ دونوں جے سنگھ کنہیا کے خلاف اس کی مدد کریں۔ ان کی مدد سے مہان سنگھ کو فتح حاصل ہوئی۔ وہاں سے حاصل ہونے والے مال غنیمت سے وزیر سنگھ اور مہان سنگھ میں جھگڑا ہو گیا۔ اس لڑائی میں بھگوان سنگھ نکئی ہلاک ہوا۔ بھگوان سنگھ کے بعد اس کا بھائی گیان سنگھ حکمران بنا۔ اب نکئی مسل کے جد امجد ہیرا سنگھ کا بیٹا اور حکمرانی کا اصل حق دار دل سنگھ بھی جوان ہو چکا تھا۔

"ہسٹری آف سکھ" کا مصنف لکھتا ہے کہ ایک دن قریبی حریف مسل سید والہ کا حاکم وزیر سنگھ بھڑوال آ نکلا۔ اسے دیکھ کر ہیرا سنگھ کے بیٹے دل سنگھ نے اس پر حملہ کر دیا جس سے نکئی مسل کا پرانا دشمن قتل ہو گیا۔ وزیر سنگھ کو قتل ہوتے دیکھ کر اس کے ایک نوکر نے دل سنگھ کا تعاقب کیا اور اسے بھاگتے ہوئے قتل کر دیا۔ اس خون خرابے نے نکئی مسل کو اور بھی کمزور کر دیا۔

اس دوران سوکر چاکیہ مسل کے حکمران مہان سنگھ کا انتقال ہو گیا اور بھگوان سنگھ کی بہن کی شادی رنجیت سنگھ کے ساتھ کر دی گئی۔ نکئی مسل دن بدن کمزور ہوتی جا رہی تھی اور اس کے علاقے گرفت سے نکلتے جا رہے تھے۔ اس دوران مہان سنگھ کے بیٹے رنجیت سنگھ نے لاہور پر قبضہ کر لیا۔ رنجیت سنگھ چونکہ نکئی مسل کا داماد تھا' اس لیے لاہور پر اس کے قبضہ نے نکئی حکمرانوں کو امید دلائی کہ ان کے مقبوضہ علاقے انہیں واپس مل جائیں گے۔ لیکن غیر متوقع طور پر مہاراجہ رنجیت سنگھ نے خود آگے بڑھ کر نکئی

Marfat.com

مسل کے علاقوں پر چڑھائی شروع کر دی اور بہت سے علاقے قبضہ میں لے لیے۔

۱۸۰۲ء میں مہارانی راج کور نکئی ن کے بطن سے ایک بیٹا پیدا ہوا' جس کا نام کھڑک سنگھ رکھا گیا جو بعد میں پنجاب کے تخت پر بیٹھا اور مہاراجہ کھڑک سنگھ کہلوایا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے نکئی مسل کے نئے حکمران سردار کاہن سنگھ کو حکم دیا کہ وہ دربار میں حاضر ہوا کرے۔ سردار کاہن سنگھ نے انکار کر دیا۔ کیونکہ کاہن سنگھ کو یہ رنج تھا کہ رنجیت سنگھ جو نکئی مسل کا داماد ہے' اسی نے نکئی مسل کے علاقوں پر قبضہ کر لیا ہے۔ کاہن سنگھ کے انکار پر رنجیت سنگھ نے نکئی مسل کی باقی ماندہ جاگیر پر بھی قبضہ کر لیا اور کاھن سنگھ کو بھڑوال اور اس کے گرد و نواح تک محدود کر دیا اور اسے گزر اوقات کے لیے ۱۵ ہزار مالیت کی جاگیر بطور پنشن دے دی۔

نکئی مسل جو کہ علاقہ کی سب سے بڑی اور طاقتور مسل تھی پے در پے اپنے ہی داماد رنجیت سنگھ کی زیادتیوں کا شکار رہی اور اس مسل کا پھیلاؤ صرف ان علاقوں تک محدود ہو کر رہ گیا جو خاندان کے سرکردہ افراد کو "زندگی کاٹنے" کی غرض سے پنشن کے طور پر ملی تھی۔

۱۸۹۱ء سے لے کر ۱۹۲۰ء تک کا زمانہ نکئی مسل کے لیے بہت کٹھن رہا۔ اس کے بعد جب عطر سنگھ اور اشیر سنگھ کا زمانہ آیا تو انہیں آہستہ آہستہ اپنی کھوئی ہوئی جاگیریں واپس ملنا شروع ہو گئیں۔ کیونکہ تخت لاہور کے ساتھ ان کے تعلقات بہتر ہونا شروع ہو گئے تھے۔ گوجرانوالہ کے ایک گاؤں اروپ کی ایک روحانی شخصیت خواجہ برکت علی کی کرامات دیکھ کر سردار اشیر سنگھ اور سردار عطر سنگھ مسلمان ہو گئے اور دونوں کے نام بالترتیب عبدالعزیز نکئی اور خدا بخش نکئی رکھے گئے۔ اشیر سنگھ جو سردار عبدالعزیز نکئی ہو گئے تھے' ان کا انتقال ۱۹۲۵ء میں ہوا۔ ان کے بڑے بیٹے کا نام سردار دین محمد نکئی تھا جو ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تحصیل چونیاں اور ضلع منٹگمری (ساہیوال) بھی رہے۔ دوسرے بیٹے کا نام سردار محمد اکبر نکئی تھا جو آنریری مجسٹریٹ اور ذیلدار ہوئے۔ دین محمد نکئی کے تین بیٹے ہوئے' جن میں سب سے چھوٹے کا نام سردار محمد عارف نکئی رکھا گیا۔

۱۹۴۷ء میں نکئی خاندان کے سکھ افراد ہندوستان چلے گئے' جو وہاں مختلف حکومتوں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ جب کہ پاکستان کے ضلع قصور میں موجود مسلمان نکئی خاندان نے بھی باقاعدہ سیاست میں حصہ لینا شروع کیا اور ساتھ ساتھ اپنی وسیع و عریض زرعی اراضی پر جدید طریقوں سے کاشتکاری شروع کر دی۔

Marfat.com

نکئی خاندان کے سردار عبدالحمید نکئی ۱۹۵۱ء میں صوبائی اسمبلی کے ممبر بنے۔ اس کے بعد انہوں نے ۱۹۵۶ء کے ون یونٹ اسمبلی انتخابات میں بھی حصہ لیا لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ ۱۹۶۲ء میں بی ڈی سسٹم کے تحت ہونے والے قومی اسمبلی کے انتخابات میں نکئی خاندان کے فرد سردار عبدالحمید نکئی قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ انہوں نے لاہور کے حلقہ این ڈبلیو ۳۸ سے حصہ لیا تھا۔ سردار عبدالحمید نکئی رشتہ میں سابقہ وزیر اعلیٰ پنجاب سردار عارف نکئی کے چچا ہیں۔ سردار عبدالحمید نے بعد ازاں کنونشن مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی۔

۱۹۶۵ء کے انتخابات میں سردار عبدالحمید نکئی ایک بار پھر ممبر قومی اسمبلی منتخب ہوئے اور انہوں نے چودھری محمد سعید کو شکست دی۔ سردار عبدالحمید نکئی جنہوں نے ماضی میں کئی سیاسی پارٹیاں بدلیں' بالاخر کنونشن لیگ سے مستقل طور پر وابستہ ہوگئے۔ انہوں نے اپنے سیاسی جانشینوں کے طور پر اپنے بھتیجے سردار محمد عارف نکئی اور سردار طالب حسین نکئی کو تیار کیا اور خود حمید ٹیکسٹائل ملز نام کا ایک کارخانہ لگا کر ساتھ ساتھ زمینداره کرنے لگے۔ ۱۹۷۰ء میں سردار دین محمد نکئی کے بیٹے سردار عارف نکئی نے پہلی بار انتخابات میں حصہ لیا۔ سردار عارف نکئی کے مقابلے میں دو طاقتور سیاسی حریف تھے۔ اس الیکشن میں عارف نکئی جمعیت علمائے پاکستان کے ٹکٹ پر کھڑے تھے۔ مقابلے میں پاکستان پیپلز پارٹی کے شفاعت خان چوهان اور مرکزی جمعیت اہل حدیث کے رہنما مولانا معین الدین لکھوی تھے۔ انتخابات کے نتائج آئے تو پیپلز پارٹی کے شفاعت چوهان نے سردار عارف نکئی کو ۱۸ ہزار ووٹوں سے شکست دے دی تھی۔ سردار عارف نکئی نے یہ الیکشن امیدوار برائے قومی اسمبلی کی حیثیت سے حلقہ این ڈبلیو ۶۴ لاہور سے لڑا تھا۔

۱۹۸۵ء کے انتخابات میں نکئی خاندان ایک بار پھر سامنے آیا اور سردار عارف نکئی نے صوبائی اسمبلی کے حلقہ پی پی ۱۱۵ سے ابراہیم خان کو شکست دی جب کہ ان کے داماد سردار طالب حسن نکئی نے صوبائی اسمبلی کے حلقہ نمبر ۱۱۶ سے رانا پھول محمد سے شکست کھائی۔ اس کے بعد سردار عارف نکئی اور سردار طالب حسن نکئی مسلم لیگ میں شامل ہوگئے۔ پنجاب میں نواز شریف کی حکومت میں سردار عارف نکئی ۸۷-۱۹۸۶ء کے دوران صوبائی وزیر ریونیو اور ریلیف کے عہدے پر فائز رہے۔

سردار عارف نکئی ۸ اگست ۱۹۳۰ء میں موضع بھڑوال میں پیدا ہوئے اور میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ اگرچہ سردار عارف نکئی کے اسمبلی ریکارڈ میں ان کی تعلیم ایف۔

اے تک لکھی ہوئی ہے لیکن گورنمنٹ ہائی سکول چکوال سے میٹرک کرنے کے بعد سردار عارف نکئی کے تعلیم جاری رکھنے کے کوئی شواہد نہیں ملتے۔ ۱۹۶۵ء تا ۱۹۷۰ء سردار عارف نکئی ضلع کونسل لاہور کے وائس چیئرمین رہے۔ اس کے بعد ۷۹-۱۹۷۸ء میں بھی وہ وائس چیئرمین ضلع کونسل کے عہدے پر رہے۔ ۱۹۷۷ء میں عارف نکئی نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے انتخابات میں کاغذات نامزدگی جمع کرائے لیکن بعد میں بائیکاٹ میں شامل ہوگئے اور انتخابات میں حصہ نہ لیا۔ ۱۹۸۵ء میں الیکشن جیتنے کے علاوہ انہوں نے ۱۹۹۰ء میں بھی آئی۔ جے۔ آئی کے امیدوار کی حیثیت سے الیکشن میں حصہ لیا اور کامیاب رہے۔ ۱۹۹۳ء کے انتخابات میں بھی سردار عارف نکئی کو فتح حاصل ہوئی اور وہ ۱۹۸۵ء سے ۱۲ ستمبر ۹۵ء تک مختلف صوبائی حکومتوں میں صوبائی وزیر کی حیثیت سے شامل رہے۔ سردار عارف نکئی ستمبر ۹۵ء میں وزیر اعلیٰ میاں منظور وٹو کی حکومت ختم ہونے کے بعد وزیر صنعت سے اچانک پنجاب کے وزیر اعلیٰ بنا دیے گئے اور یوں مسلم لیگی دھڑوں میں شامل ایک غیر معروف نام قومی سطح پر اہمیت اختیار کر گیا۔ یہ بات اب پوشیدہ نہیں رہی کہ ایک غیر مقبول اور درمیانے درجہ کے سیاست دان عارف نکئی کو وزیر اعلیٰ کیوں بنایا گیا تھا۔

وزیر اعلیٰ سردار عارف نکئی کا پتوکی کے چار دیہات میں وسیع و عریض زرعی رقبہ ہے۔ موضع واں آدھن جہاں اس وقت سابقہ وزیر اعلیٰ کا خاندان آباد ہے' وہاں ان کی ملکیتی اراضی ۹ مربع سے زیادہ ہے اور ان کے منشی ناظر حسین کے بقول اس اراضی سے عارف نکئی کو سالانہ ۵۰ سے ۶۵ لاکھ روپیہ آمدنی ہوتی ہے۔ موضع بونگہ سردار کاھن سنگھ عرف ڈوبا میں سردار عارف نکئی کی ملکیتی زمین ساڑھے چار مربع کے قریب ہے اور اس اراضی سے عارف نکئی کو ۱۵ لاکھ روپیہ آمدنی ہوتی ہے۔ موضع کوٹ سردار کاھن سنگھ میں عارف نکئی کے پاس ۵ مربع اراضی ہے' جس سے ۱۵ لاکھ روپے کی آمدنی ہوتی ہے۔ جب کہ موضع ججہ کلاں میں عارف نکئی کے پاس ۹ مربع اراضی ہے' جس میں اعلیٰ درجے کا چاول اور گندم پیدا ہوتی ہے اور یہاں سے عارف نکئی کو ۱۰ لاکھ روپے کی آمدنی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ موضع واں آدھن میں سردار عارف نکئی کی ملکیت ۲ مربع اراضی پر پھیلا ہوا باغ بھی ہے لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ سابقہ وزیر اعلیٰ سردار عارف نکئی جو تقریباً ایک کروڑ سالانہ کی آمدنی حاصل کرتے ہیں' ایک روپیہ بھی ٹیکس ادا نہیں کرتے اور ان کے وفادار پٹواری ان کی اراضی کو بنجر اور ناقابل کاشت ظاہر کر کے بہت ہی معمولی مالیہ اور آبیانہ سے بھی بچا لیتے ہیں۔

Marfat.com

ستمبر ۱۹۹۵ء سے پہلے جب سردار عارف نکئی محض ایک گمنام صوبائی وزیر تھے تو ان کی مختلف محکموں اور ادوار حکومت میں کی جانے والی کرپشن منظر عام پر نہ آئی۔ لیکن جب وزیر موصوف وزیر اعلیٰ بن گئے تو پھر اپنے پیش رو وزیر اعلیٰ میاں منظور وٹو کی طرح انہوں نے بھی "فیاضی" کے دریا بہا دیے اور مختلف طریقوں سے کھلی کرپشن کا مظاہرہ کیا۔

اگرچہ صوبائی وزیر لائیو سٹاک کی حیثیت سے بھی ان کی کرپشن سامنے آئی اور انہوں نے اپنے فرزند کو وزیر اعلیٰ میاں نواز شریف کی سفارش سے نائب تحصیلدار بھی بھرتی کرا لیا اور بعد میں اس کو اپنے دور حکومت میں تحصیلدار کے عہدے پر ترقی دلوا دی۔

سردار عارف نکئی نے وزیر لائیو سٹاک کی حیثیت سے محکمہ کو ملنے والے ترقیاتی فنڈ سے گاڑیاں خرید لیں اور پھر انہیں بہاولپور میں اپنے ایک دوست افضل چچا کے پاس بھیج دیا۔ ایشیائی ترقیاتی بینک نے لائیو سٹاک پراڈکشن ایجوکیشن کے لیے ایک ارب روپے سے زائد مالیت کا ایک ترقیاتی پروگرام گیارہ اضلاع کے لیے منظور کیا۔ اس پروگرام کا مقصد لوگوں کو مال مویشیوں کی پرورش کے سلسلہ میں تربیت دینا تھا تاکہ بیماریوں وغیرہ کا مناسب تدارک کیا جا سکے اور جانوروں کی شرح اموات کو قابو کیا جا سکے۔ وزیر لائیو سٹاک سردار عارف نکئی نے سارے پروگرام کو نظر انداز کرتے ہوئے پانچ قیمتی گاڑیاں خرید لیں اور بہاولپور میں اپنے دوست چچا کے سپرد کر دیں، جنہوں نے ان قیمتی گاڑیوں کو اپنے زرعی فارم کی ٹرانسپورٹ کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا۔ وزیر عارف نکئی کی سربراہی میں ترقیاتی کاموں کے لیے محکمہ کو ملنے والا قرضہ غیر ترقیاتی مد میں خرچ کر دیا جاتا۔ صرف ہارس اینڈ کیٹل شو پر ۵ کروڑ روپے زائد خرچ کر دیے گئے۔ سردار عارف نکئی نے وزیر اعلیٰ بننے کے بعد بھی محکمہ لائیو سٹاک میں اپنی مداخلت جاری رکھی اور محکمہ کا میڈیسن کا سالانہ بجٹ جو ۳ کروڑ روپے تھا، اسے بڑھا کر ۵ کروڑ روپے کر دیا اور ساتھ ادویات کی خریداری پر ۳۵ فیصد کمیشن بھی حاصل کرنا شروع کر دیا۔ نہ صرف سردار نکئی نے محکمہ لائیو سٹاک میں اپنی برادری کے لوگوں کو آگے لانے کی کوشش کی بلکہ بے شمار افراد کو آوٹ آف ٹرن ترقی بھی دے دی۔ سردار عارف نکئی نے وزیر اعلیٰ بنتے ہی پنجاب بینک کے اعلیٰ افسران پر دباؤ ڈال کر انہیں مجبور کر دیا کہ وہ ان کے عزیز عبدالحمید نکئی کی ملکیتی "حمید ٹیکسٹائل ملز" کو ملنے والے قرضے کی رقم کو دگنا کر دیں۔ واضح رہے کہ حمید ٹیکسٹائل ملز پہلے ہی نادہندہ تھی اور اس کے باوجود اس کو ملنے والے ساڑھے چار کروڑ روپے کے قرضے کو نو کروڑ روپے کر دیا گیا۔

Marfat.com

نکئی کے وزیر اعلیٰ پنجاب ہونے کا بھرپور فائدہ ان کے داماد اور رکن قومی اسمبلی سردار طالب حسن نکئی نے اٹھایا اور انہوں نے چیف منسٹر ہاؤس میں ہی ایک نجی بھرتی سینٹر قائم کر لیا اور سب سے پہلی بھرتیاں لاہور میں نئے تعمیر ہونے والے جناح ہسپتال کے لیے کیں جہاں انہوں نے ۲۰۰ افراد کو بھرتی کرایا اور ان سے بھاری رشوت وصول کی۔ اس موقع پر جناح ہسپتال میں تقرریوں کے خواہش مند سینئر وزیر ملک مشتاق اعوان اور وزیر صحت بدرالدین چودھری کی سردار طالب حسن سے تلخ کلامی بھی ہوئی اور ملک مشتاق اعوان اور بدر الدین چودھری نے اپنے طور پر بھرتیاں شروع کر دیں۔ لیکن آخری فتح طالب حسن نکئی کی ہوئی اور ان کے بھرتی کردہ سٹاف کو جناح ہسپتال میں رکھ لیا گیا اور ایک اندازے کے مطابق طالب حسن نکئی نے اس "پراجیکٹ" سے ۵ کروڑ روپیہ کما لیا۔ طالب حسن نکئی نے اس کے علاوہ بھی وزیر اعلیٰ کے کوٹے سے بھرتیوں کا سلسلہ جاری رکھا اور ستمبر ۹۵ء سے لیکر نومبر ۹۵ء تک ایک محتاط اندازے کے مطابق ڈیڑھ ہزار سے زائد افراد کو رشوت وصول کر کے مختلف محکموں میں بھرتی کرایا جن میں وفاقی خفیہ ایجنسی آئی بی (I B) میں ۷۰ سے زائد انسپکٹروں کو بھرتی کرایا گیا اور آئی بی کے ڈائریکٹر جنرل مسعود شریف کو بھی کمیشن دیا۔

وزیر اعلیٰ نکئی نے اپنے طور پر وسیع پیمانے پر بدعنوانیوں کا سلسلہ جاری رکھا اور خزانے کے منہ اپنے دوستوں اور عزیزوں پر کھول دیے۔ اس کی تازہ ترین مثال وزیر اعلیٰ نکئی کی طرف سے جاری ہونے والا ایک حکم نامہ ہے۔ یہ حکم نامہ جو وزیر اعلیٰ کے سیکرٹری جلیل عباس کے دستخطوں سے جاری ہوا' اس میں صوبے کی تمام آٹھ ڈویژنوں کے کمشنروں کو یہ خصوصی ہدایت کی گئی تھی کہ وہ جلد از جلد "وی وی آئی پی" افراد کے لیے اپنے ترقیاتی منصوبوں کو روک کر ایک ایک جدید ترین پجارو گاڑی خریدیں۔ ان تمام ڈویژنوں نے ۴۰ سے ۴۲ لاکھ روپے مالیت کی ایک ایک گاڑی خریدی اور انہیں وزیر اعلیٰ کے فرزند سردار آصف نکئی کے لیے مخصوص کر دیا۔ تمام ڈویژنوں نے اپنے ترقیاتی کام روک کر وزیر اعلیٰ کے حکم پر سرکاری خرچ سے گاڑیاں خریدی تھیں۔ ان گاڑیوں پر پنجاب کے آٹھوں ڈویژنوں نے ۳ کروڑ ۲۰ لاکھ روپیہ صرف کیا لیکن وزیر اعلیٰ کے صاحبزادے کو ان قیمتی گاڑیوں کے استعمال کی مہلت نہ مل سکی اور ان کے والد بہادر کی حکومت جاتی رہی۔

سردار عارف نکئی واحد وزیر اعلیٰ تھے' جنہوں نے اپنی وزارت اعلیٰ کے دوران

Marfat.com

"وزیر اعلیٰ صوابدیدی" فنڈ کو ہوا نہ لگنے دی۔ جب کہ میاں منظور احمد وٹو نے اپنے دور میں "صوابدیدی فنڈ" کو اپنے حلقہ انتخاب کے لوگوں پر "وار" دیا تھا اور کروڑوں روپے کی رقم صرف چند چیکوں کی مدد سے وزارت خزانہ سے حاصل کر لی تھی۔ سردار عارف نکئی نے اپنے صوابدیدی فنڈ جس کی مقدار ایک کروڑ ۳۶ لاکھ روپے تھی، اس کا صحیح استعمال اپنے مختصر اقتدار کی آخری رات کیا۔ جیسے ہی وفاقی حکومت سمیت صوبائی حکومت کو بھی کامل یقین ہوگیا کہ اب ہر صورت میں میاں منظور احمد وٹو کی حکومت بحال کر دی جائے گی، تو ایسے کاموں کو نبٹانے میں عجلت سے کام لیا جانے لگا جن کی موجودگی وٹو کو فائدہ دے سکتی تھی۔

مثال کے طور پر وزیر اعلیٰ عارف نکئی کے خصوصی حکم پر فیصلہ سے ایک رات پہلے یعنی ۲ نومبر ۹۶ء کی رات ان کے سیکرٹری جلیل عباس کے دستخطوں سے سینکڑوں چیک جاری ہوئے اور وزیر اعلیٰ سیکرٹریٹ کے درجن بھر اہلکار ۲ نومبر کی پوری رات ان چیکوں پر وزیر اعلیٰ کے نامزد کردہ لوگوں کے نام لکھتے رہے اور صبح ہونے تک "وزیر اعلیٰ صوابدیدی فنڈ" کا ایک کروڑ ۳۶ لاکھ روپیہ خزانے سے نامعلوم لوگوں کے نام منتقل ہوچکا تھا۔ اس "شب خون" کا اندازہ اس وقت ہوا جب وزیر اعلیٰ میاں منظور وٹو نے بحال ہوتے ہی لاتعداد احکامات جاری کیے اور اسی دوران ایک "دوست" کے لیے ۵۰ ہزار کا چیک صوابدیدی فنڈ سے جاری کیا۔ جب یہ چیک وزارت خزانہ کے پاس پہنچا تو وٹو صاحب کو بتایا گیا کہ "وزیر اعلیٰ صوابدیدی فنڈ" میں ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔ وزیر اعلیٰ کے استفسار پر بتایا گیا کہ ان کی بحالی سے پہلے کی رات تمام صوابدیدی فنڈ نکلوا لیا گیا تھا۔

سردار عارف نکئی کے شاہانہ مزاج کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ مارچ ۹۶ء کے شروع میں انہوں نے ایک دن یہ حکم جاری کر دیا کہ ان کی ڈیوٹی فری مرسڈیز گاڑی جو ابھی کراچی ڈرائی پورٹ پر کلیرنس کے انتظار میں کھڑی تھی، وہ اسے شام کو ریس کورس پارک میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ واضح رہے کہ وزیر اعلیٰ نے اس گاڑی کے ذریعے ۸۱ لاکھ روپے کی ڈیوٹی بچائی تھی۔ ابھی یہ گاڑی ڈرائی پورٹ پر تھی اور کلیرنس کے بعد اس نے سڑک کے ذریعے این ایل سی کے ٹرالوں پر لدھ کر تقریباً ایک ہفتہ تک لاہور پہنچنا تھا، لیکن وزیر اعلیٰ نکئی نے حکم جاری کر دیا کہ انہیں یہ گاڑی شام کو ریس کورس نمائش میں چاہیے۔ حکومت پنجاب نے کراچی ڈرائی پورٹ سے گاڑی کی کلیرنس کا فوری بندوبست کیا اور دوپہر کو گاڑی ڈرائی پورٹ سے جہاز کے ذریعے اٹھوا لی۔ اب لاہور میں کسٹم کلیرنس

ضروری تھی لیکن جیسے ہی گاڑی لاہور ایئرپورٹ پر پہنچی تو وزیر اعلیٰ کے صاحبزادے آصف نکئی نے ایئرپورٹ پر موجود کسٹم حکام سے زبردستی گاڑی چھین لی اور اسے شام چھ بجے ریس کورس کی ایک تقریب میں شریک وزیر اعلیٰ کو دکھانے کے لیے لے جایا گیا۔ وزیر اعلیٰ نے گاڑی پر ہاتھ پھیرا اور اپنے بیٹے کو شاباش دے کر کہا کہ وہ اسے جلدی گھر لے جائے۔ لاہور کسٹم حکام نے وزیر اعلیٰ سیکرٹیریٹ کے چند ملازمین کو ڈرائی پورٹ پر روک لیا اور ایوان صدر اور وزیراعظم سے رابطہ کر کے اینٹی سمگلنگ ایکٹ کے تحت وزیر اعلیٰ کے صاحبزادے اور دیگر حکام کے خلاف مقدمہ درج کرنے کی اجازت طلب کر لی۔ لیکن نکئی کی بے نظیر سے فریاد کے بعد کسٹم حکام کو ایسا کرنے سے روک دیا گیا۔

سردار عارف نکئی پنجاب کی تاریخ کے غالباً پہلے وزیر اعلیٰ رہے جو بیک وقت پنجاب حکومت کی ایک سو سے زائد گاڑیاں استعمال کرتے رہے۔ ۷۰ کے قریب قیمتی گاڑیاں وزیر اعلیٰ کے دوستوں اور رشتہ داروں کے پاس رہیں اور روزانہ ہزاروں روپے کا تیل اور لاکھوں روپے مرمت کا خرچ حکومت پنجاب برداشت کرتی رہی۔ اس کے علاوہ "وزیر اعلیٰ ترقیاتی پیکج" کا ایک ارب روپیہ سردار صاحب نے اپنے دوستوں میں بانٹ دیا۔

وزیر اعلیٰ نکئی کے اقتدار کے آخری دنوں کا ایک حیران کن واقعہ بھی ملاحظہ کریں کہ وزیر اعلیٰ کا صاحبزادہ ایک شام اپنے دوستوں کے ہمراہ مری کے فائیو سٹار ہوٹل پی سی بھوربن پہنچا اور ہوٹل انتظامیہ سے فوری طور پر پانچ کمرے بک کرنے کو کہا۔ اتفاق سے اس وقت صرف دو کمرے خالی تھے۔ لہٰذا ہوٹل انتظامیہ نے پانچ کمرے مہیا کرنے سے معذرت کر لی۔ جواب میں وزیر اعلیٰ کے سپوت نے کھچا کھچ بھرے ہوٹل کی لابی میں کھڑے ہو کر سینکڑوں لوگوں کے سامنے اپنا ازار بند کھولا اور ایک گملے میں پیشاب کر دیا۔ موقع پر موجود ایک اسسٹنٹ کمشنر نے "پسر اعلیٰ" کو روکنے کی کوشش کی لیکن اس نے اطمینان کے ساتھ پیشاب کیا اور اگلے پانچ منٹوں میں اپنے والد کو فون کر کے اس اسسٹنٹ کمشنر کو معطل کروا دیا اور دوستوں کے ہمراہ ہوٹل سے باہر نکل گیا۔ اگلے دن اخبارات نے وزیر اعلیٰ کا نام لیے بغیر اعلیٰ شخصیت کے بیٹے کی اس کارستانی کو دبے لفظوں میں بیان کر دیا تو وزیر اعلیٰ نے ایک بیان میں کہہ دیا کہ "جس نے میرے بیٹے کا نام لیا' میں اسے اڑا دوں گا"۔ جب لاہور سے شائع ہونے والے ایک انگریزی ہفت روزہ "فرائیڈے ٹائمز" نے اپنے اداریئے میں وزیر اعلیٰ کا نام لیے بغیر "پنجاب کی مقتدر شخصیت کے بیٹے" کے حوالے

Marfat.com

سے بھورین ہوٹل میں پیشاب کرنے کی کہانی لکھی تو شام کو وزیر اعلیٰ نے اس اخبار کو
نوٹس بھجوا دیا۔

Marfat.com

جرائم کی پشت پناہ تکون؟

مشتاق اعوان' چھبہ ڈوگر' رائے اعجاز

ضلع شیخوپورہ سے تعلق رکھنے والے سیاست دانوں کے لیے شیخوپورہ شہر ہمیشہ ایک منافع بخش انڈسٹری کی طرح رہا ہے۔ گزشتہ پندرہ برسوں میں مقتول ایم۔ پی۔ اے صفدر الحق عرف چھپا ڈوگر' مقتول ایم۔ پی۔ اے رائے سعید احمد خاں' جماعت اسلامی کے سابقہ ایم۔ این۔ اے نذیر ورک اور منور حسین منج سابقہ ایم۔ این۔ اے پاکستان پیپلز پارٹی نے اپنے اپنے دور اقتدار میں اس شہر کے صنعتی اور رہائشی پلاٹوں پر ناجائز قبضوں' چونگیوں اور اڈوں سے حاصل ہونے والے بھتوں اور شہر میں واقع صوبائی اور وفاقی محکموں کے بھتوں سے بے تحاشہ دولت کمائی ہے۔ شہر میں سے گزرنے والی ٹریفک سے بھتہ وصول کرنے کی رسم مقتول ایم۔ پی۔ اے صفدر عرف چھبہ ڈوگر نے شروع کی۔ چھبہ ڈوگر کے مسلح افراد شہر میں سے گزرنے والی ہر نجی گاڑی سے بھتہ وصول کرتے اور انکار کی صورت میں مسافروں کو تشدد کا نشانہ بناتے۔ چھبہ ڈوگر کی شروع کردہ بھتہ کی یہ رسم ہر دور میں شہر سے منتخب ہونے والے ارکان اسمبلی کے مسلح کارندوں کے ذریعے چلتی رہی اور اس وقت صورت حال یہ ہے کہ شہر میں بھتہ کی وصولی پنجاب کے سابق سینئر وزیر ملک مشتاق اعوان کا مسلح گروپ کرتا ہے۔

مشتاق اعوان کے بھائی اور رشتہ دار اور مسلح ساتھی شہر پر مکمل کنٹرول حاصل کیے ہوئے ہیں۔ ملک مشتاق اعوان کے چھوٹے بھائی اشتیاق اعوان خود اپنے ہاتھوں سے بھتہ وصول کرتے ہیں اور ان دونوں بھائیوں نے نیویارک میں ایک بہت بڑا ہوٹل خریدا ہے۔

گزشتہ بیس برسوں میں شیخوپورہ میں منج خاندان ہر حوالے سے "با اثر ترین" خاندان تصور کیا جاتا رہا ہے۔ اگرچہ جماعت اسلامی کے ایک سابق ایم۔ این۔ اے نے بھی شہر میں اپنی دھاک بٹھانے کے لیے مسلح افراد پر مشتمل ایک قبضہ گروپ تشکیل دیا تھا اور

Marfat.com

منور منج کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ۹۳ء میں نواز شریف حکومت کے خاتمہ کے بعد یہ قبضہ گروپ غیر موثر ہو کر رہ گیا۔

منور منج گروپ کے زوال کی اصل وجہ مشتاق اعوان ہیں۔ ۹۳ء کے انتخابات میں ملک مشتاق اعوان صدر پیپلز پارٹی پنجاب نے پیپلز پارٹی کی طرف سے منور منج کو قومی اسمبلی کا ٹکٹ دیے جانے کی مخالفت کی تھی۔ لیکن کمزور مشتاق اعوان کی مخالفت کو غلام مصطفیٰ کھرنے بے اثر کر دیا۔ ملک غلام مصطفیٰ کھر جو ضلع شیخوپورہ کے سب سے بڑے اور طاقتور زمیندار بن چکے ہیں اور ہندوستانی سرحد کے ساتھ ساتھ پھیلی ہوئی اپنی سو مربع سے زائد زرعی اراضی کی دیکھ بھال کے لیے منور منج سے مسلح آدمیوں کی کمک حاصل کرتے ہیں، آئندہ انتخابات میں منور منج کی مدد سے اپنی مسلح فوج کی تیاری میں مصروف ہیں اور اس سلسلے میں انہوں نے "گجر" نام کے ایک بدنام اشتہاری کی خدمات بھی حاصل کرلی ہیں۔

اکتوبر ۹۳ء سے ۱۴ اپریل ۹۵ء تک شیخوپورہ شہر میں منور منج گروپ مشتاق اعوان گروپ کے ساتھ پوری طرح سرگرم رہا لیکن یہ مسلح گروپ اس وقت اچانک زیر زمین چلا گیا، جب ۱۴ اپریل ۹۵ء کو منور حسین منج کو منشیات کی بھاری مقدار برآمد ہونے کے بعد گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ منور منج گروپ کا خیال ہے کہ منور منج جو خود قومی اسمبلی کی انسداد منشیات کی اسٹینڈنگ کمیٹی کے رکن ہیں، وہ کس طرح منشیات کا دھندہ کر سکتے ہیں جب کہ مشتاق اعوان نے منور منج کی روز بروز بڑھتی ہوئی سیاسی مقبولیت سے بوکھلا کر صوبائی انتظامیہ سے مل کر ایک منصوبہ کے تحت منور منج پر منشیات کے دھندے کا الزام لگایا---- منور منج کی گرفتاری کے واقعہ کے بعد سے شیخوپورہ شہر مکمل طور پر مشتاق اعوان گروپ کے زیر کنٹرول آگیا جب کہ مخالفین زیر زمین چلے گئے۔

شیخوپورہ سے فیصل آباد جاتے ہوئے سات کلومیٹر کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا گاؤں "کدلتھی" نام کا واقع ہے۔ اس گاؤں کے ایک بے زمین غریب باسی غلام قادر نے پولیس میں سپاہی کی حیثیت سے ملازمت اختیار کی۔ غلام قادر جب پولیس میں بھرتی ہوگیا تو اس نے اپنے گاؤں "کدلتھی" کو چھوڑ کر شیخوپورہ شہر کے نواح میں واقع ایک آبادی محلہ ہنجراواں میں دو کمرے کا مکان خرید لیا۔ غلام قادر جو اپنی پوری زندگی پولیس کے ایک سپاہی کی حیثیت سے معمولی ملازمت کرتا رہا، اس کے چھ بیٹے ہوئے۔ تیسرے نمبر پر جو لڑکا پیدا ہوا، اس کا نام مشتاق اعوان رکھا گیا جب کہ دیگر بھائیوں کے نام بالترتیب حبیب اعوان، عبدالحمید اعوان، ماسٹر عزیز اعوان، محمد انوار اعوان اور محمد اشتیاق اعوان رکھے گئے۔

Marfat.com

غلام قادر کا بڑا بیٹا حبیب اعوان پٹواری بن گیا جب کہ مشتاق اعوان نے بی۔ اے کرنے کے بعد ایل۔ ایل۔ بی کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۶۵ء میں ضلع شیخوپورہ میں وکالت شروع کر دی۔ مشتاق اعوان شیخوپورہ بار کے درمیانے درجے کے وکیل کے طور پر لگاتار پندرہ سال کام کرتے رہے۔ ۱۹۷۰ء میں مشتاق اعوان نے سیاست کے میدان میں قدم رکھا اور پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۷۷ء میں ضلع شیخوپورہ سے ممبر قومی اسمبلی کے لیے انتخاب لڑا اور جیت گئے۔ اس کے بعد مشتاق اعوان ایم۔ آر۔ ڈی کی تحریک میں شامل ہوئے اور گرفتاری کے بعد لاہور کے شاہی قلعہ میں تشدد کا نشانہ بھی بنے۔ اس دوران مشتاق اعوان کی معاشی حالت بہت دگرگوں رہی۔ ان کی وکالت بہت دھیمی پڑ گئی اور دوسرے بھائیوں نے بھی مدد سے ہاتھ کھینچ لیا۔

۱۹۸۸ء کے انتخابات میں ایک بار پھر مشتاق اعوان نے شیخوپورہ سے پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کے لیے کاغذات نامزدگی جمع کرائے۔ یہ پہلا مواقع تھا کہ مشتاق اعوان کے روابط ضلع کے طاقتور لوگوں سے قائم ہوئے اور مشتاق اعوان کی طرف سے کامیابی کی صورت میں ان لوگوں کو فوائد پہنچانے کے وعدوں کے بعد مشتاق اعوان کی ساری انتخابی مہم شیخوپورہ شہر کے جرائم پیشہ گروپوں نے سنبھال لی۔ واضح رہے کہ شیخوپورہ واحد علاقہ ہے، جہاں انتخابات میں کامیابی دلوانے والے پیشہ ور افراد آج بھی سرگرم ہیں اور اس طرح کئی مثالیں ملتی ہیں کہ انہوں نے کئی سیاست دانوں کے انتخابی اخراجات برداشت کیے اور اپنے مسلح افراد کی مدد سے پولنگ اسٹیشن پر قبضہ کر کے اپنے اپنے امیدوار کامیاب کرا دیے۔

۱۹۸۸ء میں الیکشن جیت کر ملک مشتاق اعوان وفاقی کابینہ میں وزیر مملکت برائے ہاؤسنگ و پلاننگ بن گئے اور ان کے انتخابی فنانسروں نے شیخوپورہ کو یرغمال بنا لیا۔ اٹھارہ سال کی سیاسی ریاضت کے بعد پہلی بار مشتاق اعوان کو عروج حاصل ہونا شروع ہوا اور انہوں نے شیخوپورہ شہر میں اپنی جائیداد بنانا شروع کی۔ مشتاق اعوان کا رابطہ ضلع کے مسلح اور بااثر افراد سے ضرور رہا لیکن اس دوران مشتاق اعوان کی کسی مخالف سیاست دان کے ساتھ باقاعدہ دشمنی کا آغاز نہ ہوا۔ یہ صورت حال تادم تحریر قائم ہے کہ مشتاق اعوان کے پاس مسلح افراد کی بہت بڑی تعداد ہے لیکن ان کی کسی کے ساتھ اس طرح کی خونی دشمنی نہیں، جیسی دوسرے سیاست دانوں کی آپس میں ہے۔

۹۰ء کے انتخابات میں ملک مشتاق اعوان جماعت اسلامی کے نذیر ورک کے ہاتھوں قومی اسمبلی کی نشست ہار گئے لیکن ان کی معاشی حالت وزیر مملکت بننے کے بعد بہت بہتر

Marfat.com

ہو چلی تھی اس لیے انہوں نے وکالت کرنے کی بجائے پوری سرگرمی کے ساتھ سیاست کا کاروبار جاری رکھا۔

۱۹۹۳ء کے انتخابات میں پہلی بار مشتاق اعوان کو صوبائی اسمبلی کی نشست کے لیے ٹکٹ دیا گیا۔ اس بار ملک مشتاق اعوان کو اپنی انتخابی مہم چلانے کے لیے ظفر اقبال ڈار اور غلام علی سرھندی نام کے دو سرمایہ دار میسر آ گئے' جنہوں نے مشتاق اعوان کی انتخابی مہم میں کروڑوں روپیہ جھونک دیا اور اپنے مسلح افراد کی بھاری تعداد کو مشتاق اعوان کے ساتھ کر دیا۔ ملک مشتاق اعوان کی انتخابی مہم پر ڈار اور سرھندی گروپوں نے مشتاق اعوان کی اس یقین دھانی پر اپنا زور لگایا کہ وہ کامیابی کی صورت میں ان گروپوں کو شیخوپورہ کی تمام محصول چونگیاں اور بس اسٹینڈ سونپ دیں گے اور اگر وہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ بن گئے تو پھر ان گروپوں کے دائرہ کار کو لاہور تک پھیلا دیا جائے گا اور راوی کے پل پر واقع ٹول ٹیکس چونگی کا ٹھیکہ بھی دلوا دیا جائے گا۔

مشتاق اعوان پنجاب کے وزیر اعلیٰ تو نہ بن سکے' البتہ پنجاب کے وزیر ہاؤسنگ بن گئے۔ مشتاق اعوان نے وزیر ہاؤسنگ بننے کے بعد شیخوپورہ کے اپنے فنانسر گروپوں کو ہاؤسنگ اسکیموں میں سے نوازنا شروع کیا اور اس دوران انہوں نے ۳۵ کے قریب شیخوپورہ سے تعلق رکھنے والے افراد کو محکمہ ہاؤسنگ میں بھرتی کرایا۔

وٹو حکومت کی معطلی اور پنجاب کے سینئر وزیر مخدوم الطاف کی اچانک وفات کے بعد مشتاق اعوان کو پنجاب کا سینئر وزیر بنا دیا گیا۔ یوں مشتاق اعوان وزیر اعلیٰ سردار عارف نکئی کے مقابلے میں دو نمبر وزیر اعلیٰ کے طور پر سامنے آئے اور انہوں نے وزیر اعظم کی سیاسی مشیر ناہید خان سے مل کر پنجاب پیپلز پارٹی میں باقاعدہ دھڑے بندی کی بنیاد رکھی اور فوائد حاصل کرنے کے لیے پورا زور لگا دیا۔ مشتاق اعوان کے سینئر وزیر بنتے ہی شیخوپورہ کی تمام محصول چونگیاں سرھندی اور ڈار گروپوں کے پاس چلی گئیں اور شیخوپورہ شہر میں واقع محکمہ زراعت کی ملکیتی اراضی پر قبضہ کر کے دکانیں بنا دی گئیں۔ مشتاق اعوان کے حکم پر تعمیر کی جانے والی یہ دکانیں مشتاق اعوان کے قریبی ساتھیوں کو الاٹ کر دی گئیں۔

مشتاق اعوان کے چھوٹے بھائی اشتیاق اعوان نے پورے شہر میں اودھم مچائے رکھا۔

صرف ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر ہسپتال شیخوپورہ میں سے شاکر نام کا ایک ملازم ۳۰ ہزار روپے ماہانہ اشتیاق اعوان کو دیتا۔ ذرائع کے مطابق اس وقت شیخوپورہ شہر میں سب سے زیادہ رہائشی پلاٹ مشتاق اعوان خاندان کی ملکیت میں ہیں۔ مشتاق اعوان کے دیگر بھائی

پلاٹوں کے قبضے دلواتے اور لاکھوں روپیہ کماتے رہے۔ مشتاق اعوان نے اپنے بیٹے کو ایل۔ ڈی۔ اے میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر بھرتی کرا دیا۔ حالانکہ ایل۔ ڈی اے میں ایک طویل عرصہ سے بھرتیوں پر پابندی چلی آ رہی تھی۔

انتظامیہ کو اپنے کنٹرول میں کرنے اور پھر انتظامیہ سے مختلف نوعیت کے کام لینے میں بھی مشتاق اعوان اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ مشتاق اعوان نے پنجاب کے ایک متنازعہ ترین اسسٹنٹ کمشنر رفیق اعوان کی تقرری بطور اے۔ سی شیخوپورہ کرائی اور ان سے پہلا کام اپنی بیٹی کے امتحانات میں نقل کروانے کا لیا۔ مشتاق اعوان نے ضلعی انتظامیہ کو ہدایت کی کہ وہ امتحانی رول نمبر ۳۵۸۹۰ کو علیحدہ کمرہ امتحان دیں اور اس دوران امیدوار کو خصوصی رعایت دی جائے۔ مشتاق اعوان کی بیٹی کے لیے علیحدہ امتحانی کمرے کا بندوبست کیا گیا۔ اس کی شکایت محکمہ تعلیم کو کی گئی تو ۱۰ اپریل کو دو خواتین پر مشتمل سپیشل انسپکشن ٹیم امتحانی مرکز کے معائنہ کے لیے لاہور سے شیخوپورہ پہنچی تو پولیس نے اسے امتحانی مرکز میں داخل ہونے سے روک دیا۔ امتحانی مرکز کے باہر اے۔ سی شیخوپورہ رفیق اعوان کی گاڑی کھڑی تھی اور وہ خود مشتاق اعوان کی بیٹی کے امتحان کی نگرانی کر رہا تھا اور ایک مقامی مجسٹریٹ ملک مسعود امیدوارہ کی مدد کے لیے دوڑتا پھر رہا تھا۔ اس کے بعد محکمہ تعلیم کا دیگر عملہ بھی شیخوپورہ پہنچا تو مشتاق اعوان کی اہلیہ خود آ کر بیٹی کے امتحانی کمرے میں بیٹھ گئیں اور محکمہ تعلیم کے عملہ کو سنگین نتائج کی دھمکیاں دیں۔ اس طرح مشتاق اعوان کی بیٹی نے پورا امتحان نقل کر کے دیا۔

اس وقت صورت حال یوں ہے کہ مشتاق اعوان جو اقتدار حاصل کرنے کے بعد اپنے حمایتی افراد کو فوائد دینے تک محدود تھے۔ انہوں نے باقاعدہ طور پر علاقہ کے مسلح افراد کو اپنے گرد جمع کرنا شروع کر دیا ہے اور خدشہ ہے کہ مشتاق اعوان ان مسلح افراد کو منور منج گروپ کے مسلح افراد سے مقابلہ کے لیے "بھرتی" کر رہے ہیں۔ مشتاق اعوان کی مسلح "فوج" میں شامل ہونے والوں کی اکثریت کا تعلق شیخوپورہ کی بستی عیسائیاں سے ہے۔ واضح رہے کہ شیخوپورہ پولیس اس بستی کو جرائم پیشہ افراد کی بہتات کی وجہ سے "چھوٹا سراب گوٹھ" کے نام سے پکارتی ہے--- اس سے پہلے بستی عیسائیاں کے جرائم پیشہ افراد کی اکثریت رکن قومی اسمبلی منور حسین منج کے ساتھ تھی لیکن شیخوپورہ میں منور منج کی گرتی ہوئی مقبولیت کے باعث جرائم پیشہ افراد مشتاق اعوان اور پنجاب کے وزیر جنگلات رائے اعجاز احمد خان کے گرد جمع ہو رہے ہیں کیونکہ اس وقت شیخوپورہ ضلع میں مشتاق اعوان

Marfat.com

سابق سینئر وزیر پنجاب اور رائے اعجاز احمد خان سابق وزیر جنگلات کو طاقتور ترین سیاسی شخصیات مانا جاتا ہے۔

پنجاب کے سابقہ وزیر جنگلات رائے اعجاز احمد خان کا تعلق خانقاہ ڈوگراں کے ایک گاؤں ماحینانوالہ سے ہے جب کہ اس خاندان کے مخالف گروپ ڈوگر گروپ کا تعلق مقتول ایم۔ پی اے صفدر الحق عرف ججہ ڈوگر گروپ سے ہے۔ دونوں گروپوں میں خونی دشمنی کا سلسلہ گزشتہ بارہ برسوں پر محیط ہے جس میں دیگر کئی افراد کے علاوہ رائے اعجاز کے بڑے بھائی سابقہ ایم۔ پی۔ اے رائے سعید اور سابقہ ایم۔ پی۔ اے صفدر الحق عرف ججہ ڈوگر قتل ہو چکے ہیں۔ اس وقت یہ دونوں گروپ کسی بہت بڑے خونی تصادم کی تیاروں میں مصروف ہیں۔

۷۰ء کے عشرے کے شروع میں رائے احمد حسن نامی ایک زمیندار کمالیہ سے ہجرت کر کے اپنی بیوی کی ملکیتی زمین واقع ماحینانوالہ ضلع شیخوپورہ میں رہائش پذیر ہوا۔ فوراً ہی رائے احمد حسن نے ماحینانوالہ کے پرامن گاؤں میں لوگوں کو آپسی جھگڑوں میں الجھا دیا۔ شروع میں احمد حسن کے تین بیٹے رائے سعید احمد' رائے اعجاز احمد اور رائے ظہیر احمد کاشتکاری میں اپنے باپ کا ہاتھ بٹاتے تھے۔

رائے احمد حسن نے علاقے میں اپنے مخالفین کو قتل کرانا شروع کیا۔ رائے احمد حسن اپنے مسلح آدمیوں سے رات کے اندھیرے میں کسی مخالف کو قتل کراتے اور اگلے روز اس قتل کا مقدمہ کسی دوسرے مخالف خاندان پر درج کرا دیتے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ رائے احمد حسن نے اپنے بوڑھے مخالفین کو مقامی پولیس کے ذریعے گاؤں کے درختوں پر الٹا لٹکا دیا۔

اس علاقہ میں باقاعدہ خونی دشمنیوں کا آغاز اس طرح ہوا کہ موضع ماحینانوالہ میں رائے احمد حسن کے آدمیوں نے گاؤں کے خطیب کے لڑکے اسلم کو مقامی زمیندار خاندان کی بیٹی کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے پکڑ لیا۔ احمد حسن نے یہ فیصلہ دیا کہ دونوں کو نہر کنارے لے جا کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے۔ احمد حسن اپنے آدمیوں کے ہمراہ اس نوجوان لڑکے اور لڑکی کو لے کر قتل کرنے نہر کی طرف لے جا رہا تھا کہ ان افراد میں شامل حسن لاہوریا نامی ایک شخص نے اسلم کو تھپڑ مارنے شروع کر دیئے۔ اسلم نے فوراً اپنی بغل سے پستول نکالا اور حسن لاہوریا کو سر میں گولی مار کر موقع پر ہلاک کر دیا۔ حسن لاہوریے کی ہلاکت کے بعد رائے احمد حسن وہاں سے بھاگ آیا اور لڑکی اور لڑکا بچ گئے۔

یہ قتل ماچھینانوالہ کا پہلا قتل تھا، جس سے رائے خاندان کی دشمنی دیگر مقامی لوگوں کے ساتھ گہری ہوتی چلی گئی۔

اس واقعہ کے بعد حسن لاہوریے کی برادری اعوان برادری رائے خاندان کے ساتھ مل گئی اور رائے گروپ نے اردگرد کے چودھریوں سے جھگڑے شروع کر دیئے۔۔۔۔۔ رائے احمد حسن کا پہلا شکار ضلع شیخوپورہ کا سب سے بڑا زمیندار چودھری محمد علی واہگہ بنا۔۔۔۔ چودھری محمد علی واہگہ کو رائے برادران نے پورے علاقہ میں ذلیل کر کے رکھ دیا۔ محمد علی واہگہ کی فصلیں اجاڑ دی گئیں، مویشی چرا لیے گئے اور اس کی زمینوں پر اگے درخت کاٹ لیے گئے۔ چوددھری محمد علی واہگہ کے ساتھ ظلم و زیادتی نے پورے شیخوپورہ ضلع میں رائے خاندان کا تعارف ایک جارح خاندان کے طور پر کرایا۔

۱۹۸۵ء کے غیر جماعتی انتخابات میں رائے احمد حسن کا بڑا بیٹا رائے سعید احمد خان علاقہ سے ایم۔ پی۔ اے منتخب ہوگیا۔ پورے علاقہ میں کسی کو جرات نہ ہوئی کہ وہ رائے کا مقابلہ کرتا کیونکہ اس صورت میں اس کی اور اس کے خاندان کے جان و مال کے محفوظ رہنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ ایم۔ پی۔ اے بننے کے بعد رائے سعید نے صوبہ کی سطح پر رانا برادری یا راجپوت برادری سے تعلق رکھنے والے سیاست دانوں کو اکٹھا کرنے کی کوشش کی۔ رائے سعید کا پہلا اتحاد قصور کے رانا پھول محمد سے ہوا۔ اس دوران منور حسین منج اور رائے سعید نے بھی اپنی اپنی پگیں تبدیل کر لیں اور ایک دوسرے کے ساتھی بن گئے۔

۱۹۸۵ء کے انتخابات میں علاقہ کی مشہور سیاسی شخصیت عارف اعوان نے رائے خاندان سے مقابلہ کرنا چاہا لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ عارف اعوان نے اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لیے ۸۶ء میں پانچ سو سے زائد مسلح افرد کے ہمراہ رائے سعید خان کے ڈیرے پر حملہ کر دیا۔ لگاتار دو دن تک دونوں گروپ ایک دوسرے پر فائرنگ کرتے رہے اور بالاخر رائے خاندان اپنا گھر بار چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔

رائے سعید نے ایم۔ پی۔ اے بننے کے بعد علاقہ کے تمام جرائم پیشہ افراد کو اپنے گرد اکٹھا کرنا شروع کیا۔ اس دوران اسے ایک مقامی گاؤں گوبند گڑھ کا ایک رہائشی صفدر الحق عرف ببھہ ڈوگر بھی ملا۔ رائے سعید نے صفدر الحق کو پیش کش کی کہ وہ اس کا باڈی گارڈ بن جائے۔ رائے سعید کی اس پیشکش کو ببھہ ڈوگر نے قبول کر لیا اور اپنی لاسنسی بندوق بارہ بور کے ساتھ وہ رائے سعید کے ڈیرے پر چلا گیا۔ گوبند گڑھ میں رہائش پذیر

Marfat.com

صفدر الحق کا خاندان علاقہ میں مویشی چور کے طور پر مشہور تھا اور جس وقت ججبہ ڈوگر رائے سعید کا باڈی گارڈ بنا اس وقت ججبہ ڈوگر تین درجن سے زائد چوری' ڈکیتی اور ناجائز اسلحہ کے مقدمات میں مقامی پولیس کو مطلوب تھا۔ ججبہ ڈوگر کے بارے میں مشہور تھا کہ اس نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ چوریوں کے بعد پولیس کے خوف سے فصلوں میں چھپ کر گزارا ہے۔

رائے سعید نے ایم۔ پی۔ اے بننے کے بعد پورے علاقہ میں اپنے مخالفین کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ رائے سعید کے مسلح آدمی جسے چاہتے' اپنے ڈیرے پر اٹھا لاتے اور بے تحاشہ تشدد کے بعد ہاتھ پاؤں باندھ کر کھیتوں اور سڑکوں کے کنارے پھینک دیتے۔

اس دوران خانقاہ ڈوگراں' ڈھاباں سنگھ اور ماجینانوالہ کے تقریباً دو درجن افراد کو اغوا کر کے بے دردی کے ساتھ قتل کر دیا گیا لیکن تمام مقدمات رائے سعید مخالف لوگوں پر درج کرا دیے گئے۔ اس طرح علاقہ میں رائے خاندان کے بارے میں یہ تصور ابھرا کہ وہ اپنے معمولی مخالف کو بھی قتل کرانے سے گریز نہیں کرتا۔ ذرائع کے مطابق اس دوران پورے پنجاب کے خطرناک اشتہاری ملزمان رائے سعید کے ڈیرے پر جمع ہوئے اور انہوں نے رائے مخالف لوگوں کو تنگ کرنے کے ساتھ ساتھ علاقہ میں چوری اور ڈکیتی کی وارداتیں بھی شروع کر دیں۔

تقریباً ایک سال بعد رائے سعید اور اس کے باڈی گارڈ ججبہ ڈوگر کے درمیان کسی ولایتی بندوق کی ملکیت کے مسئلہ پر جھگڑا ہوگیا۔ اس جھگڑے کے بعد ججبہ ڈوگر اپنے ساتھیوں سمیت رائے سعید سے علیحدہ ہوگیا اور علاقہ میں چھوٹی موٹی وارداتیں کرنے لگا۔

۸۸ء کے انتخابات میں ججبہ ڈوگر نے رائے سعید احمد کے خلاف الیکشن لڑنے کا اعلان کر دیا اور آزاد امیدوار کی حیثیت سے صوبائی اسمبلی کی نشست کے لیے کاغذات نامزدگی جمع کرا دیے۔ جتنے لوگوں کو رائے سعید خاندان سے نقصان پہنچا تھا' انہوں نے اپنے تمام تر وسائل ججبہ ڈوگر پر جھونک دیے۔ علاقہ کے لوگوں میں رائے خاندان کے خلاف اتنی زیادہ نفرت پیدا ہوچکی تھی کہ ججبہ ڈوگر اپنی مقبولیت کے بجائے رائے دشمنی کے سہارے چھ ہزار ووٹوں کی برتری سے الیکشن جیت گیا۔ ججبہ ڈوگر نے یہ الیکشن جیل سے لڑا تھا۔ علاقہ کے لوگ رائے دشمنی میں اتنے آگے جا چکے تھے کہ انہوں نے ججبہ ڈوگر کو جتوانے کے لیے اپنے مویشی تک بیچ ڈالے۔ حالانکہ وہ جانتے تھے کہ وہ ایک بدنام مویشی چور کو ووٹ ڈال رہے ہیں۔

Marfat.com

ایم۔ پی۔ اے منتخب ہو جانے کے بعد ججبہ ڈوگر نے پورے علاقے میں اعلان کر دیا کہ جس کسی کو رائے خاندان نے نقصان پہنچایا ہو' وہ اپنا نام اس کے پاس لکھوا دے اور بدلہ لینے کے لیے تیار ہو جائے۔ اس اعلان کے ایک ہفتہ بعد ججبہ ڈوگر نے اپنے سینکڑوں مسلح ساتھیوں کے ہمراہ رائے خاندان کے ڈیرے پر حملہ کر دیا۔ رائے خاندان اس دوران وہاں سے جا چکا تھا۔ حملہ آوروں نے رائے خاندان کے عالیشان گھر کو مسمار کر دیا' ان کی کھڑی فصلیں کاٹ لیں اور درخت کاٹ لیے۔ رائے خاندان کی ساری اراضی کو مختلف لوگوں نے کاشت کر لیا۔ حتیٰ کہ رائے خاندان کی قبروں کو بھی مسمار کر دیا گیا۔

رائے سعید اپنے چھوٹے بھائی رائے اعجاز کے ہمراہ ضلع اوکاڑہ کے ایک طاقتور سیاست دان شفقت عباس رنبیرہ کے پاس چلا گیا اور اس سے اس کڑے وقت میں پناہ کی درخواست کی' جو شفقت رنبیرہ نے قبول کر لی۔ واضح رہے کہ شفقت رنبیرہ خاندان بھی دشمنی کی بھینٹ چڑھ چکا ہے۔ اور صرف شفقت رنبیرہ زندہ ہے جو ایم۔ پی۔ اے ہونے کے باوجود چوبیں گھنٹے بندوقوں کے سائے میں رہتا ہے۔ ڈوگر برادران نے اوکاڑہ جا کر رائے سعید پر حملہ کیا' جس میں رائے سعید تو زندہ بچ گیا لیکن اس کے تین ساتھی مارے گئے۔

جون ۸۸ء میں رائے سعید اوکاڑہ سے حج کے لیے چلا گیا اور ایک روز لاہور میں دھرمپور ریسٹ ہاؤس سے اپنے مسلح باڈی گارڈز کے ساتھ کار میں صوبائی اسمبلی کی زکوٰۃ عشر کمیٹی کے چیئرمین کا حلف اٹھانے کے لیے آتا ہوا ججبہ ڈوگر نامعلوم افراد کی فائرنگ سے ساتھیوں سمیت قتل ہو گیا۔ ڈوگر برادران نے رائے خاندان کو اس قتل کا ذمہ دار ٹھہرایا اور بدلہ لینے کے لیے حلف اٹھا لیا۔ ججبہ ڈوگر کی وفات سے خالی ہونے والی صوبائی اسمبلی کی نشست پر صفدر الحق عرف ججبہ ڈوگر کے ماموں رشید عرف شیدا ڈبہ کو ٹکٹ دیا گیا۔ شیدا ڈبہ جو علاقہ میں سب سے بدنام مویشی چور مشہور تھا۔ ضمنی انتخاب میں ایم۔ پی۔ اے منتخب ہو گیا۔ اس دوران رائے سعید اور رائے اعجاز کی والدہ کا انتقال ہو گیا تو ججبہ خاندان نے ان کی والدہ کو گاؤں کے قبرستان میں دفن کرنے کی اجازت نہ دی۔ رائے برادران نے اپنی والدہ کو اپنے گھر کے صحن میں دفن کر دیا۔

شیدا ڈبہ ایم۔ پی۔ اے بنا تو اس نے بھی رائے خاندان سے ججبہ ڈوگر کا بدلہ لینے کا اعلان کیا۔ ایک بار پنجاب کے وزیر اعلیٰ میاں نواز شریف شیخوپورہ کا دورہ کرنے گئے تو انہیں ہر تھانے میں ایم۔ پی۔ اے رشید ڈوگر کے نام کی تختی بدمعاش بستہ (ب) کے

Marfat.com

طور پر شکستی ملی تو میاں نواز شریف نے فوراً ایس۔ پی کو حکم دیا کہ تمام تھانوں سے رشید ڈوگر کی بدمعاش بستہ (ب) والی تختی اتار دی جائے۔

رائے سعید نے حج سے واپسی پر اوکاڑہ کو چھوڑ کر ہری پورہ ہزارہ میں پناہ حاصل کر لی اور خاندان سمیت وہاں منتقل ہوگیا۔ جب ڈوگر کے تحصیلدار بھائی سعید الحق اور مقصود الحق نے رائے سعید اور رائے اعجاز کے قتل کی قسم اٹھا رکھی تھی۔ اس لیے وہ دونوں اپنے مسلح آدمیوں کے ہمراہ رائے برادران کو تلاش کرنے لگے۔ سعید الحق اور اس کے ساتھی ایک عرصہ تک ہری پور ہزارہ میں پھل وغیرہ کی ریڑھیاں لگاتے رہے اور رائے خاندان کی رہائش گاہ کو تلاش کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ سعید الحق نے ۹۰ میں ہری پور ہزارہ میں رائے سعید کو قتل کر دیا۔ رائے سعید کو بھی اس کی والدہ کی طرح طاقتور ڈوگر برادران نے قبرستان میں دفن نہ کرنے دیا اور رائے سعید کو گھر کے صحن میں ماں کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ سعید الحق پر مقدمات قائم ہوگئے اور وہ علاقہ غیر میں فرار ہوگیا۔

۹۳ء میں سعید الحق نے رائے سعید کے چھوٹے بھائی رائے اعجاز کے خلاف صوبائی اسمبلی کے انتخابات میں حصہ لیا لیکن رائے اعجاز اس الیکشن میں جیت گیا۔ رائے خاندان کی جیت کے بعد ڈوگر خاندان اس علاقے سے بھاگ گیا۔ سعید الحق دوبارہ علاقہ غیر چلا گیا اور رائے اعجاز کو نئی کابینہ میں جنگلات کا صوبائی وزیر بنا دیا گیا۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ دونوں خاندانوں کے مسلح افراد ایک دوسرے کی گھات میں ہیں اور کسی بھی وقت کوئی بڑا تصادم ہوسکتا ہے۔ رائے اعجاز اگرچہ صوبائی وزیر بن گئے لیکن انہوں نے اپنا گھر جانے کا راستہ بھی تبدیل کر لیا اور ہر وقت درجنوں مسلح افراد کے جھرمٹ میں رہنے لگے۔

شیخوپورہ کے نواح میں دوسری بڑی دشمنی سابقہ گورنر غلام جیلانی کے خاندان اور جنڈیالہ شیر خاں کی کھوکھر برادری کے درمیان تھی جو ۸۸ء سے صلح کے بعد ٹھنڈی ہو کر رہ گئی ہے۔ ۶۵ء میں شروع ہونے والی اس دشمنی میں ایک درجن سے زائد افراد کو قتل کیا گیا اور خان گروپ کو گورنر جیلانی کا مکمل تعاون حاصل رہا۔ خان گروپ کا تعلق مسلم لیگ (ن) سے ہے اور اس کے ایک فرد محمود اکبر خان نے ۹۳ء کے الیکشن میں مسلم لیگ (ن) کے ٹکٹ پر پیپلز پارٹی کے منور حسین منج کے خلاف الیکشن لڑا تھا لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ اس وقت جیلانی اور کھوکھر خاندان مکمل امن کے ساتھ رہ رہے ہیں اور مستقبل قریب میں کسی تصادم کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔

ضلع شیخوپورہ میں ایک اور بڑا سرگرم جرائم پیشہ گروپ "اکرم رائے گروپ" ہے، جو شیخوپورہ کے علاقہ مانانوالہ میں برسرپیکار ہے۔ اس گروپ کی کسی کے ساتھ بظاہر کوئی دشمنی نہیں اور اس گروپ کا دائرہ کار ڈکیتی اور کرائے کے قتلوں تک محدود ہے۔ اکرم رائے گروپ کو پنجاب کی ایک بڑی مقبول سیاسی شخصیت اور سابقہ اسمبلی کے سابقہ عہدیدار کی حمایت حاصل ہے۔ کیونکہ یہ اعلیٰ شخصیت بھی اکرم رائے کی برادری سے تعلق رکھتی ہے۔ اکرم رائے گروپ کا ایک رشتہ دار جو ایک حساس ادارے کا ملازم ہے، وہ پنجاب کی اس سیاسی شخصیت کے ساتھ وابستہ رہا ہے اور قاتلوں کی مکمل پشت پناہی کرتا ہے۔ اکرم رائے گروپ مسلح وارداتوں میں بے گناہ لوگوں کو قتل کر دیتا ہے اور اب تک تقریباً سات افراد اس گروپ کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔ اکرم رائے گروپ کی وجہ سے علاقہ میں ایک دہشت کا عالم ہے اور لوگ سرشام ہی اپنے گھروں میں دبک جاتے ہیں۔ جب کہ اس گروپ کے مسلح افراد علاقے میں ڈکیتی اور راہزنی کی وارداتیں کرتے رہتے ہیں۔ پنجاب پولیس کے ایک ترجمان کے مطابق اکرم رائے گروپ کی "کارکردگی" کے بارے میں گزشتہ دنوں ایک شکایت گورنر پنجاب تک بھی پہنچی تھی، جس میں پنجاب کی اس سیاسی شخصیت کے ملوث ہونے کا الزام لگایا گیا تھا۔ گورنر نے اس سیاسی شخصیت سے ملاقات کر کے اس تک یہ شکایت منتقل کر دی تھی۔ کیونکہ شکایت کنندہ بھی پیپلز پارٹی کا رکن اسمبلی تھا اور اس نے گورنر کو اسمبلی سے استعفیٰ دینے کی دھمکی دی تھی۔

Marfat.com

مراعات کی آڑ میں قومی خزانہ پر ڈاکہ

منتخب نمائندوں اور حکمران طبقہ کی شاہ خرچیاں ایک بار پھر اس وقت موضوع بحث بن گئیں جب ۱۱ جنوری ۹۶ء کو صدر فاروق احمد خان لغاری نے آئین کے آرٹیکل نمبر ۸۹ کے تحت حاصل شدہ اختیارات استعمال کرتے ہوئے اپنی اور اراکین پالیمنٹ کی تنخواہوں، مراعات اور پنشن میں نظرثانی کا آرڈیننس جاری کر دیا۔ صدر کی طرف سے جاری کردہ آرڈیننس چار ماہ تک نافذالعمل ہوگا، بعدازاں پارلیمنٹ سے اس کی منظوری لینا ضروری ہوگا۔

پاکستان کی تاریخ میں شاید پہلی بار ایسا ہوا کہ ایک ترمیمی آرڈیننس کے ذریعے صدر سمیت اراکین پارلیمنٹ کی تنخواہوں اور مراعات کی شرح میں یکمشت سو فیصدی اضافہ کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ آرڈیننس جاری کرتے ہوئے یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ یہ ۲۵ اکتوبر ۹۴ء سے لاگو تصور کیا جائے گا۔ چنانچہ ایسا بھی پہلی بار ہوا کہ کسی ترمیمی اور خصوصاً تنخواہ اور مراعات سے متعلقہ آرڈیننس کی مدت کو اتنا طویل کر دیا گیا ہو۔ اس فیصلے سے گویا اس آرڈیننس کی اولین آئینی مدت ۴ ماہ کے بجائے ۲۰ ماہ ہوگئی جو کسی بھی پارلیمنٹ کی منظوری کی محتاج نہیں۔ جبکہ اکثر یہی ہوتا ہے کہ زیادہ تر متنازعہ آرڈیننس کو پارلیمنٹ کے اجلاس سے کچھ وقت پہلے یا بعد میں جاری کیا جاتا ہے اور اس کی مدت ختم ہوتے ہی پارلیمنٹ میں بھیجنے کی کوفت اٹھانے کے بجائے دوبارہ "ترمیمی" کا دم چھلا لگا کر جاری کر دیا جاتا ہے۔

اراکین پارلیمنٹ، صدر اور وزیراعظم کی تنخواہوں، مراعات اور الاؤنس میں اضافہ اور نظرثانی کا مذکورہ آرڈیننس ملکی تاریخ کا سترہواں آرڈیننس تھا جو مختلف ادوار میں جاری ہوئے۔ اس سے پہلے مختلف آرڈیننسوں کے ذریعے صدر، وزیراعظم اور اراکین پارلیمنٹ

Marfat.com

کی تنخواہوں اور مراعات میں معمولی نوعیت کا اضافہ کیا جاتا رہا لیکن ۱۱ جنوری ۹۶ء کو جو صدارتی آرڈیننس جاری کیا گیا' اس میں تنخواہوں اور مراعات کے بارے میں جو فیصلے کیے گئے ان کی مثال پہلے نہیں ملتی۔

اس کے علاوہ گذشتہ ۲۵ ماہ میں ۱۰۹ اراکین پارلیمنٹ نے سرکاری خرچ پر غیر ملکی دورے کیے جس پر حکومت کے کروڑوں روپے خرچ ہوئے۔ وزیراعظم کے ہمراہ غرملکی دوروں پر ۲۵ سینیٹرز' ۷۷ اراکین قومی اسمبلی اور ۷ اراکین صوبائی اسمبلی کو سرکاری خرچ پر بھیجا گیا جن میں حکومتی ارکان کے ساتھ حکومت کی اتحادی جماعتوں کے ارکان اور ایک اپوزیشن رکن بھی شامل تھا۔

متذکرہ بالا ترمیمی آرڈیننس سے پہلے صدر پاکستان ۶۵ ہزار روپے سالانہ تنخواہ وصول کر رہے تھے جو بڑھا کر ۲ لاکھ ۷۶ ہزار روپے سالانہ کر دی گئی اور یوں صدر کی تنخواہ میں ایک دم ۲ لاکھ ۱۱ ہزار روپے کا اضافہ ہوگیا۔ صدارتی ایکو ہمنٹ الاؤنس ۵ ہزار روپے سے بڑھا کر ۲۰ ہزار روپے کر دیا گیا۔ فاضل اخراجات کے الاؤنس کی مد میں صدر کو ملنے والی ڈیڑھ لاکھ روپے کی رقم بڑھا کر ۶ لاکھ روپے کر دی گئی۔ صدر کا سٹاف الاؤنس جو کہ آرڈیننس کی آمد سے پہلے ۱۱ لاکھ ۲۰ ہزار روپے تھا' سو فیصد بڑھا کر ۲۲ لاکھ ۵۰ ہزار روپے کر دیا گیا۔ کنٹریکٹ ر گارڈن الاؤنس ۶ لاکھ روپے سے بڑھا کر ۱۵ لاکھ روپے کر دیا گیا۔ سفری اخراجات کی مد میں پہلے صدر مملکت کو ۳ لاکھ روپیہ حاصل تھا' جو بڑھا کر ۶ لاکھ روپیہ کر دیا گیا۔ اسی طرح صدارتی رہائش گاہ کی دیکھ بھال کے اخراجات ۱۶ لاکھ ۸۰ ہزار روپے سالانہ سے بڑھا کر ۲۰ لاکھ ۵۰ ہزار روپے کر دیئے گئے۔

صدر پاکستان کو حاصل مراعات کی مد میں جو اضافہ کیا گیا اس میں ان کو حاصل رہائشی الاؤنس ۴۸ ہزار روپے سالانہ کو بڑھا کر ایک دم ۲ لاکھ ۷۶ ہزار روپے کر دیا گیا۔ ذاتی استعمال کے لیے مختص کی جانے والی رقم سالانہ ۵۰ ہزار روپے سے بڑھا کر ۲ لاکھ روپے کر دی گئی۔ صدر کو اختیار دیا گیا کہ وہ کسی بھی ماڈل کی کار خرید سکتے ہیں۔ سرکاری رہائش گاہ کے لیے فرنیچر' سرکاری کار' بحری جہاز' ہوائی جہاز کے استعمال اور اشیائے خوردونوش کی کوئی حد مقرر نہ کی گئی۔ کسی حادثہ یا موت کی صورت میں معاوضہ ۲ لاکھ ۵۰ ہزار روپے سے بڑھا کر ایک دم ۱۰ لاکھ روپے کر دیا گیا۔ یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ صدر مملکت کے کسی حادثے میں زخمی ہونے کی صورت میں ان کو معاوضہ کے طور پر دی جانے والی رقم کی حد کا تعین حکومت وقت کرے گی۔ صدر کے لیے تاحیات پنشن کی شرح ۶۰ ہزار روپے

Marfat.com

سے بڑھا کر ایک لاکھ ۲۰ ہزار روپے کر دی گئی۔

اس طرح سال بھر میں صدر کو حاصل ہونے والی تنخواہ اور مراعات وغیرہ کی رقم فوری طور پر ۹۱ لاکھ ۴۷ ہزار روپے ہوگئی جو مذکورہ صدارتی آرڈیننس کے اجراء سے پہلے ۱۰ جنوری ۱۹۹۶ء تک ۴۴ لاکھ ۲۸ ہزار روپے سالانہ تھی۔ لہٰذا صدر کے جاری کردہ نئے آرڈیننس کے مطابق جو ۲۵ اکتوبر ۱۹۹۴ء سے لاگو تصور کیا جاتا ہے، حکومت صرف صدر مملکت کی ۶۳ لاکھ ۲۵ ہزار ۳ سو ۳۳ روپے کی مقروض ہوگئی۔ صدر کے جاری کردہ مذکورہ آرڈیننس کے بعد عوامی نمائندگان کی تنخواہوں اور مراعات میں جو اضافہ ہوا، اس کے مطابق سیکشن ۳ میں جن کی تنخواہ ۳ ہزار روپے ماہانہ تھی وہ بڑھ کر ۵ ہزار روپے ماہانہ ہوگئی۔ اراکین پارلیمنٹ کو اندرون ملک سفر کے لیے پی آئی اے اکانومی کلاس کی جگہ بزنس کلاس کے ٹکٹ دے گا۔ سرکاری دورے پر جانے والا ہر رکن ہوائی جہاز کی فرسٹ کلاس میں سفر کرے گا۔ ہر رکن قومی اسمبلی کو اس کے انتخابی حلقے کے نزدیک ترین ایئرپورٹ سے اسلام آباد تک کے لیے سالانہ ۹ ہوائی ٹکٹ جاری کیے جائیں گے اور "ووچرز" کے طور پر ۳۵ ہزار روپے نقد اس کے علاوہ ہوں گے۔

وزیراعظم، قائد حزب اختلاف اور وفاقی وزراء کو مساوی تنخواہ اور مراعات حاصل ہوں گی۔ اس کے علاوہ چیئرمین سٹینڈنگ کمیٹی کو منتخب رکن کی تنخواہ، الاؤنس اور دیگر سہولیات کے علاوہ ہر ماہ ۷۷۰۰ روپے بھی دیئے جائیں گے اور وہ گریڈ ۱۷ کا ایک پرائیویٹ سیکرٹری، گریڈ ۱۵ کا ایک سٹینوگرافر، سکیل ۴ میں ایک ڈرائیور اور سکیل ایک میں نائب قاصد بھی رکھ سکے گا۔ حکومت اس کے دفتری ٹیلی فون کا ۵ ہزار روپے ماہانہ کا بل بھی ادا کرے گی اور اسے ۱۳ سو سی سی ایک کار اور ۳۶۰ لیٹر پٹرول ماہانہ ملے گا۔ سینٹ کی سرگرم کمیٹیاں بھی سٹینڈنگ کمیٹیاں شمار ہوں گی۔

صدارتی آرڈیننس میں وزیراعظم کی تنخواہ ۵ ہزار روپے ماہانہ سے ۲۲ ہزار روپے ماہانہ کر دی گئی۔ گیس، بجلی کے استعمال کے اخراجات کے سلسلے میں سیکشن (۱۱) کی ذیلی شق (۱) میں ۲ لاکھ ۵۰ ہزار کی جگہ ایک کروڑ روپیہ کر دیا گیا۔ سیکشن (۱۲) کی ذیلی شق (۸) میں ۵ ہزار کی جگہ ۲۲ ہزار کر دیا گیا جبکہ سیکشن (۱۴) کی ذیلی شق (۱) کی شق اے میں ۵۰ ہزار کی جگہ ۲ لکھ روپیہ کر دیا گیا۔ کالم (۱) میں ۴ لاکھ کی جگہ ۱۰ لاکھ کالم (۳) میں ساڑھے ۱۵ لاکھ کی جگہ ۲۵ لاکھ کر دیا گیا۔ وزیراعظم ہاؤس کی سالانہ تزئین و آرائش کے لیے ۱۲ لاکھ کی جگہ ساڑھے ۱۳ لاکھ روپے مختص کر دیئے گئے۔ سیکشن ۱۶ کے بعد نئے سیکشن ۱۶ اے کے

Marfat.com

تحت جب بھی سرکاری ملازمین کی تنخواہوں میں نظرثانی کی جائے گی، وزیراعظم کی تنخواہ، الاؤنس اور مراعات میں خودبخود اضافہ ہو جائے گا۔ نئے ترمیمی آرڈیننس میں شامل سیکشن (۳) کی ذیلی شق کے مطابق وفاقی وزیر اور وزیر مملکت کی رہائش گاہ پر سرکاری طور پر سالانہ ایک لاکھ روپے خرچ کیے جائیں گے۔ دوران سفر وفاقی وزیر کو سرکاری ٹیلی فون کی سہولت ملے گی۔ چیئرمین سٹینڈنگ کمیٹی اور سپیکر قومی اسمبلی کو ۵ لاکھ روپے ماہانہ کے صوابدیدی اخراجات کا اختیار حاصل ہوگا۔ اس ضمن میں دلچسپ بات یہ ہے کہ جب سرکاری ملازمین کی تنخواہیں بڑھیں گی تو سٹینڈنگ کمیٹیوں کے چیئرمین اور سپیکر کی تنخواہیں ایک بار پھر خودبخود بڑھ جائیں گی۔ ۱۹۹۵ء کی دفعہ ایل ۳۳ میں ڈپٹی چیئرمین اور ڈپٹی سپیکر کی تنخواہوں، الاؤنس اور مراعات میں اضافے کے لیے ترامیم کی گئیں جس کے تحت سیکشن (۳) میں ۶ ہزار کی جگہ ۱۸ ہزار کر دیا گیا۔ ڈپٹی سپیکر کے لفظ کے ساتھ ان کے اہل خانہ کا اضافہ بھی کر دیا گیا۔ ڈپٹی سپیکر اور ڈپٹی چیئرمین کو ۴ لاکھ روپیہ فی کس ماہانہ صوابدیدی فنڈ استعمال کرنے کا اختیار بھی دیا گیا اور جب عام سرکاری ملازمین کی تنخواہوں میں اضافہ ہوگا تو ڈپٹی سپیکر اور ڈپٹی چیئرمین کی تنخواہوں میں بھی اضافہ کر دیا جائے گا۔ اس طرح صدر کے اس ترمیمی آرڈیننس کے باعث جو ۲۵ اکتوبر ۹۴ء سے لاگو تصور کیا جائے گا، قومی خزانے پر اربوں روپے کا بوجھ پڑے گا جو ہر رکن اسمبلی، وفاقی وزیر، قائد حزب اختلاف، وزیراعظم، سٹینڈنگ کمیٹیوں کے چیئرمینوں، ڈپٹی چیئرمینوں اور صدر مملکت کو پہلے سے سو فیصد زیادہ تنخواہوں، مراعات، الاؤنس اور پنشن وغیرہ کی شکل میں بغیر کسی لمحے کی رکاوٹ کے لگاتار ۲۰ ماہ تک پیسے ادا کرے گا اور ملکی معیشت جس کی حالت پہلے ہی دگرگوں ہے مزید ابتر صورتحال کا شکار ہو جائے گی۔

قومی خزانے پر اراکین پارلیمنٹ، صدر اور وزیراعظم کے علاوہ چاروں صوبائی حکومتوں میں شامل اراکین، وزراء اور مشیروں کی فوج بھی مختلف نوعیت کی ترامیم کے ذریعے ہر سال اپنی تنخواہوں، مراعات اور الاؤنس بڑھاتی ہے جس سے انہیں بے شمار مالی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

پنجاب میں اضافہ کا نوٹیفکیشن

۱۳ فروری ۹۵ء کو پنجاب کے اس وقت کے وزیر اعلیٰ وٹو کی صدارت میں صوبائی کابینہ نے جو فیصلے کیے، ان کی رو سے وزیر اعلیٰ اور وزراء کی تنخواہوں، مراعات اور الاؤنسز

Marfat.com

ایکٹ ۱۹۷۵ء میں ترمیم کی گئی اور وزیر اعلیٰ سمیت صوبائی وزراء کی تنخواہوں، مراعات اور الاؤنسز کی نئی شرح مقرر کی گئی۔

۱۔ **تنخواہ:** وزیر اعلیٰ جو پہلے ۶ ہزار روپے ماہوار تنخواہ لیتا تھا، اس کو بڑھا کر ۲۱ ہزار روپے ماہوار کر دی گئی جب کہ صوبائی وزیر کی تنخواہ ۵ ہزار سے بڑھا کر ۱۸ ہزار روپے کر دی گئی۔

۲۔ **ایکویپمنٹ الاؤنس:** وزیر اعلیٰ کے اس الاؤنس کی مد میں ۳ ہزار روپے کی جگہ ۱۵ ہزار روپے کا اضافہ کیا گیا جب کہ صوبائی وزیر کو اس الاؤنس کے طور پر ۳ ہزار کے بجائے ۵ ہزار دینے کا فیصلہ ہوا۔

۳۔ **فاضل اخراجات کے الاؤنس:** وزیر اعلیٰ کے اس الاؤنس کی رقم ۴ ہزار کو بڑھا کر ۱۰ ہزار روپے کر دیا گیا جب کہ صوبائی وزیر کے اس الاؤنس کو ۳ ہزار کے بجائے ۶ ہزار روپیہ کر دیا گیا۔

۴۔ **سرکاری رہائش گاہ:** سرکاری رہائش گاہ کی تزئین و آرائش کے لیے وزیر اعلیٰ کے فنڈ کو ۶۰ ہزار سے بڑھا کر ایک لاکھ روپے کر دیا گیا جب کہ صوبائی وزیر کے اس فنڈ کو ۸ ہزار سے ۱۵ ہزار روپے کر دیا گیا۔

۵۔ **سفر خرچ:** اگر صوبائی وزیر یا وزیر اعلیٰ سڑک کے ذریعے سفر کریں تو ۵ روپے فی کلومیٹر کے حساب سے ان کو سفر خرچ دیا جائے گا۔

۶۔ **حادثہ:** صوبائی وزیر اعلیٰ کو حادثہ یا موت کی صورت میں صوبائی حکومت ۳ لاکھ روپیہ ادا کرے گی۔

۷۔ **روزانہ الاؤنس:** وزیر اعلیٰ یا صوبائی وزیر کو سرکاری مصروفیات کے دوران ۴۵۰ روپے "روزانہ الاؤنس" کے طور پر ادا کیا جائے گا۔

۸۔ **چھٹی کی صورت میں:** وزیر اعلیٰ کو چھٹی لینے کی صورت میں ۲۱ ہزار روپیہ اور صوبائی وزیر کو ۱۸ ہزار روپیہ ادا کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ وہ دیگر تمام سہولتیں بھی وزیر اعلیٰ اور صوبائی وزیر کو حاصل ہوں گی، جو عام اراکین صوبائی اسمبلی کو حاصل ہیں۔

Marfat.com

اب تک جاری ہونے والے آرڈیننس اور ایکٹ

ملکی تاریخ میں صدر' وزیراعظم اور اراکین پارلیمنٹ کی تنخواہوں' مراعات اور الاؤنس میں نظر ثانی کے لیے جاری ہونے والے آرڈیننس اور ایکٹ:

۱- ۱۹۶۲ء میں ممبران قومی اسمبلی کی تنخواہوں کا ایکٹ پاس ہوا۔

۲- ۶۵-۱۹۶۳ء میں ممبران قومی اسمبلی کی تنخواہوں میں اضافے کا آرڈیننس جاری ہوا۔

۳- ۱۹۶۶ء میں ممبران قومی اسمبلی کی تنخواہوں اور الاؤنس کا ایک اہم ایکٹ پاس ہوا۔

۴- ۱۹۷۶ء میں صدر' وزیراعظم' چیئرمین اور سپیکر کی تنخواہوں اور الاؤنس کا ایکٹ پاس ہوا۔

5- ۱۹۷۷ء ممبران قومی اسمبلی کے استحقاق' تنخواہ اور الاؤنس کا ایکٹ جاری ہوا۔

۶- ۱۹۸۳ء میں صدر کی پنشن کا آرڈیننس جاری ہوا۔

۷- ۱۹۸۸ء میں ممبران پارلیمنٹ کی تنخواہوں اور الاؤنس کا ترمیمی ایکٹ پاس ہوا۔

۸- ۱۹۹۰ء کو وزیراعظم کی تنخواہ' الاؤنس اور دیگر مراعات میں اضافہ کا ترمیمی آرڈیننس جاری کیا گیا۔

۹- ۱۹۹۳ء میں صدارتی پنشن کا آرڈیننس تین بار جاری ہوا۔

۱۰- ۱۹۹۳ء ہی میں ممبران پارلیمنٹ کی تنخواہوں اور الاؤنس میں اضافے کا ترمیمی آرڈیننس جاری کیا گیا۔

۱۱- ۱۹۹۴ء میں صدر اور وزیراعظم کی پنشن کا آرڈیننس جاری ہوا۔

۱۲- ۱۹۹۵ء میں ممبران پارلیمنٹ کی تنخواہوں اور الاؤنس کا آرڈیننس جاری ہوا۔

۱۳- ۱۹۹۵ء میں وزیراعظم کی پنشن کا ترمیمی آرڈیننس جاری ہوا۔

۱۴- ۱۹۹۵ء ہی میں دوبارہ وزیراعظم کی پنشن کا ترمیمی آرڈیننس جاری ہوا۔

۱۵- ۱۹۹۶ء میں صدر' وزیراعظم اور اراکین پارلیمنٹ کی تنخواہوں' مراعات اور الاؤنس کا ترمیمی آرڈیننس جاری ہوا۔

پنجاب کے وزراء' معاونین خصوصی اور مشیران کے ماہانہ اخراجات کا تخمینہ

صوبہ پنجاب کے سابق وزراء کی کل تعداد ۳۶ تھی۔ جب کہ معاونین خصوصی کی

Marfat.com

تعداد ۲۸ اور مشیر صاحبان کی تعداد ۳۹ تھی۔ ان کل ۱۰۳ حضرات کے ماہانہ اخراجات کا تخمینہ مندرجہ ذیل شیڈول سے ظاہر ہے:

نمبر شمار	اخراجات	وزیر	معاون خصوصی	مشیر
۱ -	تنخواہ	۱۸۰۰۰ روپے	۱۸۰۰۰ روپے	۱۵۰۰۰ روپے
۲ -	کرایہ مکان	۱۵۰۰۰ "	۱۵۰۰۰ "	۱۵۰۰۰ "
۳ -	تواضع الاؤنس	۶۰۰۰ "	۶۰۰۰ "	۳۰۰۰ "
۴ -	گاڑی ڈرائیور کی تنخواہ	۳۰۰۰ "	۳۰۰۰ "	۳۰۰۰ "
۵ -	گاڑی پٹرول	۱۰۰۰۰ "	۱۰۰۰۰ "	۱۰۰۰۰ "
۶ -	گاڑی مرمت	۵۰۰۰ "	۵۰۰۰ "	۵۰۰۰ "
۷ -	ٹیلی فون گھر	۱۰۰۰۰ "	۱۰۰۰۰ "	۱۰۰۰۰ "
۸ -	ٹیلی فون دفتر	۱۰۰۰۰ "	۱۰۰۰۰ "	۱۰۰۰۰ "
۹ -	دوران اسمبلی الاؤنس	۲۲۰۰ "	۲۲۰۰ "	۲۲۰۰ "
۱۰ -	متعلقہ تعینات عملہ تنخواہ	۲۳۰۰۰ "	۲۳۰۰۰ "	۲۳۰۰۰ "
۱۱ -	عملے کا ٹی اے / ڈی اے	۳۰۰۰ "	۳۰۰۰ "	۳۰۰۰ "
		۱۰۵۲۰۰ روپے	۱۰۵۲۰۰ روپے	۹۹۲۰۰ روپے

پنجاب کے صوبائی بجٹ ۹۶-۱۹۹۵ء میں صوبائی وزراء مشیران اور معاونین خصوصی کی گاڑیوں کے پٹرول کے خرچ کی مد میں ۵۶ لاکھ روپے کی رقم مختص کی گئی تھی جو صرف چھ ماہ میں ہی ختم ہوگئی تو ایس اینڈ جی اے ڈی نے محکمہ خزانہ سے وزراء' مشیران اور معاونین خصوصی کے لیے پٹرول کی مد میں مزید ۸۰ لاکھ روپیہ منظور کرا لیا اور ان حضرات کی گاڑیوں کی دیکھ بھال کے لیے ۳۰ لاکھ روپے کی اضافی گرانٹ کی بھی منظوری لے لی۔ محکمہ ایس اینڈ جی اے ڈی کے پاس ۱۹۰ گاڑیاں تھیں جب کہ نئے وزراء کے لیے ۲۰ قیمتی گاڑیاں مزید خریدی گئیں جن کی مالیت ڈیڑھ کروڑ روپے سے زائد تھی۔ اس کے علاوہ وزیر اعلیٰ کے پاس ۶۴ انتہائی قیمتی گاڑیوں کا الگ فلیٹ موجود تھا۔

صوبائی وزراء' مشیران اور معاونین خصوصی کی طرف سے صوبائی محکمہ خزانہ پر جو سب سے بھاری بوجھ پڑتا ہے' وہ ان کے سرکاری اور نجی ٹیلی فون بل ہیں۔ سرکاری طور پر جن کی رقم کا تعین دس دس ہزار روپے ماہانہ ہے لیکن شاید ہی کبھی ایسا ہو کہ کسی ایک وزیر' مشیر یا معاون خصوصی کا کم سے کم ٹیلی فون بل بھی ۲۵ ہزار روپے ماہانہ سے کم آیا

Marfat.com

ہو' جو ہر صورت میں صوبائی حکومت کو ادا کرنا ہے۔

صدارتی آرڈیننسوں کی ۱۰ سالہ تاریخ

☆ - ۸۵ سے ۹۵ تک کل ۴۶۰ آرڈیننس جاری ہوئے۔ ان میں ۱۵۲ آرڈیننس پارلیمنٹ نے منظور کیے۔

☆ - مسلم لیگ کے دونوں ادوار میں ۸۸ آرڈیننس آئے۔

☆ - بے نظیر بھٹو کے دونوں ادوار میں ۲۲۰ آرڈیننس آئے۔

☆ - عبوری حکومتوں نے کل ۱۰۰ آرڈیننس جاری کیے۔

☆ - ۸۶ء میں صرف ایک آرڈیننس جاری ہوا۔

☆ - عوامی نمائندگی کے بارے میں ۲۵ آرڈیننس آئے۔

☆ - پارلیمنٹ نے ۸۵ء میں ۲۲' ۸۶ء میں ۵' ۸۷ء میں ۱۵' ۸۸ء میں ۶' ۸۹ء میں ۷' ۹۰ء میں ۷' ۹۱ء میں ۲۳' ۹۲ء میں ۳۰' ۹۳ء میں ۱۰' ۹۴ء میں ۲۳ اور ۹۵ء میں ۴ آرڈیننس منظور کیے۔

☆ - آرڈیننسوں کے ذریعے حکومت کرنے میں پیپلز پارٹی حکومت کے دونوں ادوار میں سب سے زیادہ آرڈیننس جاری کرنے کا ریکارڈ قائم ہوا۔

☆ - ۸۵ء سے ۲۹ مئی ۸۸ (جونیجو دور حکومت) ۱۰ آرڈیننس جاری ہوئے۔

☆ - ۲ دسمبر ۸۸ء تا ۲ اگست ۹۰ء (بے نظیر دور حکومت) ۱۸ آرڈیننس جاری ہوئے۔

☆ - ۶ نومبر ۹۰ء تا ۱۸ اپریل ۹۳ء (نواز شریف دور حکومت) ۷۸ آرڈیننس جاری ہوئے۔

☆ - ۱۹ اکتوبر ۹۳ء تا ۳۱ دسمبر ۹۵ء (بے نظیر دور حکومت) اب تک ۲۰۲ آرڈیننس جاری ہو چکے ہیں۔

☆ - ضیاء الحق' جتوئی' مزاری اور معین قریشی کے عبوری ادوار میں ۱۰۰ آرڈیننس جاری ہوئے۔

Marfat.com

پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ میں کروڑوں کے گھپلے

پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کے چیئرمین' سیکرٹری اور ڈائریکٹر نے بچوں کی نصابی کتب کی طباعت کے لیے وزیر تعلیم پنجاب ریاض فتیانہ کی فرمائش پر فیصل آباد کے ایک غیر رجسٹرڈ پبلشر (جو کسی بھی لحاظ سے ٹیکسٹ بک بورڈ کی شرائط پر پورا نہیں اترتا) کو دینیات جماعت پنجم' اردو جماعت پنجم اور سائنس جماعت دوم کی کتب کے پازیٹو اور فرمے وغیرہ دے دیے تاکہ وہ مذکورہ کتب کو جعلی طور پر گھٹیا کاغذ اور مواد کے ساتھ شائع کر کے بورڈ کے رجسٹرڈ شدہ پبلشروں سے پہلے جعلی کتاب مارکیٹ میں خصوصاً فیصل آباد' جھنگ' سرگودھا اور دوسرے علاقوں میں تقسیم کر دے۔ گزشتہ سال پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ نے دینیات جماعت پنجم کی ۱۴ لاکھ ۲۵ ہزار کتب کی طباعت کے لیے اپنے رجسٹرڈ شدہ پبلشروں میں سے ۱۴ پبلشروں کو ان کے کوٹے کے تناسب سے ٹھیکہ دیا اور اس کتاب کی کل مالیت تقریباً ا کروڑ ۲۰ ہزار روپے تھی لیکن جعلسازوں اور خصوصاً مذکورہ بالا قسم کے جعلسازوں کی وجہ سے پبلشر نے اردو پنجم جعلی طور پر چھاپ دی۔ اس کتاب کی طباعت ۱۰ لاکھ ۲۵ ہزار کی تعداد میں ہوئی اور ٹیکسٹ بک بورڈ کے ۲۷ پیشہ ور رجسٹرڈ پبلشروں نے اس کو اپنی اپنی اہلیت کے تناسب کے تحت حاصل شدہ تعداد سے شائع کیا۔ اس کتاب کی کل مالیت تقریباً ایک کروڑ ۶۵ لاکھ روپے تھی۔

یہ کتاب بھی فیصل آباد اور لاہور میں ٹیکسٹ بک بورڈ کی مجاز انتظامیہ خصوصاً چیئرمین بورڈ' سیکرٹری بورڈ' ڈائریکٹر (ٹیکنیکل اور ڈائریکٹر انسانیات) کی ملی بھگت سے بڑی تعداد میں گھٹیا کاغذ اور مواد کے ساتھ غیر قانونی طور پر چھپی جب کہ گزشتہ سال کی شائع شدہ کتب کی سالانہ فروخت کا دورانیہ ختم ہونے کو تھا مذکورہ کتاب کی تقریباً ۶ لاکھ کاپیاں اردو بازار لاہور میں مختلف پبلشروں کے سٹوروں میں پڑی تھیں۔ اسی طرح تیسری کتاب

Marfat.com

جس کے پازیٹو اور دوسرا طباعتی سامان مبینہ طور پر بورڈ احکام اور محکمہ تعلیم کی مقتدر شخصیت نے فیصل آباد کے ایک رجسٹرڈ پبلشر کو دیا۔ وہ تھی سائنس جماعت دوم۔ یہ کتاب بورڈ کے رجسٹرڈ شدہ ۹۰ پبلشروں نے ۱۰ لاکھ ۷۲ ہزار کی تعداد میں شائع کی اور اس کتاب کی مالیت تقریباً ایک کروڑ روپے تھی۔ لیکن بہت زیادہ تعداد میں جعلی چھپ جانے کی وجہ سے یہ کتاب مختلف پبلشروں کے پاس تقریباً ۵ لاکھ کی تعداد میں پڑی رہی۔ جعلساز پبلشروں نے پرائمری جماعتوں کی ان کتب کو گھٹیا ترین نیوز پرنٹ پر چھاپ دیا جب کہ رجسٹرڈ پبلشروں نے یہ کتاب سفید کاغذ پر شائع کی۔ اس کے علاوہ فیصل آباد کے مذکورہ بالا جعلی پبلشر نے پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کے ملکیتی لاکھوں روپے کے پازیٹو اور فرمے وغیرہ بھی واپس کرنے سے انکار کر دیا۔ حالانکہ بورڈ کتب کی اشاعت کے بعد رجسٹرڈ پبلشروں کو پازیٹو اور فرمے جمع کروانے کے بعد طبع شدہ کتب کے سیل آرڈر جاری کرتا ہے۔ جب کہ مذکورہ پبلشر اس امید پر پازیٹو اور فرمے واپس نہیں کیے کہ وہ آئندہ سال بھی وسیع پیمانے پر پرائمری جماعتوں کی مذکورہ تینوں کتب کو جعلی شائع کرے گا۔ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ ان پازیٹو اور فرموں کی واپسی کے لیے قانونی چارہ جوئی بھی نہیں کر سکتا اور نہ ہی اس پبلشر پر کوئی پابندی عائد کر سکتا ہے جب کہ الٹا بورڈ کے اعلیٰ حکام کو یہ خدشہ ہے کہ فیصل آباد جعلسازی کیس اگر افشا ہو گیا تو سبکی ہو گی۔

اسی نوعیت کی ایک اور مثال یہ ہے کہ ۹۵ء کے شروع میں چیئرمین ٹیکسٹ بک بورڈ زاہد حسین کاظمی' ڈائریکٹر (ٹیکنیکل) ڈاکٹر شیرازی اور ڈائریکٹر (انسانیات) کبیر ہاشمی نے اردو بازار لاہور کی ایک دکان پر چھاپا مارا۔ اس وقت دکان سے ملحق سٹور میں جماعت اول کی ریاضی کی کتاب جو کہ جعلسازی سے ۴۰ ہزار کی تعداد میں سفید کاغذ کی بجائے نیوز پرنٹ پر چھاپی گئی تھی' پڑی تھی۔ مذکورہ چھاپہ مار ٹیم نے ۳ لاکھ ۴۴ ہزار روپے مالیت کی ان جعلی کتب میں سے ۴ کتب بطور نمونہ ساتھ لے لیں اور مقامی رجسٹرڈ پبلشروں سے سخت ترین کاروائی کا وعدہ کر کے چلے گئے لیکن کچھ بھی نہ ہو سکا جب کہ مذکورہ ۴۰ ہزار کتب فروخت ہو گئیں۔

پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ جو ۱۹۶۳ء سے ملک بھر کی کاغذ کی ملوں سے پہلی سے بارہویں جماعت تک کی ۶۰۰ عنوانات پر مشتمل تقریباً ۲ کروڑ کتب کی طباعت کے لیے ہزاروں' ٹن کاغذ خرید رہا تھا' اس نے تین چار ٹینڈر کیے بعد دیگرے منسوخ کر دیے۔ بورڈ کو اعتراض تھا کہ ٹھیکیداروں نے اس سال معمول سے بہت زیادہ ریٹ لگائے تھے۔ یہ

Marfat.com

معاملہ بلاخر آخر عدالت میں پہنچا جہاں کاغذ مل مالکان اور پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ مالکان کے مابین طویل مباحثے ہوئے لیکن ریٹ کے متعلق کوئی حتمی فیصلہ نہ ہو سکا۔ عدالت نے اپنے فیصلے میں بورڈ کو اپنی مرضی سے کاغذ خریدنے کی اجازت دے دی۔ بورڈ احکام نے بورڈ کی تاریخ میں پہلی بار فیصلہ کیا کہ اس بار چھٹی جماعت سے لے کر بارہویں تک کی تمام نصابی کتب نیوز پرنٹ پر شائع کی جائیں۔ ماہرین کے مطابق نیوز پرنٹ کی طبعی عمر صرف ایک دن ہوتی ہے۔ بہرحال عدالت نے نیوز پرنٹ کی خرید کے لیے جو ریٹ طے کیا وہ بازار میں دستیاب نیوز پرنٹ کے ریٹ سے تقریباً ۲۰ فی صد زیادہ تھا۔ اس کے علاوہ عدالت نے اپنے فیصلے میں کہا کہ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ جو خود کاغذ خرید کر پبلشروں کو دیتا ہے' وہ ۴۷ گرام وزن کا کیمیکل نیوز پرنٹ خریدے اور اس پر کتب شائع کروائے۔ مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ مارکیٹ میں ۴۷ گرام کیمیکل کاغذ دستیاب نہیں اور یہ کبھی بھی پاکستان کی کاغذ مارکیٹ میں دستیاب ہی نہیں رہا۔ اور مارکیٹ میں نیوز پرنٹ سادہ ۴۲' ۴۵' ۴۷ اور ۵۰ گرام میں دستیاب ہے۔ یہاں پر پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کی انتظامیہ نے بدعنوانی کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا کہ مارکیٹ میں سستے داموں دستیاب ۴۲ گرام سادہ نیوز پرنٹ یا عام نیوز پرنٹ خرید لیا اور اس طرح بورڈ حکام کو ۲ ہزار ٹن کاغذ کے اس سودے میں کم وزن کاغذ کی خرید سے ۶۰ لاکھ روپیہ بطور کمیشن حاصل ہوا اور ۲ ہزار ٹن نیوز پرنٹ کے اس مجموعی سودے میں بورڈ حکام کو تقریباً ۲ کروڑ ۲۰ لاکھ روپے کمیشن کے طور پر ملے۔

انہی دنوں محکمہ انٹی کرپشن نے پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کے حکام سے پوچھ گچھ شروع کی کہ انہوں نے نیوز پرنٹ ۲۴۰ روپے کے بجائے ۳۱۰ روپے میں کیوں خریدا جس سے پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کو ڈیڑھ کروڑ روپے کا نقصان پہنچا۔ محکمہ انٹی کرپشن کو جو درخواست صدر انجمن تاجران اردو بازار چوہدری محمد تاج کی طرف سے دی گئی اور انہوں نے پنجاب حکومت کے اعلیٰ عہدیداران کو جو پمفلٹ بھیجے' ان میں بورڈ حکام پر الزام لگایا گیا تھا کہ انہوں نے اس سلسلے میں ۳۰ لاکھ روپے رشوت وصول کی جس کی شرح درج ذیل ہے۔

۱- چیئرمین ٹیکسٹ بک بورڈ ۱۰ لاکھ روپے
۲- ڈائریکٹر (انسانیات) ۵ لاکھ روپے
۳- ڈائریکٹر (ٹیکنیکل) ۵ لاکھ روپے
۴- سیکرٹری ٹیکسٹ بک بورڈ ۳ لاکھ روپے

Marfat.com

۵- ڈپٹی سیکرٹری ۳ لاکھ روپے

۶- ایک ماہر مضمون ۳ لاکھ روپے

اس درخواست اور پمفلٹ میں مذکورہ بالا رشوت خوردگان کے نام بھی دیئے گئے تھے۔ بہرحال اس انکوائری اور پمفلٹوں کا بے اثر ثابت ہونا مسلم بات تھی۔

پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ آف ڈائریکٹر کی نامزد کردہ رجسٹریشن کمیٹی نصابی کتب کی طباعت کے لیے پیش ورانہ پبلشروں کو رجسٹرڈ کرتی ہے اور یہ رجسٹریشن ہر سال ہوتی ہے۔ ہر پبلشرز نئے سال کی کتب کی اشاعت کا کوٹہ لیتے وقت جتنی کتب چھاپنے کا آرڈر لیتا ہے ان کی اصل مالیت کا آدھا حصہ بطور کیش پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کو جمع کراتا ہے اور آدھی رقم کی بورڈ کو بینک گارنٹی دیتا ہے۔ اس کے بعد اس پبلشر کو ٹیکسٹ بک بورڈ کتب کے تناسب سے کاغذ' پازیٹو اور طباعت کی دوسری اشیاء مہیا کرتا ہے۔ ہر پبلشر کو عموماً ستمبر اکتوبر میں کتاب اشاعت کے لیے ملتی ہے۔ جسے لازماً ۲۰ سے ۳۰ مارچ تک تیار کرنا ہوتا ہے' لیکن ایسا شاید ہی بورڈ کی تاریخ میں کبھی ہوا ہو کہ مقررہ وقت پر پبلشرز حضرات نے کتاب چھاپ کر بورڈ کے حوالے کر دی ہو۔ جبکہ جعلسازی اور اوور پرنٹنگ کرنے والے حضرات ناقص مواد کے ساتھ جعلی کتاب چھاپ کر ان سے پہلے مارکیٹ میں لے آتے ہیں اور مجاز افسران کے ساتھ مل کر اس کو فروخت کرتے ہیں۔ رجسٹریشن کمیٹی ہر سال نئے پبلشروں کو بھی رجسٹرڈ کرتی ہے۔ پیشہ ور پبلشروں کی رجسٹریشن کا عمل ۱۹۶۲ء سے ۱۹۸۸ء تک پیشہ ورانہ بنیادوں پر رہا لیکن بعد میں جب سفارشی پرچی اور رشوت کا دور شروع ہوا تو دیکھتے ہی دیکھتے ایک پورا ہجوم پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کی کتابوں کی اشاعت کے لیے امیدوار ٹھہرا۔

۱۹۶۲ء سے ۱۹۸۸ء تک بورڈ کے پیشہ ور پبلشروں کی تعداد ۱۴۰ تھی۔ ۸۸ء کے بعد "منتخب جمہوری حکومتوں" کے سیاسی کارندوں نے کتب کی اشاعت کو ایک منفعت بخش دھندہ سمجھتے ہوئے بہت سے عزیزواقارب کو بطور پبلشر رجسٹرڈ کرا دیا جو بورڈ کی ابتدائی شرائط بھی پوری نہ کرتے تھے۔ بھرتیوں کا یہ بے محابہ سلسلہ محکمہ تعلیم کی سیاسی مقتدر شخصیات اور بیورو کریٹس نے شروع کیا۔ ۲۶ برس میں پبلشروں کی تعداد ۱۴۰ تھی جو آئندہ پانچ برسوں میں بڑھ کر یکدم ۳۵۰ ہوگئی اور تادم تحریر یہ تعداد ۴۵۰ سے بھی زیادہ ہے اور ان میں ۶۰ فی صد پبلشرز اور پرنٹرز ایسے ہیں جن کے پاس اپنا پریس اور طباعت کے دوسرے آلات تو کجا اپنی مستقل دکان تک نہیں۔ یہ افراد جن میں ۹۰ فی صد سیاسی لوگوں نے رجسٹرڈ کرائے ہر سال باقاعدگی سے بڑی تعداد میں درسی کتب کی طباعت کا ٹھیکہ لیتے

Marfat.com

ہیں اور پھر کمیشن کے عوض یہ ٹھیکہ کسی غیر پیشہ ور پبلشر کے ہاتھوں فروخت کر دیتے ہیں۔ جو اپنی مرضی سے اس کی تعداد میں اضافہ کرتا ہے اور کوالٹی یا معیار کو گرا دیتا ہے اور وہ عموماً ۲۰ ہزار کتب کے ٹھیکے کو ۴۰ ہزار کتب کی صورت میں چھاپتا ہے اور جیسے جیسے وہ غیر قانونی طور پر تعداد کو بڑھاتا جاتا ہے اسی تناسب سے معیار بھی پست ہوتا چلا جاتا ہے۔ جعلساز پبلشروں پر کوئی اخلاقی پابندی عائد نہیں ہوتی کہ وہ کتاب کے مختلف مراحل پر بورڈ حکام سے مشورہ کریں اور خصوصاً بورڈ حکام کے نامزد کردہ افراد کو کتاب کے مواد کی صحت سے آگاہ کریں۔ لہٰذا وہ کسی بھی دستور کا لحاظ رکھے بغیر جیسا مواد آئے طباعت کرتے چلے جاتے ہیں اور یوں غلطیوں بلکہ اغلاط کا انبار بچوں کی نصابی کتب کے نام پر شائع ہوتا رہتا ہے۔

نصابی کتب میں مواد کی غلطیوں کے سدباب کے لیے پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ ہر سال جو کمیٹی تشکیل دیتا ہے وہ چار پانچ افراد پر مشتمل ہوتی ہے۔ جن کے ذمے پانچ سو کے قریب پبلشروں کے ہاں تقریباً سوا دو سو عنوان کے تحت چھپنے والی کتابوں کی پروف ریڈنگ کا کام ہوتا ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ مذکورہ بالا مختصر سی کمیٹی تمام کیا آدھے پبلشروں کے ہاں زیر اشاعت کتب کا مواد دیکھ ہی سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا درسی نصاب عموماً مجموعہ اغلاط ہوتا ہے۔

شروع میں چند کتب کے بارے میں بتایا گیا ہے جو خصوصاً جعلسازوں کا نشانہ بنیں اور ان کی لاہور اور دوسروں شہروں میں سستے کاغذ اور گھٹیا مواد کے ساتھ بہت زیادہ اشاعت سے جہاں بورڈ کو کروڑوں روپے کی رائیلٹی کا نقصان پہنچا' وہاں سینکڑوں پیشہ ور اور رجسٹرڈ پبلشر لاکھوں روپیہ گنوا بیٹھے۔ کیونکہ مارکیٹ میں پہلے سے اسٹاک ہونے کی صورت میں ٹیکسٹ بک بورڈ آئندہ سال اسی تناسب سے کم ایلوکیشن جاری کرے گا اور وہ بہت تھوڑی ایلوکیشن پانچ سو کے قریب پبلشروں میں کس تناسب سے تقسیم ہوگی' جبکہ ٹیکسٹ بک بورڈ صرف اسی صورت میں بازار میں پڑی کتاب اٹھانے کا ذمہ دار ہے' اگر اس سال نصاب تبدیل ہو جائے تو پھر باقی ماندہ کتاب قیمتاً بورڈ کو اٹھانا ہوگی لیکن نصاب تبدیل ہوئے بغیر فروخت نہ ہوئی' کتب بورڈ کی ذمہ داری نہیں۔ اگر جماعت اول کے قاعدے سے لے کر انٹرمیڈیٹ تک کی کتب کی جعلسازی اور زائد پرنٹنگ کے حوالے سے دیکھا جائے تو بہت سی کتب اس ذیل میں آتی ہیں کہ یا تو پبلشروں کو ایلوکیشن دیتے ہوئے جان بوجھ کر مطلوبہ تعداد سے کم کتب دی گئیں تاکہ جعلسازی کے دربند نہ ہو جائیں یا پھر غیر پیشہ ور

Marfat.com

پبلشروں نے محض کمیشن کے حصول کے لیے اپنے حصے کا کام دوسرے پبلشروں کو دے دیا جنھوں نے مواد گھٹیا استعمال کیا اور مقررشدہ تعداد سے زیادہ کتب طبع کیں۔ اس سلسلے کی واضح مثال جماعت نہم اور دہم کی مشترکہ کتاب ریاضی ہے۔ اس سے پہلے نہم اور دہم کلاسوں کے لیے ریاضی کی دو کتابیں تھیں' جو لوگ آرٹس گروپ کے ہوتے وہ جنرل ریاضی کا مضمون پڑھتے جبکہ سائنس گروپ کے طالب علم ریاضی اختیاری پڑھتے۔ اس بار فیصلہ ہوا کہ ان دونوں مضامین کو ایک کتاب کی صورت میں طبع کیا جائے یا یوں کہہ لیجئے کہ دونوں مضامین کو باہم مدغم کر دیا جائے۔ ایک کتاب کی شکل اختیار کر لینے سے پہلے جنرل ریاضی اور ریاضی اختیاری دونوں کتب مجموعی طور پر چار لاکھ کی تعداد میں سالانہ فروخت ہوتیں۔ درسی کتب کے سلسلے میں یہ اصول مسلم ہے کہ جب نصاب تبدیل ہو اور نئی کتاب آئے تو معمول کے مقابلے میں دگنی تعداد میں فروخت ہوتی ہے۔ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ سے یہ توقع کی جا رہی تھی کہ مشترکہ ریاضی کی کتاب نیا نصاب ہونے کی وجہ سے تقریباً ۵ لاکھ کی تعداد میں شائع کی جائے گی۔ جب ایلوکیشن کا وقت آیا تو بورڈ انتظامیہ نے اچانک فیصلہ کیا کہ مذکورہ کتاب ۲ لاکھ کی تعداد میں شائع کی جائے۔ پبلشروں اور ہول سیلروں کی طرف سے پرزور مطالبے کے باوجود اس کی تعداد میں اضافہ نہ کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کتاب ۲ لاکھ کی تعداد میں رجسٹرڈ پبلشروں نے شائع کی جبکہ تقریباً ۳ لاکھ کتاب جعلی پبلشروں کی طرف سے مارکیٹ میں آ گئی۔ اس کے علاوہ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کے چیئرمین زاہد حسین کاظمی نے خود لاہور اور فیصل آباد میں اس کتاب کی جعلی کاپیاں پکڑیں لیکن معاملات رفع دفع ہوگئے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اس کتاب کی تعداد مطلوبہ تعداد سے کم چھپوا کر بورڈ اور پبلشروں کو تقریباً ۱ کروڑ ۳۰ لاکھ ۵۰ ہزار روپے کا نقصان پہنچایا گیا۔

صرف پرائمری کی کتب سفید کاغذ پر ہونے کی وجہ سے لاتعداد کتب جعلی طور پر چھاپی گئیں۔ اس کے علاوہ یہ طریقہ بھی مقبول رہا کہ رجسٹرڈ پبلشروں میں سے چند افراد کو ملی بھگت سے کم ایلوکیشن دی گئی تاکہ وہ کھلے دل سے جعلسازی یا اوور پرنٹنگ کر سکیں۔ مثال کے طور پر پہلی جماعت کا اردو قاعدہ ۳۶ پبلشروں نے ۵۹ لاکھ کی تعداد میں طبع کیا لیکن بورڈ انتظامیہ نے جہاں بعض پبلشروں کو ۳ لاکھ ۱۵ ہزار کاپی فی پبلشر کے حساب سے ایلوکیشن دی وہاں ۸۵ ہزار اور ایک لاکھ تک بھی ایلوکیشن دی گئی۔ ایک محتاط انداز کے مطابق سفید کاغذ پر طبع ہوا یہ قاعدہ لاکھوں کی تعداد میں نیوز پرنٹ کاغذ پر بھی چھاپا گیا اور

Marfat.com

فروخت ہوا۔ تقریباً ۷ لاکھ قاعدے جعلی طور پر شائع ہوئے اور اس طرح مجموعی طور پر ۴۹ لاکھ روپے کا نقصان بورڈ سمیت طباعت سے وابستہ اداروں اور افراد کو برداشت کرنا پڑا۔

منصور بک ڈپو اردو بازار کے مالک محمد زبیر کے مطابق پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کو پرائمری جماعتوں کی کتب کی جعلسازی کے باعث تقریباً ۲ کروڑ روپے کی رائیلٹی سے محروم ہونا پڑا۔ کیونکہ صرف پرائمری جماعتوں کی پانچ لاکھ سے زائد کتابیں جعلی چھپیں یا اوور پرنٹ ہوئیں' بلکہ بعض پبلشروں نے تو اپنے سٹورز سے ایک بھی کتاب باہر نہیں بھیجی کیونکہ ان علاقوں میں کتب کی مانگ جعلسازوں نے قبل از وقت ہی پوری کر دی اور جب رجسٹرڈ پبلشروں کی کتب چھپ کر مارکیٹ میں آئیں تو طلب نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ محمد زبیر نے مزید بتایا کہ بورڈ کی طرف سے دوران طباعت کتب کی چیکنگ کا نظام اتنا ناقص ہے کہ گذشتہ سال تقریباً ۲۰ فی صد کتب کئی دوسرے شہروں میں چھپیں اور وہیں بائنڈ ہوئیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ اگر بورڈ کا بورڈ آف ڈائریکٹرز نیک نیتی سے چاہے کہ کوئی کتاب جعلی یا اوور پرنٹ نہ ہو' تو یہ ممکن ہے بورڈ کے اتنے وسائل ہیں کہ وہ کتب کی طباعت کے دوران کی تمام بدعنوانیوں کا سدباب کر سکتا ہے۔

گذشتہ برس بھکر سے ایک ممبر قومی اسمبلی ٹیکسٹ بک بورڈ کے دفتر تشریف لائے۔ چیئرمین بورڈ کو ایک میٹنگ کے دوران یہ کہا کہ وہ ان کے ایک عزیز کو بھی کتابوں کا "پرمٹ" دیں ورنہ بہت برا ہوگا۔ چیئرمین نے رجسٹریشن کمیٹی کو کہہ کر ایم۔ این۔ اے صاحب کے اس عزیز کو چند ہزار کتب کی ایلوکیشن دے دی۔ موصوف نے اپنی پہلی ہی ایلوکیشن بورڈ کے دفتر میں ہی ایک پبلشر کو ۱۰ فی صد کمیشن پر دے دی۔

اس کے علاوہ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کی محکمہ تعلیم کے وزیر ریاض فتیانہ کے ہاتھوں جو درگت بنی اس کی بہت کم مثالیں ملتی ہیں۔ ٹیکسٹ بک بورڈ کے منتظم اعلیٰ کی حیثیت سے وزیر تعلیم پنجاب نے ایک سال میں چھوٹے سے اس ادارے میں ۸۱ افراد بغیر کسی ایڈورٹائزمنٹ کے بھرتی کر دیئے۔ بھرتی شدگان میں ۹۹ فی صد لوگ ان کے انتخابی حلقے کمالیہ (فیصل آباد) کے رہائشی تھے اور ان کی اکثریت متعلقہ پوسٹوں کے معیار پر پورا نہیں اترتی۔ ان بھرتی شدگان میں ۲۳ افراد کو سینئر ماہر مضمون' ماہر مضمون اور معاون ماہر مضمون کی حیثیت سے بھرتی کیا گیا جبکہ باقی ۵۸ افراد کو کلریکل شاف اور درجہ چہارم میں بھرتی کیا گیا۔ واضح رہے کہ وزیر تعلیم کے بھرتی شدہ ان افراد کی آمد سے پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کو سالانہ ۳۲ لاکھ روپے زائد ادا کرنا پڑیں گے۔

نفسیات کی کوئی بھی کتاب پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ میں ہر سال نہیں چھپتی بلکہ بعض اوقات پانچ سال تک ایک ہی کتاب چلتی رہتی ہے۔ لیکن وزیر تعلیم نے اپنے علاقے کی ایک خاتون کو نفسیات کی ماہر مضمون کی حیثیت سے بھرتی کر لیا۔ ہوم اکنامکس کی صرف تین کتب کے لیے دو ماہر مضمون خواتین کو بھرتی کیا گیا۔ فزکس کے شعبے میں شیخ غلام مصطفیٰ نام کے ایک ماہر مضمون کو بھرتی کیا گیا جو ایک سال گزر جانے کے باوجود ایک بار بھی دفتر نہ آیا۔ موصوف وزیر تعلیم کے قریبی لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک معاون ماہر مضمون انجم وزیر تعلیم کے "بھرتی مشن" میں رکھے گئے وہ گزشتہ ایک سال سے دفتر نہیں آئے اور انہوں نے لاہور کے ایک کالج میں داخلہ لے رکھا ہے۔ ایجوکیشن کے مضمون کی سال میں بمشکل ایک کتاب چھپتی ہے لیکن گزشتہ بھرتیوں میں اس شعبے میں تین ماہر مضمون رکھے گئے جو صرف تنخواہ وصول کرتے ہیں جبکہ ان کی معاونت کے لیے دو معاون ماہر مضمون بھی بھرتی کیے گئے۔

پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کے تحت اشاعتی کتب میں ایک شعبہ زیڈلسٹ کتب کا ہے۔ اس شعبے میں وہ کتب آتی ہیں جو دس دس پندرہ سال کے بعد شائع ہوتی ہیں۔ مثلاً چوب کاری، ووڈ ورکس، ویلڈنگ ورکس وغیرہ سے متعلق کتب۔ زیڈ لسٹ کتب کا ایک باقاعدہ الگ شعبہ بنا دیا گیا ہے جہاں ۲۰ افراد کو بھرتی کر کے کھپایا گیا۔ ان میں ایک بھی فرد مطلوبہ معیار پر پورا نہیں اترتا۔ جبکہ اس شعبے کا ایڈیٹر انچیف منور جاوید چیئرمین کے ساتھ رہتا اور "معاملات" کی نگرانی کرتا۔

باوثوق ذرائع کے مطابق وزیر تعلیم کے دفتر کی آرائش کے اخراجات جو تقریباً سوا لاکھ روپیہ تھے، پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ نے ادا کیے۔ اس کے علاوہ بورڈ کے چیئرمین نے اخبارات میں تین قیمتی گاڑیوں کی خرید کے لیے ٹینڈر درکار کا اشتہار دیا تھا، جس کے تحت تقریباً آٹھ لاکھ روپے مالیت کی، ایک ہنڈا سوک، ایک نسان سنی کار اور ایک سوزوکی ۱۰۰۰ سی سی خریدی گئیں۔ یہ گاڑیاں بھی وزیر تعلیم کے بیڑے کے لیے لی گئیں۔ جبکہ بورڈ کے پاس پہلے ہی دس عدد قیمتی گاڑیاں موجود تھیں۔ اس کے علاوہ بورڈ کی گاڑیوں کی لاگ بکس میں محکمہ تعلیم کے اعلیٰ افسران کے رشتہ داروں کے نام تک درج ہیں جو روزانہ سینکڑوں میل بورڈ کی گاڑیاں استعمال کرتے ہیں۔

لاہور کے ایک معروف اردو اخبار کے صحافی وزیر تعلیم کے "نمائندے" کے طور پر ہر وقت چیئرمین بورڈ زاہد حسین کاظمی کے ساتھ رہتے۔ بورڈ کی طرف سے قیمتی موبائل

Marfat.com

فون صحافی موصوف کو دیا گیا جو بورڈ میں نئی آسامیاں تک پیدا کرنے کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ مذکورہ صحافی نے گذشتہ سال کتب کے سلسلے میں ہونے والی جعلسازی میں اہم کردار ادا کیا اور ایک مقتدر شخصیت کے لیے لاکھوں روپے کمیشن اکٹھا کیا۔

چیئرمین پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ زاہد حسین کاظمی گذشتہ ایک سال سے ہر ہفتے اپنے گھر واقع راولپنڈی بذریعہ ہوائی جہاز جا رہے ہیں۔ اس دوران ہونے والے اخراجات بمعہ ہوائی سفر کے "سرکاری دورے" کی مد میں آتے ہیں۔ باوثوق ذرائع کے مطابق چیئرمین کے ایک ٹور پر ۵ ہزار روپیہ خرچ آتا ہے جو بورڈ ادا کرتا ہے۔ اس طرح موصوف اب تک تقریباً اڑھائی لاکھ روپیہ اپنے ذاتی بلکہ گھریلو سفر پر خرچ کر چکے ہیں۔

بیشتر کتب جو ۴ رنگوں میں چھپتی ہیں' بورڈ نے ان کتب کے لیے فی رنگ ۴۹ روپے کا ریٹ مقرر کر رکھا ہے جبکہ بازار میں یہ کام ۳۰ سے ۳۲ روپے تک میں باآسانی ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بورڈ پبلشر کو ۱۲ فیصد منافع بھی دیتا ہے۔ کئی حلقوں کے مطابق بورڈ کی طرف سے پبلشرز حضرات کو زیادہ شرح منافع دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے ایک جعلساز کو ترغیب ملتی ہے کہ وہ کتب میں جعلسازی کر کے اور سستے مواد کے ساتھ کتاب چھاپ کر زیادہ منافع کمائے۔ دیگر ذرائع کے مطابق بورڈ کے تمام اعداد و شمار جو وہ ایلوکیشن کے سلسلے میں اکٹھا کرتا ہے' غلط ہوتے ہیں اور یہ اعداد و شمار جان بوجھ کر غلط بنائے جاتے ہیں تاکہ بدعنوانی کی گنجائش موجود رہے بلکہ بعض اوقات بورڈ کئی جعلی لوگوں کو رجسٹر کر لیتا ہے اور ان کو جو کاغذ فراہم کیا جاتا ہے وہ دراصل بورڈ اہل کار بیچ دیتے ہیں۔ بورڈ کے رجسٹرڈ پبلشرز میں ۶۰ فیصد ایسے ہیں جن کا نہ تو طباعت وغیرہ کا کاروبار ہے اور نہ ہی وہ اس کے بارے میں جانتے ہیں اور وہ دراصل بورڈ عہدے داروں کی طرف سے خود رجسٹرڈ کیے گئے ہوتے ہیں' اس لیے کہ وہ ان عہدیداروں کے لیے اپنے کوٹے کا کاغذ بیچتے ہیں اور کمیشن وصول کرتے ہیں۔

Marfat.com

پنجاب پبلک لائبریری کو کس نے لوٹا؟

۲۴ اکتوبر ۱۹۸۱ء کو اس وقت کے صدر جنرل ضیاالحق نے پنجاب پبلک لائبریری کا دورہ کیا۔ اس دوران صدر صاحب نے موقع پر خصوصی احکامات جاری کیے' جن کے تحت فیصلہ کیا گیا کہ لائبریری کی اس تاریخی عمارت میں "مرکزی بیت القرآن" قائم کیا جائے گا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ۱۹۶۸ء میں بارہ دری وزیر خان کے بائیں جانب اور شعبہ انگریزی سے متصل ایک دو منزلہ عمارت "بیت القرآن" کے نام سے تعمیر کی گئی تھی اور اس کا افتتاح اس وقت کے گورنر ریٹائرڈ جنرل موسیٰ خان نے کیا تھا۔ "مرکزی بیت القرآن" قائم کرنے کے اس صدارتی حکم کے فوراً بعد ایک محکمانہ کمیٹی نے عملی اقدامات شروع کر دیے۔

مرکزی بیت القرآن کے لیے جگہ خالی کرنے کی غرض سے تقریباً ۶۰ ہزار کتابوں کو اٹھا کر لائبریری کی مرکزی عمارت کے کھلے برآمدوں میں رکھ دیا گیا۔ چھ سات ماہ تک یہ نایاب کتابیں دھوپ' بارش اور دوسرے موسمی اثرات برداشت کرتی رہیں' جس دوران ان کتابوں میں سے ۷۰ فیصد ضائع ہو گئیں۔ ۱۰۰ سال تک نایاب کتابوں کا ذخیرہ رکھنے والی اس لائبریری کو صدر صاحب کی اسلامائزیشن کی خواہش نے کتنا نقصان پہنچایا؟ اس کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

پنجاب پبلک لائبریری لاہور کو قائم ہوئے ایک سو دس سال کا عرصہ ہو چکا ہے۔ ایک نارمل معاشرے میں اتنی عمر کے بعد اس نوع کے اداروں کی شہرت' ساکھ اور افادیت اپنے عروج پر ہوتی ہے مگر ہمارے ہاں تہذیبی اقدار کے امین دیگر اداروں کی طرح یہ لائبریری بھی شکست و ریخت کے ایک مسلسل عمل سے دو چار ہے۔ جس کے نتیجے میں اس کی افادیت تو ختم ہو ہی گئی ہے لیکن اس کے وجود کو بھی خطرہ ہے اور اگر اصلاح

Marfat.com

احوال کی کوئی سنجیدہ کوشش نہ کی گئی تو کچھ عرصہ بعد اس کی جگہ بھی کوئی شاپنگ پلازہ جگمگا رہا ہوگا۔ اس لائبریری سے استفادہ کرنے والے افراد اور اس کے معاملات کی نگرانی کرنے والے ارباب اختیار کے ہاتھوں اس کی درگت کا احوال بیان کرنے سے پہلے ہم اس کی تاریخ کا ایک اجمالی جائزہ لیتے ہیں۔

پنجاب پبلک لائبریری ۱۸۸۴ء میں اس وقت کے لیفٹیننٹ گورنر پنجاب سر چارلس ایچی سن کی خواہش پر بارہ دری وزیر خان میں قائم کی گئی۔ بارہ دری وزیر خان شاہجہانی دور کے درباری طبیب چنیوٹ کے رہائشی حکیم علیم الدین انصاری نے، جنہیں شاہجہان سے "وزیر خان" کا انتخاب ملا تھا ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۱ء کے دوران تعمیر کرائی تھی۔ یہ عمارت فن تعمیر کا ایک عمدہ نمونہ تھی۔ اس کے چاروں کونوں پر خوش وضع برجیاں بنائی گئی تھیں اور اردگرد ایک وسیع و عریض باغ تعمیر کیا گیا تھا۔ جو نخلیہ وزیر خان یا نخلستان وزیر خان کے نام سے مشہور ہوا۔

۱۷۹۹ء ۱۸۴۹ء تک یہ بارہ دری اور باغ سکھ فوجیوں کی چھاؤنی کے طور پر استعمال ہوتے رہے۔ اس دوران باغ تباہ ہوگیا لیکن سخت جان بارہ دری موجود رہی جس میں بعد ازاں پنجاب پبلک لائبریری کی بنیاد رکھی گئی۔

لیفٹننٹ کرنل ای جی ویس (E. G. Wace) فنانس کمشنر پنجاب اس کے پہلے صدر منتخب ہوئے جب کہ اس پہلی مینجنگ کمیٹی کے منتخب ارکان میں مسٹر ڈینزل سی جے ابیٹسن (Denzil C.j Ibbetson) ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن پنجاب، مسٹر ای ڈبلیو پارکر (E.W Parker) ڈسٹرکٹ جج لاہور، مسٹر ایس وہیلر (S. Wheeler) ایڈیٹر سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور، پنڈت رام نرائن چیف کورٹ پنجاب، رائے بہادر کھنیا لال اور مسٹر جے۔ لاک وڈ کپلنگ پرنسپل سکول آف آرٹس لاہور شامل تھے۔

سر چارلس ایچی سن نے ۷۵ قیمتی کتابیں لائبریری کو تحفتاً پیش کیں اور پھر ان کی ترغیب پر بہت سے علم دوست حضرات نے ذاتی عطیات کی شکل میں اپنے گراں قدر علمی ذخائر اس کتب خانے کے لیے وقف کر دیے۔ اپنی صد سالہ سالگرہ کے موقع پر اس لائبریری میں اڑھائی لاکھ سے زائد کتب، دس ہزار سے زیادہ رسائل و جرائد اور ایک ہزار سے متجاوز قلمی مخطوطات موجود تھے۔

پنجاب لائبریری بین الاقوامی ادارے یونیسکو کے "امانت دار" (Depository) کا درجہ رکھتی ہے۔ یونیسکو سال میں جتنی کتابیں چھاپتا ہے ان کی کاپیاں یہاں بھی بھیجی جاتی

ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد سے اس کتب خانے کو مناسب سرکاری سرپرستی نہ دی گئی اور تغافل اور چیرہ دستیوں کے شکار اس قومی ورثہ کے عکاس ادارے کا شیرازہ بکھرنے کا اندیشہ ہے۔ یہاں ایک تقابلی جائزہ پیش کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ پنجاب پبلک لائبریری کے قیام سے تھوڑا عرصہ پہلے کلکتہ میں برصغیر کا پہلا عوامی کتب خانہ کھولا گیا۔ لارڈ کرزن کے عہد ۱۸۹۹ء تا ۱۹۰۵ء میں اسے قومی لائبریری کے طور پر رکھا گیا۔ اس کتب خانے کو ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی حکومت نے نیشنل لائبریری کا درجہ دے دیا جس کے نتیجے میں اس لائبریری نے ترقی کی منازل طے کرنا شروع کیں۔ لیکن علم کو اپنی میراث قرار دینے والوں کے حصے میں آنے والا یہ کتب خانہ علم کے نام پر گھپلوں اور لوٹ کھسوٹ کی سینکڑوں داستانیں اپنے سینے میں چھپائے اپنی سانسیں گن رہا ہے۔

پاکستان بننے تک پنجاب پبلک لائبریری کے چیف لائبریرین مسٹر لالہ رام لبھایا نامی ہندو تھے۔ اس کے بعد پہلے مسلمان چیف لائبریرین کا تقرر ہوا' یہ تھے خواجہ نور الٰہی۔ ۱۹۵۰ء میں حکومت پنجاب کے حکم سے اسلامیات کی چار ہزار کتب بھی لائبریری میں رکھ دی گئیں۔ یہ کتابیں زیادہ تر عربی لغات اور تفاسیر قرآن پر مشتمل تھیں۔

اس کے بعد لائبریری کے حالات رفتہ رفتہ دگرگوں ہونا شروع ہوگئے۔ ۱۹۴۸ء تک تمام کتابوں کے بارے میں ریکارڈ ملتا ہے' اس کے مطابق لائبریری میں تقریباً اڑھائی لاکھ کتب موجود تھیں۔ اس دوران جہاں ملک کے دوسرے اداروں میں کرپشن کا زور ہوا تو لائبریری بھی بدعنوانیوں کا شکار ہوگئی۔ حکومت پنجاب کے بہت سارے کلیدی عہدوں پر فائز افراد نے لائبریری سے کتابیں منگوانے کا سلسلہ شروع کر دیا' گو یہ سلسلہ پہلے بھی جاری تھا' اس کی مثال یہ ہے کہ لاہور ہائی کورٹ کے ایک ریٹائرڈ چیف جسٹس اور موجودہ چیف احتساب کمشنر مجدد مرزا کے پاس کئی نایاب کتابیں لائبریری کی موجود تھیں جو مسلسل یاددہانیوں کے باوجود واپس نہیں مل سکیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اعلیٰ حکومتی عہدیداروں اور دیگر با اثر شخصیات کے پاس پنجاب لائبریری کی تیس ہزار کتابیں پڑی ہوئی ہیں۔ جب اس سلسلے میں لائبریرین حافظ خدا بخش سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا "دیکھیں جی میں ایک ملازم ہوں اگر میرے پاس ہائی کورٹ کے کسی جج یا کسی وزیر یا کسی سیکرٹری کا آدمی متعلقہ عہدیدار کا رقعہ لے کر آتا ہے کہ مجھے اتنی کتابیں چاہیں تو میں کیسے انکار کر سکتا ہوں' مجھے تو نوکری کرنا ہے اور جتنی بھی کتابیں لوگوں کے پاس ہیں وہ اسی طرح

لائبریری سے باہر گئی ہیں۔ ہر سال لائبریری یاددہانی کے نوٹس بھیجتی ہے لیکن کبھی کتاب واپس نہیں آئی"۔

پنجاب پبلک لائبریری کی مینجنگ کمیٹی کے رکن ظہیر میر ایڈووکیٹ نے بتایا "ضیا دور میں پنجاب پبلک لائبریری کو تمام اعلیٰ عہدیداروں نے مل کر لوٹا حتیٰ کہ ان لوگوں کی اس لوٹ مار سے قرآن حکیم کے نادر اور نایاب نسخے بھی محفوظ نہ رہ سکے۔ ۸۶ء میں اس وقت کے سیکرٹری لائبریری عبدالجبار شاکر (جو کہ اب ڈائریکٹر پبلک لائبریرز ہیں) نے پشاور میں نمائش کے لیے ۴۸ عدد نایاب قرآنی نسخے بھجوا دیے۔ جو پھر کبھی واپس نہ آسکے اس طرح عبدالجبار شاکر نے ان کو بیچ کر لاکھوں روپے کما لیے"۔

چیف لائبریرین حافظ خدا بخش سے جب اس سلسلے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا "ہم نے تو بہت سے یاددہانی کے نوٹس بھیجے ہیں لیکن ان کا کوئی بھی جواب نہیں آیا اور اب ہم تھک ہار کر بیٹھ گئے ہیں"۔

انہی دنوں ڈائریکٹر جنرل پبلک لائبریرز ایر کموڈور انعام الحق صاحب جو کہ صدر ضیا کے بہت قریبی تھے' انہوں نے موجودہ چیف لائبریرین کو کسی قاعدہ قانون کی پرواہ کیے بغیر بیت القرآن کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر سے ڈپٹی چیف لائبریرین لگا دیا اور اس تقرری کا کوئی بھی نوٹیفکیشن جاری نہ ہوا۔ ایر کموڈور صاحب ان دنوں خود او ایس ڈی ہیں۔

۲۵ جنوری ۹۴ء کو وزیر تعلیم پنجاب ریاض فتیانہ جو ان دنوں مختلف کالجوں' یونیورسٹیوں' امتحانی مراکز اور دیگر تعلیمی اداروں پر چھاپے مار رہے تھے' پنجاب پبلک لائبریری پہنچے۔ لائبریری کے سٹاف نے حسب توفیق ان کے پروٹوکول کا انتظام کیا' لائبریری کے مختلف حصوں کے معائنے کے دوران وزیر تعلیم کا یہ وفد جب اردو سیکشن پہنچا تو انہوں نے چیف لائبریرین مقصود کاظمی سے سوال کیا کہ یہاں پر کون سی کتابیں پڑھنے کو میسر ہیں' مقصود کاظمی کا جواب تھا "سر یہاں پر فکشن سے متعلق مواد ہے" وزیر موصوف نے اچانک پوچھا فکشن کیسا؟ سائنس اور جدید تحقیق کے بارے میں کوئی کتابیں نہیں' لائبریرین نے فوراً جواب دیا وہ بھی ہیں جی لیکن ان کا شعبہ علیحدہ ہے اور پھر ہمارے پاس گرانٹ نہیں جس کی وجہ سے ہم نئی کتابیں نہیں خرید سکتے۔

اس کے بعد وزیر صاحب بیت القرآن سیکشن پہنچے وہاں پر انہوں نے یہ مناسب سمجھا کہ بیت القرآن کے انچارج کو تبدیل کر دیا جائے۔ اس کے بعد جب وزیر تعلیم صاحب اورینٹل سیکشن پہنچے تو ایک الماری میں کتابوں پر گرد جمی ہوئی تھی۔ انہوں نے انگلی

Marfat.com

گرد سے لگا کر لائبریرین کو دکھائی اور کہا کہ کیوں نہ تم کو او ایس ڈی لگا دیا جائے۔

وزیر تعلیم نے سیکرٹری تعلیم تنویر احمد خاں کو آرڈر دیا کہ مقصود کاظمی کو محکمہ تعلیم میں او ایس ڈی لگا دیا جائے۔ سیکرٹری تعلیم نے مینجنگ کمیٹی کے صدر کے اختیارات سے تجاوز کرتے ہوئے مقصود کاظمی کو او ایس ڈی لگا دیا۔ مقصود کاظمی جنوری ۹۴ء سے لے کر اب تک محکمہ تعلیم میں او ایس ڈی ہے اور لائبریری فنڈ سے ماہانہ ۱۲۳۰۳ روپے تنخواہ وصول کر رہا ہے۔

پنجاب پبلک لائبریری کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ لائبریری کا ایک تجربہ کار افسر جس کی لائبریری کو ضرورت تھی محض "چھاپے" کی افادیت بڑھانے کی غرض سے او ایس ڈی لگا دیا گیا۔ سیکرٹری تعلیم یوسف کمال سے جب اس سلسلے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا یہ چھوٹا معاملہ ہے اور یہ وزیر صاحب کا کام ہے میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں۔

حکومت کی طرف سے لائبریری کو سالانہ ۳۳ لاکھ پچیس ہزار روپیہ فنڈ کے طور پر ملتا ہے اس کے علاوہ لاہور کارپوریشن بھی سالانہ ۱۵ ہزار روپیہ دیتی ہے۔ لائبریری کے ۶۴ ملازمین کی تنخواہیں تقریباً ۲۸ لاکھ روپیہ سالانہ بنتی ہیں۔ بجلی کا خرچ ۳ لاکھ روپیہ سالانہ ہے' اس کے بعد جو رقم بچ جاتی ہے وہ عمارت کی مرمت وغیرہ پر اٹھ جاتی ہے۔ گزشتہ پانچ سال سے لائبریری میں سفیدی نہیں ہو سکی۔ انگریزی سیکشن میں گزشتہ چار سال سے کوئی کتاب نہیں خریدی گئی۔

پچھلے دس پندرہ برسوں کے دوران جو تیس ہزار کتب کی اعلیٰ حکومتی عہدیداروں کے رقعوں اور آرڈرز کے ذریعے لائبریری سے باہر منتقلی ہوئی ہیں۔ اس سے کیٹلاگ سسٹم بالکل ختم ہو کر رہ گیا ہے۔ اس گھپلے کو چھپانے کے لیے لائبریری حکام نے کتابوں کے شاک کو نئی تعمیر شدہ اوپر والی منزل میں منتقل کر دیا ہے تاکہ وسیع پیمانے پر ہونے والی تباہی کو آنکھوں سے نہ دیکھا جائے' لیکن یہ تباہی اب کیٹلاگ سے ظاہر ہو رہی ہے۔ آپ کوئی بھی نایاب اور پرانی کتاب طلب کریں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ آپ کو مل سکے۔ بہانہ یہ ہوگا کہ جلد ہونے کے لیے گئی ہے یا مرمت طلب حصوں کی وجہ سے شاک درہم برہم ہے۔ تازہ ترین اعداد و شمار کے مطابق کل کتب کی تعداد پونے تین لاکھ ہے اور یہ تعداد لائبریری کی صد سالہ رپورٹ مطبوعہ ۱۹۸۴ء میں بھی اتنی تھی۔ اب دس سال گزر جانے کے باوجود' لاکھوں روپے کے فنڈز' یونیسکو کے عطیات اور ۸۴۰ ممبران جو کہ فی کس ہزار روپیہ ناقابل واپس جمع کرا چکے ہیں اور دیگر ۳۲۰۰ جنرل ممبران ۵۰۰۰ طالب علم ممبران اور

۱۲۰۰ بچے بھی ممبر ہیں۔ ان سب لوگوں سے لی گئی خطیر رقم کہاں ہے۔ اس سے کتابیں کیوں نہیں خریدی جاتیں؟۔

۸۰۰۰ ہندی اور گورمکھی کتابوں کا کوئی پرسان حال نہیں۔ یہ کتابیں کسی کو جاری بھی نہیں کی جاتیں۔ استقبالیے پر جو نئی کتابوں کے سرورق آویزاں ہیں ان میں زیادہ تر پندرہ سال پرانے ہیں۔

نواز شریف دور حکومت میں لائبریری کے ایک حصے میں (جو آج کل خواتین کا سٹڈی روم ہے) پنجاب حکومت کے پارلیمانی سیکرٹری تعلیم میاں عبدالستار کا دفتر بنا دیا گیا۔ اس دوران لائبریری کا ایک حصہ سیکرٹریٹ کا منظر نامہ پیش کرتا رہا۔ موصوف پارلیمانی سیکرٹری نواز حکومت کی برخاستگی کے بعد جاتے وقت لائبریری کے ٹیلی فون کا ۱۳۰۰۰ روپیہ ادا کیے بغیر چھوڑ گئے۔ بعد میں محکمہ ٹیلی فون نے وہ فون منقطع کر دیا جو عدم ادائیگی کی وجہ سے تاحال منقطع ہے۔

لائبریری میں بیت القرآن کی عمارت کے نچلے حصے میں پانچ سو نشستوں کا ایک خوبصورت آڈیٹوریم بھی قائم ہے۔ جس میں تمام جدید ترین سہولتیں موجود ہیں اور اس کا پورے دن کا کرایہ صرف پانچ سو روپے ہے' لیکن سال میں ایک یا دو مرتبہ یہ ہال کرائے پر چڑھتا ہے جو لائبریری کی انتظامیہ کی نا اہلی اور سستی کا ایک منہ بولتا ثبوت ہے کہ وہ لائبریری کے لیے ایک مستقل آمدن کا ذریعہ موجود ہونے کے باوجود بھی اسے صحیح خطوط پر استعمال میں نہیں لا سکی۔

اردو سیکشن کے ریڈنگ روم میں بیٹھے ہوئے ایک ممبر محمد علی نے بتایا "میں گزشتہ پانچ سال سے لائبریری میں آ رہا ہوں اس دوران بہت دفعہ یہ ہوا کہ مجھے میری مطلوبہ کتابیں پڑھنے کو نہیں مل سکیں۔ میں نے پچھلے دنوں ایک کتاب "تاریخ سیدوالا" مانگی تو کہا گیا کہ آپ (لاہور کے ایک بہت بڑے اشاعتی ادارے) کے پاس چلے جائیں وہاں پر ہمارا نام لے کر کتاب طلب کریں مل جائے گی اور ہم آپ کو ایشو کر دیں گے"۔

لائبریری کا کیٹلاگ سسٹم گزشتہ ۲۰ سال پرانا ہے' جو کتابیں کیٹلاگ میں ہیں وہ لائبریری شاک میں نہیں' ان میں سے بہت سی کتابیں اعلیٰ عہدیداروں کے گھروں کی زینت بن چکی ہیں۔

Marfat.com

میاں چنوں کے بہاری
اور
غلام حیدر وائیں کی کرپشن

۱۰ جنوری ۹۳ء کی صبح تریسٹھ بہاری خاندان ڈھاکہ کی آدم جی جیوٹ مل کے بدبودار مضافات سے پاکستان روانہ ہوئے۔ بنگلہ دیش میں قائم چھیاسٹھ مہاجر کیمپوں میں سے "سیمل پاڑہ مہاجر کیمپ" ڈھاکہ کے ۳۲۳ افراد کو حکومت پاکستان کی خواہش پر پاکستان لے جانے کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔

پاکستان روانگی سے قبل ڈھاکہ ایئرپورٹ پر رابطہ عالم اسلامی تنظیم کے سربراہ عبداللہ بن نصیب اور مہاجروں کی تنظیم (ایس پی جی آر سی) کے رہنما محمد نسیم خان نے مہاجروں کو بتایا "پاکستان میں سامان سے بھرے سجے سجائے گھر آپ لوگوں کا انتظار کر رہے ہیں۔ اسی لیے آپ کو یہاں سے گھریلو سامان ساتھ لے جانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ اس کے علاوہ پاکستان میں اٹھارہ ماہ تک ہر خاندان کو ۱۲۰۰ روپیہ ماہوار وظیفہ بھی ملے گا"۔

یہ وہ سہانے بول تھے جن کا امرت کانوں میں بھر کر ۳۲۳ بہاری ڈھاکہ سے خصوصی پرواز کے ذریعے لاہور کے لیے روانہ ہوئے۔ سہ پہر کو جب یہ مہاجر خاندان لاہور پہنچے تو ایئرپورٹ پر اس وقت کے وزیراعلیٰ پنجاب غلام حیدر وائیں ان خصوصی مہمانوں کے لیے پھولوں کا ایک ایک ہار لیے منتظر کھڑے تھے۔ چائے اور بسکٹوں سے تواضع کے بعد انہیں نیوخان کی بسوں میں لاد کر اوکاڑہ لے جایا گیا۔ جہاں انہیں اوکاڑہ شہر کے مضافات میں بنی ہوئی دو رہائشی کالونیوں میں عارضی طور پر ٹھہرایا گیا۔ چک نمبر ۳۸ اور ۲۱ کی یہ دونوں رہائشی کالونیاں جونیجو دور میں بے گھر لوگوں کے لیے شروع کی گئی سات مرلہ سکیم کے تحت بنائی گئی تھیں۔ چالیس چالیس کوارٹروں پر مشتمل ان کالونیوں کو "عارضی بہاری کیمپ" کا نام دیا گیا۔ کیونکہ بہاریوں کے لیے وزیراعظم نواز شریف کی خصوصی ہدایت اور وزیراعلیٰ وائیں کی شدید خواہش پر میاں چنوں سے ۵ کلومیٹر کے فاصلے پر "موسیٰ ورک" میں ماڈل

Marfat.com

ٹاؤن کے نام سے بہاری کالونی کی تعمیر شروع ہو چکی تھی۔

نواز شریف حکومت کا منصوبہ تھا کہ بنگلہ دیش میں چھیاسٹھ مہاجر کیمپوں میں مقیم تقریباً ۷۰ ہزار بہاریوں کو پنجاب کے ان اضلاع میں بسایا جائے' جہاں سے مسلم لیگ کو پیپلز پارٹی کے مقابلے میں تین سے لے کر دس ہزار تک ووٹوں سے شکست ہوئی ہے۔ اس طرح قومی تاریخ میں ایک نیک عمل کا اضافہ ہو جائے گا اور سیاسی طور پر بہت بڑا فائدہ بھی۔

چنانچہ ۱۱ جنوری ۹۳ء سے غربت اور بھوک کے مارے ان تریسٹھ بہاری خاندانوں نے اوکاڑہ کے اس عارضی کیمپ میں رہنا شروع کر دیا۔ ہر خاندان کے سربراہ نے کالونی میں واقع رابطہ عالم اسلامی کے دفتر سے درج ذیل سامان وصول کیا۔

(۱) تیل کا چولہا (۲) ایک دیگچی اور چار پلیٹیں (۳) تین گلاس اور ایک توا (۴) ایک لوہے کا ٹرنک (۵) ایک بالٹی اور لوٹا (۶) ایک سلائی مشین (۷) تین کمبل ایک جائے نماز (۸) قالینوں کا برادہ بھری چار رضائیاں اور اس طرح ۱۲۰۰ روپے ماہوار وظیفے کے ساتھ ہر خاندان نے آٹھ آٹھ بچوں سمیت رہنا شروع کر دیا۔

بنگلہ دیش بن جانے کے بعد پاکستان اور بنگلہ دیش کی حکومتوں کے مابین معاہدہ ہوا تھا کہ بنگلہ دیش میں رہ جانے والے پاکستانیوں کو واپس لایا جائے گا۔ حکومت پاکستان نے مہاجروں کو سندھ میں آباد کرنے کا منصوبہ بنایا لیکن سندھیوں کی شدید مزاحمت کے باعث حکومت کو اپنا ارادہ موخر کرنا پڑا۔

۹۰ء میں بننے والی نواز شریف حکومت نے اعلان کیا تھا کہ وہ بنگلہ دیش میں مقیم پاکستانی مہاجروں کو پاکستان لائے گی۔ چنانچہ اسی کے تحت ۳۲۳ مہاجر پہلی کھیپ کی صورت میں پاکستان پہنچے۔

۱۰ جنوری ۹۳ء سے لے کر ۱۱ اپریل ۹۴ء تک یہ خاندان اوکاڑہ کی عارضی کالونی میں رہے۔ اس دوران حکومت تبدیل ہوگئی اور نئی حکومت کے لیے پہلی حکومت کے شروع کیے گئے کاموں کو جاری رکھنا چونکہ ہمارے ہاں مروج نہیں' اس لیے مہاجروں کے ساتھ بھی وہی ہوا جس کی امید تھی۔ سب سے پہلے دسمبر ۹۳ء میں ان کو ملنے والا ماہوار وظیفہ بند کیا گیا' اس کے بعد ۱۱ اپریل ۹۴ء کو انہیں اٹھا کر میاں چنوں کی تقریباً نامکمل کالونی میں لا پھینکا گیا۔

مہاجروں کی پنچائیت کمیٹی کے ممبر نے بتایا "جو حکومت ہمیں پاکستان لائی تھی اس

Marfat.com

نے بھی ہماری بہبود کے لیے کچھ نہیں کیا اور موجودہ حکومت نے تو ہمارے منہ سے نوالا بھی چھین لیا ہے' بلکہ اوکاڑہ جہاں چند سہولتیں میسر تھیں وہاں سے بھی اٹھا کر ان کھنڈرات میں پھینک دیا گیا ہے تاکہ ہم سسک سسک کر مرجائیں۔ اوکاڑہ میں ہمارے بچے پڑھ رہے تھے۔ کبھی کبھار ہمیں مزدوری بھی مل جاتی تھی' اس کے علاوہ وہاں علاج کی سہولت تھی۔ یو ٹیلٹی سٹور' مسجد اور لیٹر بکس موجود تھا' لیکن یہاں سوائے ویرانی' بھوک اور موت کے کچھ نہیں"۔

محمد حفیظ نے مزید بتایا کہ جب ہمیں ڈھاکہ سے جہاز پر سوار کرایا جا رہا تھا تو یہ کہا گیا "آپ لوگوں کا بائیس سال کا غم ختم ہو جائے گا"۔ لیکن یہاں آکر محسوس ہوتا ہے کہ غم پہلے سے بھی دوگنا ہوگیا ہے۔ میاں چنوں پہنچ کر بے سہارا مہاجرین کو امید کی کرن یہ نظر آئی کہ زیر تعمیر کالونی میں انہیں مزدوری مل جائے گی۔ مزدوری مل بھی گئی لیکن انہیں بہت مہنگی پڑی۔ مہینہ بھر کام کرنے کے بعد اجرت کی طلبی پر ٹھیکیدار عباس اور اس کے آدمیوں نے غریب اور لاغر بہاریوں کو دھکے اور گالیاں دیں۔

بجلی کا کام کرنے والے محمد حبیب اور حفیظ نے بتایا "ہم دونوں نے ٹھیکیدار کے پاس ایک مہینہ اور پانچ دن کام کیا جس کا معاوضہ تقریباً ۳۶۰۰ روپیہ ہے۔ عید سے کچھ دن پہلے ہم نے ٹھیکیدار سے پیسے مانگے تاکہ عید کی کچھ خریداری کر سکیں' لیکن جواب میں ٹھیکیدار سے گندی گالیاں اور دھمکیاں ملیں کہ "تمہاری عورتوں کو بھی اٹھوا لوں گا اگر آئندہ کسی نے اجرت مانگی تو گولی مار دوں گا"۔

اس طرح محمد شریف' محمد انور' صابر علی اور کئی دوسرے لوگ پورا مہینہ کام کرنے کے بعد بھی اجرت نہ ملنے پر تھک ہار کر گھر بیٹھ گئے ہیں۔ میاں چنوں کی دھاگہ مل میں دو آدمیوں کو کام ملا لیکن تین دن بعد ان کو "بہاری بدمعاش ہوتے ہیں" کہہ کر نکال دیا گیا۔

اس کالونی میں کوئی سکول نہیں اس لیے مہاجرین کے بچے کہیں تعلیم حاصل نہیں کرتے اور سارا دن دھوپ میں پھرتے رہتے ہیں اور پھر بیمار پڑنے کے بعد میڈیکل کی سہولتیں نہ ہونے کے باعث ان میں سے کئی مرجاتے ہیں۔ اوکاڑہ میں بھی ایک مہاجر رستم علی کو جب سانپ نے ڈس لیا۔ کالونی کی ڈسپنسری میں مرہم پٹی تو ہو سکتی تھی' سانپ کے ڈسے کا علاج نہیں' اس لیے تین ماہ سے بند وظیفے کی وجہ سے کوئی پیسہ نہ ہونے کی صورت میں رستم علی لا علاج مرگیا اور اپنے پیچھے تین بچوں سمیت بیوہ کو چھوڑ گیا۔ جو بچوں کے سامنے بیٹھی خالی برتن دیکھتی رہتی ہے۔ میرے پوچھنے پر اس نے کہا "بنگلہ دیش میں بھی یہی

Marfat.com

حال تھا اور یہاں کا حال بھی آپ دیکھ رہے ہیں، ہم تو لحہ لحہ آتی موت کا نظارہ کر رہے ہیں"۔

ایک کوارٹر میں بوسیدہ رضائیوں کے ڈھیر کے پیچھے نیم دراز نابینا شخص محمد فرمود نے بتایا "میرا یہاں کوئی نہیں ہے، میں خود آنکھوں سے معذور ہوں۔ چند ماہ تک وظیفہ ملتا رہا لیکن اس کے بعد ہم سے رزق چھین لیا گیا۔ ہم بنگلہ دیش میں بھوکے مر رہے تھے تو وہاں یہ بھوک زیادہ اذیت ناک نہیں تھی اور ہمیں یہ احساس تھا کہ وطن سے دور ہیں۔ مگر جس زمین کے لیے تڑپتے تھے اسی پر اب تڑپ تڑپ کر مر رہے ہیں"۔

اس نابینا شخص محمد فرمود نے اپنی بے نور آنکھیں بند کر کے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا خدا کے لیے جو رزق تم باسی سمجھ کر پھینک دیتے ہو، وہ ہمیں دے دیا کرو ہم بھوکوں مر گئے ہیں۔

ایک ستر سالہ مہاجر محمد اسلام نے بتایا کہ سیمل پاڑہ کیمپ میں رابطہ عالم اسلامی اور ایس پی جی آر سی نے پاکستان جانے والے مہاجروں کی فہرست بناتے وقت ایک خاندان کو دو خاندانوں میں بانٹ دیا ہے۔ گھر کے سربراہ کا خانہ علیحدہ ہے اور اس کی بیوی کا علیحدہ۔ اس سے کوئی بھی مکمل خاندان پاکستان نہیں آ سکا۔

محمد اسلام نے بتایا کہ میری دو کنواری بیٹیاں بنگلہ دیش میں رہ گئی ہیں۔ اسی طرح صابر علی کی ماں اور بہن ادھر رہ گئی ہیں، انور حسین کا والد اور بڑا بھائی بنگلہ دیش میں ہے۔ یوں بہت سے خاندان منتشر ہو گئے ہیں۔

صابر علی نے بتایا کہ ماہوار وظیفے کی بندش کے بعد عیدالفطر پر تمام مہاجر گھروں میں فاقہ رہا۔ لیکن گزشتہ بڑی عید پر غلام حیدر وائیں کی بیوہ بیگم مجیدہ وائیں کالونی میں آئیں اور فی خاندان پچاس روپے نقد کے علاوہ ایک ایک کلو چینی اور سوجی تقسیم کی مگر حکومت کی طرف سے کوئی اہل کار ہماری خبر تک لینے بھی نہیں آیا۔

تقریباً چالیس مہاجر گھروں میں بہت سی لڑکیوں کی عمریں ڈھل رہی ہیں۔ میرے سوال پر حفیظ احمد نے بتایا کہ ہمارے گھروں میں ہفتہ ہفتہ بھر چولھا نہیں جلتا، ہم بیٹیوں کی شادیاں کیسے کر سکتے ہیں؟

ہماری پنچائیت کمیٹی کے ممبر محمد حفیظ نے بتایا کہ بنگلہ دیش میں ہم بائیس سال تک شودروں کی طرح زندگی گزارتے رہے ہیں۔ اور پاکستان آ کر بھی ہم بے شناخت ہیں۔ نہ ہمارے شناختی کارڈ بنائے گئے ہیں اور نہ ہی ہمارے پاس پاکستانی شہریت کا کوئی دوسرا ثبوت

Marfat.com

ہے۔

بنگلہ دیش میں پھنسے پاکستانی مہاجروں کا مسئلہ قومی اور انسانی بھی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق بنگلہ دیش کے چھیاسٹھ مہاجر کیمپوں میں ایک مہینے میں تقریباً بیس افراد بھوک سے مرجاتے ہیں۔ اگر کوئی صوبہ مہاجرں کو قبول کرنے کو تیار نہیں تھا تو حکومت کو کوئی متبادل فیصلہ کرنا چاہیے تھا اور نئی حکومتوں کا گزشتہ حکومتوں کے منصوبوں کو تہس نہس کرنا کوئی مثبت جمہوری رویہ نہیں۔ اس کی وجہ سے ملک پہلے کئی شدید نقصانات سے دو چار ہو چکا ہے۔ جب کہ ذوالفقار علی بھٹو کے دور حکومت میں بھی کچھ بہاری خاندانوں کو اوکاڑہ شہر سے تقریباً دو میل دور واقع چک نمبر ۲ - ۵۴ میں لا کر بسایا گیا تھا اور انہیں دوسرے پاکستانیوں کی طرح سہولتیں فراہم کی گئی تھیں اور یہ بہاری خاندان آج نارمل زندگی بسر کر رہے ہیں۔

مسلم لیگی وزیر اعلیٰ میاں غلام حیدر وائیں نے میاں چنوں (اپنے حلقہ انتخاب) میں بہاری خاندانوں کے لیے ماڈل ٹاؤن نام کی دو کالونیوں کے لیے ۵۰ کروڑ روپے کی رقم مختص کی۔ اس رقم میں سے غلام حیدر وائیں نے ایک جدید ترین پجیرو گاڑی خرید لی اور میاں چنوں میں ایک عالی شان گھر تعمیر کر لیا جب کہ تقریباً ۱۵ کروڑ روپے کی رقم میاں چنوں سے تعلق رکھنے والے مسلم لیگی افراد میں بانٹ دی۔ یہ بہاری کالونیاں مکمل طور پر تعمیر نہ ہو سکیں اور نئے وزیر اعلیٰ میاں منظور وٹو نے تعمیرات کا کام روک دیا اور باقی بچے ۱۰ کروڑ روپے خود ہڑپ کر لیے۔

نئے وزیر اعلیٰ میاں منظور وٹو اور سابقہ وزیر اعلیٰ غلام حیدر وائیں کی بدعنوانیوں کے باعث ان لاچار بہاریوں کے لیے مختص کی گئی رقم میں سے ایک روپیہ بھی باقی نہ بچا اور نہ ان کی رہائش گاہیں پوری طرح تعمیر ہو سکیں۔ نہ ان بہاریوں کو میاں چنوں اور گرد و نواح میں کوئی کاروبار مل سکا' جس کے باعث زیادہ تر خاندانوں نے کراچی چلے جانے کو ترجیح دی۔ لیکن پھر بھی ۳۰ کے قریب غریب اور لاچار خاندان کالونی میں موجود رہے۔ ان کی جوان عورتیں بھوک اور افلاس سے ڈر کر اوکاڑہ اور لاہور کی ہیرا منڈیوں میں آ گئیں اور ان میں سے اکثریت نے چھوٹے موٹے جرائم کے ساتھ ساتھ ہیروئن وغیرہ کا نشہ شروع کر دیا۔ آج یہ ساری کالونی بالکل ویران ہے اور نئے بہاری خاندانوں کی منتظر ہے جو محض "ووٹ حاصل" کرنے کے لیے یہاں لائے جائیں۔

Marfat.com

زرعی یونیورسٹی فیصل آباد میں
سیاست دانوں کے پروردہ جرائم پیشہ طلبہ گروہ

پاکستان کے تیسرے بڑے شہر فیصل آباد میں امن و امان کی مجموعی صورتحال درجن سے زائد سرکاری کالجوں اور ایشیا کی سب سے بڑی زرعی یونیورسٹی کے مسلح اور جتھ بند طالب علموں کی مرہون منت ہے۔ یہ جتھ بند طلبہ جو مختلف سیاسی و مذہبی جماعتوں اور برادریوں کی شناخت اور مفادات کے لیے برسرپیکار ہیں اور اپنے آقاؤں کے عنایت کردہ جدید ترین ہتھیاروں اور قیمتی گاڑیوں سے لیس ہیں۔ مذکورہ بالا تینوں اکائیاں جو طلبہ کی "مسلح خدمات" مستعار لیتی ہیں' ان میں خصوصی طور پر فیصل آباد میں موخرالذکر یعنی ذات برادریوں کی باہمی جنگ اور دوسرے سیاسی و مذہبی تنظیموں کے مسلح اتحاد بہت تشویشناک صورت میں نمودار ہوئے ہیں اور فیصل آباد کے تمام کالج اور زرعی یونیورسٹی علم کے گہواروں کے برعکس باقاعدہ میدان جنگ بن کر رہ گئے ہیں' اور اگر کہیں اساتذہ میں سے کوئی کسی مسلح تنظیم کی راہ میں "اصولی جواز" کا سہارا لیتا ہے تو اس کی یہ لغزش اسے موت کے منہ تک لے جا سکتی ہے۔ اس کی تازہ ترین مثال کچھ عرصہ قبل گورنمنٹ کالج سمن آباد فیصل آباد کے ایک غریب استاد افتخار ملک کی اندوہناک موت ہے جو ایک سابق صوبائی وزیر تعلیم کی قائم کردہ ایم۔ ایس۔ ایف (ج) کے ارکان کو وزیر ہی کے سفارشی رقعہ پر کمرہ الاٹ نہیں کر رہا تھا' ان "ناراض" نوجوانوں کے ہاتوں چھلنی ہوگیا اور جان بچانے کی کوشش میں ایک غریب خاکروب کی جواں سال بیٹی کو بھی اپنے ساتھ مروا بیٹھا۔ فیصل آباد میں طالب علموں کو شہر کے ناخواندہ سیاست دانوں کی "مکمل" حمایت حاصل رہی ہے اور ان دنوں بھی کئی ایم۔ این۔ اے اور ایم۔ پی۔ اے حضرات اس جنگ میں پوری طرح ملوث ہیں اور مختلف طلبہ تنظیمیں ان افراد کا نام لیتی ہیں۔

اس رپورٹ کا محرک ۱۸ ستمبر ۹۵ء کا وہ قتل ہے جو ذات برادریوں کے اکٹھ انقلابی

کونسل اور جماعت اسلامی کی طلبہ تنظیم اسلامی جمعیت طلبہ کے درمیان اندھا دھند فائرنگ کے دوران ہوا۔ اس فائرنگ میں جو دن بھر دونوں تنظیمیں اپنے اپنے "مقبوضہ" ہاسٹلوں سے کر رہی تھیں، انقلابی کونسل کا چیئرمین، ضلع وہاڑی کا رہائشی اور ایک انتہائی غریب سکول ماسٹر کا بیٹا میاں زاہد مسعود کنپٹی پر گولی لگنے سے جاں بحق ہوگیا۔ اس سانحے سے دو ماہ تک زرعی یونیورٹی بند رہی اور دونوں متحارب طلبہ گروپ پورے زوروشور سے جبتھہ بند ہوتے رہے اور یونیورسٹی کھلتے ہی اپنے پرانے مورچوں (ہاسٹلز) میں واپس چلے گئے۔ اگرچہ اس واقعہ کے بعد زرعی یونیورسٹی کے نگران وائس چانسلر ڈاکٹر محمد رفیق خان نے سٹوڈنٹس افیئرز کمیٹی کی سفارش پر انقلابی کونسل اور اسلامی جمعیت طلبہ کے چوبیس ارکان کو یونیورسٹی سے نکال دیا ہے لیکن خارج شدہ یہ طالب علم یونیورسٹی واپس جانے کے لیے بے تاب ہیں اور اپنے اپنے طور پر "اخراج" کے فیصلے کو خاطر میں نہیں لا رہے۔

طلبہ تنظیموں کے باہمی تناؤ کی یہ صورتحال صرف زرعی یونیورسٹی تک ہی محدود نہیں بلکہ شہر بھر کے کالجوں میں مذہبی و سیاسی جماعتوں کے ساتھ ساتھ گجر فیڈریشن، راجپوت سٹوڈنٹس فیڈریشن، ارائیں سٹوڈنٹس فیڈریشن، جٹ سٹوڈنٹس فیڈریشن، سپاہ صحابہ سٹوڈنٹس فیڈریشن اور امامیہ سٹوڈنٹ آرگنائزیشن بڑے شدومد سے ایک دوسرے کو پچھاڑ رہی ہیں اور اپنے سیاسی و کاروباری آقاؤں کے لیے کام کر رہی ہیں۔

آج بھی اگر آپ پرانے شہر کے گلی محلوں میں جائیں تو دیواروں پر اس طرح کی چاکنگ عام دیکھنے کو ملتی ہے۔ "ضیا ہم شرمندہ ہیں، تیرے قاتل زندہ ہیں، ارائیں فورس"۔ گو یہ فقرات اگست ۸۸ء میں ضیا کی موت کے فوری بعد فیصل آباد اور گردونواح کی ارائیں برادری نے ایک "برادری بھائی" کی حادثاتی موت پر تاسف کے اظہار کے طور پر لکھے تھے۔ اس بات سے انکار نہیں کہ صدر ضیاء الحق نے اپنے دور حکومت میں ارائیں برادری کو خصوصی توجہ دی اور لاتعداد ایسے ارائیں نوجوانوں کو اعلیٰ عہدوں پر تعینات کیا جو مطلوبہ اہلیت نہیں رکھتے تھے۔ اس طرح بہت سے لوگوں کو برادری بنیاد پر بھاری بھرکم "مراعات" کا علم ہوا اور دیکھا دیکھی پورے شہر میں مختلف برادریوں کی بے شمار انجمنیں اور تحفظ کی دعوے دار کمیٹیاں اگ آئیں۔ اسی تناظر میں فیصل آباد شہر میں ۸۸ء کے انتخابات ہوئے اور محض برادریوں کی حمایت سے نیم خواندہ اور ناخواندہ قسم کے کاروباری و زراعت پیشہ لوگ منتخب ہو کر اسمبلیوں میں آ گئے اور یوں ایک برادری کی اہمیت اور شناخت پہلے سے زیادہ ضروری اور نمایاں ہوگئی۔ نومنتخب شدہ افراد جو سخت "مقابلے" کے بعد چنے گئے تھے،

Marfat.com

انہوں نے اپنی "حفاظت" اور نمود و نمائش کے لیے طلبہ کی سرپرستی شروع کی اور شہر میں موجود زرعی یونیورسٹی اور کالجوں کے طلبہ کو اسلحہ' نقد پیسے اور مختلف جرائم کے بعد ضمانتوں کی صورت میں امداد دینا شروع کی اور بدلے میں قومی و صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات مخالفین کے گھروں اور دکانوں پر قبضوں' مخالفین کے قتل عام' ناجائز تجاوزات کی تعمیر اور گلی محلے کی لڑائیوں میں طلبہ کو استعمال کرنا شروع کیا۔

فیصل آباد میں طلبہ کو ایک نئی شناخت "عطا" کرنے کے سلسلے میں ایک سابق صوبائی وزیر تعلیم اور مشیر طلبہ امور ریاض فتیانہ کی "جدوجہد" کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا جو مقامی ہونے کے ساتھ ساتھ خود بھی متشدد طالب علم لیڈر رہے اور پے در پے تین صوبائی حکومتوں میں محکمہ تعلیم کی مقتدر شخصیت بھی رہے۔ اس دوران انہوں نے ایسے طالب علموں کی کھیپ بھی پیدا کی جو پنجاب بھر میں مختلف نوعیت کی وارداتوں کی مرتکب ٹھہری اور خونی پولیس مقابلوں کے بعد اب بھی اس کے آثار پوری طرح موجود ہیں۔ ادھر جماعت اسلامی کی ذیلی طلبہ تنظیم اسلامی جمعیت طلبہ بھی اپنی "قائد جماعت" سے اثر لیتی ہوئی ایک ایسا روپ دھار چکی ہے کہ فیصل آباد میں جماعت اسلامی کے دفتر میں موجود اسلامی جمعیت طلبہ پنجاب کے جنرل سیکرٹری ناصر خان نے اس بات کا اقرار کیا "ہمارے پاس بھی اسلحہ موجود ہے اور ہم نے یہ اسلحہ حفاظت خود اختیاری کے تحت اپنے پاس رکھا ہے اور جمعیت کے پاس جو اسلحہ ہے وہ لائسنسی ہے اور اس کے مالک وہ لوگ ہیں جو مختلف ممالک میں جماعت اسلامی کے پلیٹ فارم پر "جہاد" کر رہے ہیں اور وہ واپسی پر اسلحہ سمیت طلبہ کے پاس آتے ہیں اس لیے جمعیت کے طلبہ کے پاس ہر وقت اسلحہ رہتا ہے' ہمارا اسلحہ امن کے لیے ہے"۔

۱۸ ستمبر ۹۵ء کی صبح دس بجے زرعی یونیورسٹی فیصل آباد میں دو قدیمی حریفوں انقلابی کونسل اور اسلامی جمعیت طلبہ کے مابین اندھا دھند فائرنگ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ فائرنگ کا آغاز کلیہ زراعت کے عقبی لان سے ہوا تھا اور اس کا اختتام فتح ہال کے کمرہ نمبر ۷۔ ڈی کی کھڑکی سے تانی ہوئی کلاشنکوف کی گولی پر ہوا جو انقلابی کونسل کے چیئرمین زاہد مسعود کی کنپٹی میں پیوست ہو گئی۔

اس خونی ہنگامے کا آغاز فیکلٹی آف ایگریکلچر کے عقبی لان میں انقلابی کونسل کے ایک رکن کی طرف سے جماعت اسلامی کے امیر قاضی حسین احمد کو گالی دینے سے ہوا۔ قریب سے گزرتے ہوئے جمعیت کے پرجوش کارکن نے جب گالی سنی تو گالی دینے والوں

سے جھگڑنے لگا۔ موقع پر موجود انقلابی کونسل کے طلبہ نے جمعیت کے اس کارکن خالد محسن کی پٹائی شروع کر دی۔ یونیورسٹی میں جٹ برادری سے تعلق رکھنے والے دو اساتذہ حاجی محمد اسلم ڈائریکٹر ایڈوانسڈ سٹڈیز اور ریٹائرڈ استاد حاجی محمد کے بیٹوں کو جمعیت کے اس کارکن خالد محسن پر شک تھا کہ ۷ جولائی ۹۴ء کو انقلابی کونسل اور جمعیت کے تصادم کے موقع پر اس نے انقلابی کونسل کے چیئرمین یٰسین وینس اور جاوید تتلا پر گولی چلائی تھی' لہٰذا ان کے پاس بدلہ چکانے کا یہ سنہری موقع تا۔ انہوں نے فیکلٹی کے لان میں خالد محسن کی پٹائی شروع کر دی اور جمعیت کے دیگر طلبہ کو وہاں سے کھسکتے ہوئے موقع پا کر انقلابی کونسل کے طلبہ نے ان پر فائرنگ شروع کر دی۔ اس دوران خالد محسن نے شعبہ ہارٹیکلچر کے ڈاکٹر ابراہیم کے کمرے میں پناہ لینے کی کوشش کی لیکن انقلابی کونسل کے طلبہ نے اسے کمرے سے باہر گھسیٹ لیا۔ انقلابی کونسل کے ان حملہ آوروں میں کئی طلبہ ایسے تھے جو دو سال کے لیے یونیورسٹی سے خارج کیے گئے ہیں۔ یہ حملہ آور خالد محسن کو ہاسٹلوں کی طرف لے گئے۔ واضح رہے کہ ۱۸ ستمبر کی شام تک انقلابی کونسل کے پاس اقبال ہال' جناح ہال' سرسید ہال اور قاسم ہال کا قبضہ تھا جبکہ اسلامی جمعیت طلبہ ٹیپو ہال' قذافی ہال اور فتح ہال پر قابض تھی۔

جب خالد محسن کو انقلابی کونسل کے ارکان اپنے زیر قبضہ ہوسٹلز کی طرف لے جا رہے تھے تو اس دوران جمعیت نے ٹیپو ہال میں سے فائرنگ شروع کر دی' ٹیپو ہال جمعیت کا گڑھ تصور کیا جاتا ہے۔ انقلابی کونسل کے طلبہ نے بھی فائرنگ شروع کر دی جس کے بعد یونیورسٹی انتظامیہ کو پولیس کی بھاری نفری منگوانا پڑی۔ اس دوران جمعیت کے ایک وفد نے وائس چانسلر ڈاکٹر رفیق خان سے اپنے رکن خالد محسن کے اغوا پر احتجاج کیا اور اس کی بازیابی کا مطالبہ کیا۔ وائس چانسلر نے ہال وارڈن ڈاکٹر نذیر اور ناظم امور ڈاکٹر رانا نجم اشفاق کو پولیس کے ہمراہ انقلابی کونسل کے ہاسٹلز کی طرف بھیجا تاکہ خالد محسن کو بازیافت کرایا جا سکے۔ مذکورہ اساتذہ اور پولیس نے تمام ہاسٹلز چھان مارے لیکن مغوی نہ ملا۔ تھوڑی دیر بعد ایک تانگہ ٹیپو ہال کے گیٹ پر آکر رکا جس کی پچھلی سیٹ پر نیم مردہ خالد محسن خون میں لت پت پڑا تھا۔ اس کے سینے پر ایک رقعہ رکھا تھا' جس پر تحریر تھا ''جمعیت والو! ہمارا تحفہ قبول کرو' ''انقلابی کونسل''۔ فتح ہال سے جاری فائرنگ اور بھی تیز ہو گئی اور پھر انقلابی کونسل کا چیئرمین زاہد مسعود فائرنگ کی زد میں آ گیا۔ شدید زخمی مسعود ہسپتال میں دم توڑ گیا۔ سٹوڈنٹس افیئر کمیٹی کی سفارش پر ۱۸ ستمبر کی شام وائس چانسلر نے انقلابی

Marfat.com

کونسل اور جمعیت کے ارکان ماجد حسین، احمد رضا رضوی، ذوالفقار علی ہاشمی، محمد عمران، محمد شہزاد، واحد طارق، محمود حماد احمد، رضوان احمد، شاہنواز منہاس، شبیر رانا، مبشر حسین، شہباز اشرف، گل مرتضیٰ، شہزاد گل، عبدالجبار، طارق لطیف غلام علی اور وسیم فیض بھٹی کو یونیورسٹی سے خارج کر دیا۔

۶۰ء کے عشرے میں زرعی یونیورسٹی میں جمعیت فعال ہوگئی تھی اور اس کے مقابلے میں ایم ایس ایف کا ایک غیرفعال یونٹ کام کرنے لگا تھا۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے بعد پی ایس ایف، ایم ایس ایف اور آئی ایس او کے طلبہ نے جمعیت کے مقابلے میں متحد ہوکر "انقلابی کونسل" نام کی ایک تنظیم کی بنیاد رکھی۔ اس تنظیم کے قیام میں ٹوبہ ٹیک سنگھ کے منظور احمد لہری نے اہم کردار ادا کیا اور خود ہی انقلابی کونسل کے پہلے چیئرمین منتخب ہوئے۔ انقلابی کونسل کو طلبہ و طالبات میں بہت پذیرائی ملی۔ انقلابی کونسل کے بانیوں نے دیہاتی طلبہ کی اکثریت کو مدنظر رکھتے ہوئے مختلف برادریوں کو تعداد کے تناسب سے کونسل کے عہدیدار مقرر کرنا شروع کیا اور جٹ، آرائیں، راجپوت، اعوان اور گجر مختلف عہدوں پر تعینات کیے جانے لگے اور یوں انقلابی کونسل جو شروع میں مختلف سیاسی طلبہ تنظیموں کا آمیزہ تھی، اب صرف برادری کی بنیاد پر پہچانی جانے لگی اور جارحانہ انداز میں جمعیت کا مقابلہ کرنے لگی۔ اس دوران فیصل آباد کی کئی سیاسی شخصیات نے انقلابی کونسل کے اراکین کو "سہارے" دیئے جن کا سلسلہ نذیر کوہستانی (ایم این اے)، زاہد سرفراز، الیاس جٹ اور کئی دوسرے سیاست دانوں تک پہنچتا ہے۔ ۹۴ء میں انقلابی کونسل کے ۴۵ ارکان پیپلز پارٹی کے ایم۔ این۔ اے شاہد نذیر کے ملکیتی سنگیت سینما کی عمارت سے ۳۵ عدد جدید ترین رائفلوں سمیت گرفتار ہوئے لیکن بااثر سیاست دانوں نے مقدمہ تک درج نہ ہونے دیا۔

یونیورسٹی میں جہاں طلبہ کے ساتھ ساتھ اساتذہ کی اکثریت بھی مقامی تھی اور ظاہر ہے، علاقے کی چار پانچ اہم برادریوں میں سے تھی۔ لہٰذا اساتذہ نے بھی انقلابی کونسل کے اراکین کی مدد کرنا شروع کر دی، جو لوگ مذہبی لگاؤ رکھتے تھے، انہوں نے جمعیت کے ہاتھ مضبوط کرنا شروع کر دیئے اور دونوں تنظیمیں سیاست دانوں اور اساتذہ کی مرضی سے مسلح ہو کر آمنے سامنے ڈٹ گئیں اور ہاسٹلوں پر اپنا اپنا قبضہ جمانے میں کامیاب ہوگئیں۔ ۹۰ء سے زرعی یونیورسٹی میں مصروف عمل طلبہ تنظیموں کے طلبہ نے شہر میں باقاعدہ جرائم میں حصہ لینا شروع کیا اور ۹۰ء میں صرف زرعی یونیورسٹی کے ۱۰۰ کے قریب طلبہ پر مختلف نوعیت کے

Marfat.com

جرائم میں ملوث ہونے کی وجہ سے مقدمات درج ہوئے۔ اس سے پہلے ۱۹۷۷ء میں زرعی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر امجد محمد کو پاکستان زرعی تحقیقاتی کونسل کا چیئرمین مقرر کر کے صدر ضیاء الحق نے ایچی سن کالج لاہور کے پرنسپل ڈاکٹر غلام رسول چوہدری کو زرعی یونیورسٹی فیصل آباد کا نیا وائس چانسلر مقرر کر دیا۔ ڈاکٹر غلام رسول گریڈ ۱۹ سے براہ راست گریڈ ۲۲ میں تعینات ہو کر آئے تو زرعی یونیورسٹی میں موجود سینئر اساتذہ نے ان کے خلاف محاذ بنا لیا۔ اس دوران طلبہ یونین کے انتخابات ہوئے تو انقلابی کونسل کا پینل کامیاب ہوگیا اور جمعیت تمام عہدوں پر ہار گئی۔ ڈاکٹر غلام رسول کی طرف سے جمعیت کی سرپرستی اس وقت شروع ہوئی جب ایک دن ڈاکٹر غلام رسول انقلابی کونسل کے عبدالرحمان خالد سے الجھ پڑے۔ غلام رسول چوہدری نے عبدالرحمان خالد کو کہا: ”تم میرے بیٹے ہو“ جواب میں خالد نے کہا: ”نہیں ہرگز نہیں میں دھوبی کا بیٹا نہیں ہوں“ اور یہ بات پورے کیمپس میں پھیل گئی۔ اس دوران جمعیت کا انقلابی کونسل سے تصادم ہوگیا اور اس تصادم کے پیچھے راجپوت، ارائیں اور جاٹ برادری سے تعلق رکھنے والے ان پروفیسروں کا ہاتھ تھا جو ڈاکٹر امجد محمد کے بعد یونیورسٹی کا وائس چانسلر بننا چاہتے تھے۔

۲۳ ستمبر ۱۹۸۱ء میں اسلامی جمعیت طلبہ نے افغانستان میں روسی فوجوں کے خلاف برسرپیکار حکمت یار کو زرعی یونیورسٹی کی ایک تقریب میں مدعو کیا۔ یونیورسٹی میں گلبدین حکمت یار کے خطاب کے بعد انقلابی کونسل اور جمعیت کے درمیان جھگڑا شروع ہوگیا اور انقلابی کونسل کی طرف سے کی گئی فائرنگ سے جمعیت کے دو کارکن اکرم گورایہ اور عبدالشکور ہلاک ہوگئے۔ اسی دن شام کو ڈاکٹر غلام رسول کو وائس چانسلر کے عہدے سے ہٹا دیا گیا اور ان کی جگہ میاں ممتاز علی خان کو نیا وائس چانسلر مقرر کیا گیا اور انقلابی کونسل کے مطابق غلام رسول چوہدری انقلابی کونسل اور جمعیت کی دشمنی کو شروع کرانے والے ہیں۔

۲۷ جون ۹۱ء کو ڈاکٹر محمد رفیق خان کو زرعی یونیورسٹی کا ساتواں وائس چانسلر مقرر کیا گیا اور ساتھ ہی ان کی کمزور شخصیت اور انتظامی صلاحیتوں کے فقدان کی وجہ سے زرعی یونیورسٹی میں انقلابی کونسل اور جمعیت کے درمیان تصادم پوری شدت سے شروع ہوگیا۔ ڈاکٹر رمیض اپنے عہدے کی مدت میں توسیع کے خواہش مند تھے مگر ۲۶ جون ۹۵ء کو ان کی وائس چانسلرشپ کا چار سالہ دورانیہ ختم ہوگیا اور ساتھ ہی انہیں تاحکم ثانی نگران وائس چانسلر مقرر کر دیا گیا اور یونیورسٹی اساتذہ میں وائس چانسلرشپ حاصل کرنے کے لیے دوڑ

شروع ہوگئی۔ وائس چانسلر رفیق خان کے دور میں انقلابی کونسل اور جمعیت کے کارکنوں کے درمیان ۲۵ بار اندھا دھند فائرنگ کا تبادلہ ہوا جس میں درجنوں طالب علم زخمی ہوئے۔

۷ جولائی ۹۴ء کو دونوں متحارب طلبہ تنظیموں کے مابین فائرنگ سے انقلابی کونسل کا یٰسین وینس ہلاک ہوگیا جبکہ جاوید تلہ شدید زخمی ہو کر باقی زندگی کے لیے معذور ہوگیا۔ یٰسین وینس کا تعلق جاٹ برادری سے تھا۔ ۱۹۹۰ء سے ۱۹۹۴ء کے اختتام تک زرعی یونیورسٹی کے طلبہ پر مختلف جرائم کے سلسلے میں تین سو سے زائد مقدمات درج ہوئے جن میں کئی طلبہ کو سزا بھی ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی یونیورسٹی کے گردونواح میں طلبہ نے شہریوں کو لوٹنا شروع کر دیا اور اب تک سو سے زائد ڈکیتی اور راہزنی کے مقدمات درج ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ طلبہ نے مقامی سیاست دانوں کے لیے کام شروع کر دیا اور اپنے اپنے "دوست" سیاست دانوں کے مخالفین کو اغوا کر کے ہاسٹلز میں لایا جاتا' جہاں ان پر تشدد کے مختلف حربے آزمائے جاتے اور "تاوان" طلب کر کے رہا کیا جاتا۔ اس سلسلے میں فیصل آباد کے ایک ایم پی اے کو بھی طلبہ کی ایک تنظیم کے ہاتھوں تشدد کا نشانہ بننا پڑا۔ ۱۸ ستمبر یعنی یونیورسٹی بند ہونے سے پہلے یکم جنوری ۹۵ء سے اب تک تقریباً اڑھائی لاکھ روپیہ ان راہ گیروں سے یونیورسٹی طلبہ نے چھینا جو یا تو یونیورسٹی کے اندر سے گزر رہے تھے یا قریب سے ۳۵ افراد کو اس دوران شدید زخمی کیا گیا' جبکہ سو سے زائد بندوقیں اور دوسرا جدید اسلحہ طلبہ سے برآمد ہوا۔ زرعی یونیورسٹی میں انقلابی کونسل کی طاقت کو دیکھتے ہوئے شہر کے دوسرے کالجوں میں دیہاتی طلبہ نے اپنی اپنی برادری کے نام سے طلبہ فیڈریشن قائم کر لیں اور شہر کے سیاست دانوں اور کاروباری افراد سے "تعاون" حاصل کرنا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی فیصل آباد کی ایک سیاسی شخصیت نے جو خود بھی طالب علم لیڈر رہ چکی تھی' پورے فیصل آباد میں ایم ایس ایف (ج) کی تنظیم سازی کرائی اور طلبہ کو ہر طرح سے لیس کیا۔ اس تنظیم کا پہلا کارنامہ گورنمنٹ کالج سمن آباد میں ایک پروفیسر افتخار ملک اور نوجوان لڑکی کا قتل تھا۔ اس وقت شہر کے تعلیمی اداروں میں درج ذیل حالات ہیں:

۱۔ گورنمنٹ کالج دھوبی گھاٹ میں صرف ایم ایس ایف (ج) اور ایم ایس ایف گجر گروپ مصروف عمل ہیں۔ دھوبی گھاٹ کے علاقے میں ہونے والے پچاس فیصد جرائم گورنمنٹ کالج کے تنظیمی طلبہ کا "کارنامہ" ہوتے ہیں۔ اسلامی جمعیت طلبہ کے مطابق اس کالج کے طلبہ کو چوہدری شیر علی' ایم۔ این۔ اے' شاہد نذیر ایم۔ این۔ اے اور ریاض فتیانہ ایم۔ پی۔اے سپورٹ کرتے ہیں۔ اور وٹو گورنمنٹ کے دوران یہاں ایم۔ ایس۔

Marfat.com

ایف (ج) بنائی گئی۔ اسی کالج میں ایم اے کی تین طالبات کو اغوا کیا گیا اور کیمپس میں اسلحے کی ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔

۲ ۔ گورنمنٹ کالج سمن آباد میں ایم۔ ایس۔ ایف (ج) کے ہاتھوں پروفیسر افتخار ملک اور ایک لڑکی کے قتل کا واقعہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ اس کالج میں طلبہ کی ایسی تعداد موجود ہے جو کئی برسوں سے تعلیم چھوڑ چکی ہے لیکن وہ سیاست دانوں کی آشیرباد سے کالج میں موجود ہے اور ہر نوعیت کا جرم کر رہی ہے۔

۳ ۔ میونسپل ڈگری کالج عبداللہ پور چوک۔ اس کالج میں پی۔ ایس۔ ایف کے طلبہ کی اکثریت ہے اور ان طلبہ کے امداد کنندگان میں چوہدری بدر الدین (ایم۔ پی۔ اے) اور شوکت چیمہ وغیرہ مشہور ہیں۔ گزشتہ سال اس کالج میں ایک طالب علم قتل ہو گیا تھا۔ پی۔ ایس۔ ایف کے جو لوگ اس کالج میں طالب علموں کے روپ میں موجود ہیں ان میں منور گجر اور امجد وغیرہ کی عمریں ۳۵ سے ۴۰ سال کے درمیان ہیں اور ان کا اس کالج کے ساتھ روزگار وابستہ ہے۔

۴ ۔ اسلامیہ کالج سرگودھا روڈ میں بھی پی۔ ایس۔ ایف پوری طرح موجود ہے اور یہاں پر اشفاق چاچو نام کا ایک لڑکا گزشتہ بیس سال سے ڈیرے ڈالے ہوئے ہے اور طلبہ کے جرائم پیشہ گروہوں کی سرپرستی کرتا ہے۔ ان لوگوں نے کالج سے ملحقہ محلے میں ایک فلیٹ کرائے پر لے رکھا ہے جہاں مخالف طلبہ کو اغوا کر کے لے جایا جاتا ہے اور ان پر تشدد کیا جاتا ہے۔

۵ ۔ کامرس کالج عبداللہ پور روڈ میں جمعیت کا ہولڈ ہے اور یہاں پر اکثر مخالفین کو یا تو داخل ہی نہیں ہونے دیا جاتا اور اگر کوئی مخالف قابو میں آ جائے تو جمعیت ہاسٹل میں لے جا کر اس کا حشر کر دیتی ہے۔ اس کالج میں بھی اکثر اوقات ایم۔ ایس۔ ایف اور جمعیت اور پی۔ ایس۔ ایف اور جمعیت میں تصادم ہوتا رہتا ہے۔

۶ ۔ پنجاب میڈیکل کالج میں ایم۔ ایس۔ ایف (ج) اور جمعیت ایک دوسرے کے مدمقابل ہیں۔ جمعیت کے پاس اقبال ہال اور ابن سینا ہال نام کے ہوسٹل ہیں جب کہ ایم۔ ایس۔ ایف لیاقت ہال اور جناح ہال پر قابض ہے۔ دونوں طلبہ تنظیمیں اکثر اوقات گتھم گتھا رہتی ہیں اور ہوائی فائرنگ کا سلسلہ جاری و ساری رہتا ہے پچھلے دنوں کچھ طالب علم شہر میں ہونے والے جرائم میں گرفتار ہوئے تھے۔

۷ ۔ نیشنل کالج آف ٹیکسٹائل انجینئرنگ میں جمعیت کا مکمل ہولڈ ہے اور مخالفین میں

Marfat.com

ایم۔ ایس۔ ایف کے چند طلبہ شامل ہیں جبکہ جمعیت تمام معاملات میں خود مختار ہے اور ابھی تک کسی دوسری تنظیم کو اس کالج میں داخل نہیں ہونے دیتی۔

زرعی یونیورسٹی کے رجسٹرار شیخ محمد اکرم نے کہا انقلابی کونسل اور جمعیت کے طلبہ کے تعلقات باہر "سیاسی لوگوں" سے ہیں اور یونیورسٹی میں برادری ازم ہے جو بہت پرانا ہے۔ ۱۸ ستمبر کے واقعہ کے بعد ابھی تک کسی بھی طالب علم نے یا کسی تنظیم نے ہم سے رابطہ نہیں کیا۔ یہ جھگڑا دونوں تنظیموں کا ہے اس میں یونیورسٹی فریق نہیں ہے۔ ہم جب کسی گروپ کے طالب علم کو یونیورسٹی سے نکالتے ہیں تو اس کے حمایتی سیاست دان سفارش لے کر آ جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ کسی بھی گروپ نے مطالبہ نہیں کیا کہ یونیورسٹی کو کھولا جائے۔ وائس چانسلر ڈاکٹر رفیق نے انقلابی کونسل اور جمعیت پر قابو پانا یونیورسٹی انتظامیہ کے بس کی بات نہیں' ان دونوں کے تعلقات کا دائرہ بہت وسیع ہے اور اب دونوں تنظیموں کی خواہش ہے کہ وہ اپنے اپنے "حمایتی" اساتذہ کو یونیورسٹی میں اقتدار دلوائیں۔

اسلامی جمعیت طلبہ کے اراکین الزام لگاتے ہیں کہ یونیورسٹی میں انقلابی کونسل کے طلبہ کی پشت پناہی موجودہ ڈائریکٹر سٹوڈنٹس افیئر رانا محمد اشفاق اور ڈائریکٹر ایڈوانسنڈ اسٹڈی حاجی محمد اسلم کر رہے ہیں۔ رانا اشفاق زمانہ طالب علمی میں انقلابی کونسل کے جنرل سیکرٹری رہ چکے ہیں جب کہ حاجی محمد اسلم کا بیٹا جو زرعی یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہے خالد محسن کو گولیاں مارنے میں سرفہرست ہے۔

انقلابی کونسل کے رانا عباس خان نے بتایا کہ انقلابی کونسل ایک پرامن طلبہ تنظیم ہے اور اس نے ہمیشہ جمعیت کی جارحیت کا جواب دیا ہے۔ یہ الزام غلط ہے کہ انقلابی کونسل برادری ازم پر یقین رکھتی ہے یا مختلف برادریوں پر مشتمل ہے۔ انقلابی کونسل میں تمام برادریوں کی لوگ شامل ہیں اور ہم کسی بھی مذہبی اور سیاسی تقسیم سے بلند ہو کر صرف طلبہ کی حد تک یونین سازی پر یقین رکھتے ہیں اور بعض شرپسند لوگ مذہب کی آڑ لے کر زرعی یونیورسٹی میں فساد پھیلا رہے ہیں۔

Marfat.com

زرعی یونیورسٹی میں کروڑوں کے گھپلے

چونکہ ۶۰ء کے عشرے ہی سے اس بہت بڑی یونیورسٹی میں طلبہ تنظیموں کے طور پر مقامی ذات برادریوں کے اکٹھ "انقلابی کونسل" اور اس کی حریف کے طور پر جماعت اسلامی کی طلبہ تنظیم بہت زیادہ متحرک ہوگئی تھی جس سے یونیورسٹی کے اندر اور باہر اس کی حمایت اور مخالفت اور دونوں فریقوں میں سے کسی ایک کی مخالفت اور امداد کا سلسلہ شروع ہوا۔ مقامی سیاست دانوں سے لے کر جرائم پیشہ لوگوں تک مختلف عناصر نے اس ادارے میں طلبہ کے ذریعے اپنا اثر و رسوخ شامل کرنا شروع کیا اور ساتھ ہی یونیورسٹی سے وابستہ اساتذہ بھی اپنی ہمدردیاں بانٹنے لگے اور اساتذہ کی ایک بڑی تعداد انہی کی برادریوں کے نام پر قائم انقلابی کونسل سے جا ملی۔ جو لوگ مذہبی طور پر نظریاتی تھے انہوں نے اسلامی جمعیت طلبہ کو منتخب کیا اور یوں درس و تدریس اور زرعی تحقیق کے علاوہ یہاں "سیاست" بھی ہونے لگی، بہت وسیع اور بڑے بجٹ کا حامل ادارہ ہونے کی وجہ سے پہلے جہاں مختلف شعبوں کے سربراہان اپنے لیے مالی بدعنوانی کے مرتکب ہوتے تھے وہاں "تنظیمی طلبہ" بھی اپنے اپنے "ساتھی" کامیاب کرانے لگے اور تقریباً ایک ماہ میں ڈیڑھ کروڑ روپے بجٹ والی یہ درس گاہ تدریسی و تحقیقی اعتبار سے خالی ہونے لگی اور محض سیاست اور دھڑے بندیوں کا گڑھ بن کر رہ گئی اور وائس چانسلر سے لے کر چپڑاسی تک کے عہدوں پر بدعنوانی ہونے لگی۔ اس دوران یہ معمول بن گیا کہ انقلابی کونسل اور اسلامی جمعیت طلبہ کے درمیان آئے دن کی مسلح جنگ سے یونیورسٹی انتظامیہ نے یونیورسٹی بند کرنا شروع کر دی۔ امتحانات میں تاخیر کے علاوہ تمام تدریسی و تحقیقی کام رک گیا لیکن مخصوص بجٹ کا اصراف جاری رہا اور یونیورسٹی کے مجاز افراد نے مل کر اپنے اپنے "سیاسی حواریوں" کو اور نااہل رشتہ داروں کو یونیورسٹی میں بھرتی کرنا شروع کیا اور اس کے بہت زیادہ وسائل میں

Marfat.com

"حصہ دار" کے طور پر شامل کر لیا۔

زرعی یونیورسٹی فیصل آباد میں چار سال کی مدت کے لیے ۲۲ گریڈ میں وائس چانسلر کے طور پر یونیورسٹی کے کسی سینئر استاد کو تعینات کیا جاتا اور یا پھر حکومت اپنی مرضی سے کسی بھی شخص کو جو پاکستان میں کہیں بھی زرعی و سائنسی تعلیم سے وابستہ ہو وائس چانسلر مقرر کر دیتی۔ اس کی پہلی مثال ڈاکٹر غلام رسول چودھری کی بطور وائس چانسلر تقرری تھی جو ایچی سن کالج لاہور کے پرنسپل تھے' لیکن ضیاء الحق نے انہیں ۱۹ ویں سے براہ راست ۲۲ ویں گریڈ میں وائس چانسلر کے طور پر زرعی یونیورسٹی میں تعینات کر دیا۔ ایسا تعلیمی ادارہ جہاں پہلے سے سینئر اساتذہ طلبہ کی مدد سے یونیورسٹی کی سطح پر عملی سیاست میں بھی مصروف ہوں وہ اس نوعیت کی کسی تقرری کو کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ اس طرح چودھری غلام رسول کی سیاسی تقرری نے یونیورسٹی میں وائس چانسلر شپ کے لیے آس لگائے بیٹھے لوگوں کو بھڑکا دیا اور انہوں نے نہ صرف متشدد طلبہ سیاست کا مکمل ساتھ دیا' بلکہ اپنے اپنے شعبوں میں جہاں وہ تعینات تھے درس و تدریس اور تحقیق کے بجائے' اس شعبے کے بجٹ کو طلبہ کی مدد سے اپنے استعمال میں لانا شروع کر دیا۔ اس تناظر میں وائس چانسلر نے بھی طلبہ کے ایک دھڑے کو اپنا ہمنوا بنایا اور انہیں ان کے حمایتی اساتذہ سمیت یونیورسٹی وسائل سمیٹنے کی کھلی چھٹی دے دی۔ اس طرح عملی طور پر چودھری غلام رسول کے عہدے سے یونیورسٹی میں درس و تدریس کو پس پشت ڈالتے ہوئے مالی و انتظامی بد عنوانیوں کا ایک سلسلہ شروع کیا گیا جو اپنی پوری شدت کے ساتھ دم تحریر نہ صرف موجود ہے بلکہ اسی "سیاست پسندی" کے طفیل گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے یہ بہت اہم درس گاہ مکمل طور پر بند پڑی ہے لیکن اس کا عملہ کروڑوں روپے نہ صرف وصول کر رہا ہے بلکہ اپنی رہائش گاہوں تک پر صرف کر رہا ہے۔

زرعی یونیورسٹی میں عموماً یا تو وائس چانسلر کی مدت ملازمت کا اختتام قریب آنے پر انتظامی طور پر ہل چل مچتی ہے یا پھر نئے وائس چانسلر کی تقرری کی دوڑ میں تمام شعبے ہل کر رہ جاتے ہیں۔ ان دنوں کچھ ایسی ہی کیفیت ہے کہ موجودہ وائس چانسلر ڈاکٹر محمد رفیق خان جو ۲۷ جون ۹۵ء کے بعد سے تا حکم ثانی قائم مقام وائس چانسلر کے طور پر یونیورسٹی میں تعینات ہیں۔ ان کی چار سالہ مدت ختم ہو جانے کے بعد حکومت پنجاب کو اس عہدے کے لیے ابھی تک کوئی فرد نہیں مل سکا اور اس تناظر میں یونیورسٹی میں طلبہ کے خونی تشدد (جس کے باعث یونیورسٹی ۱۸ ستمبر سے بند ہے) سے لے کر وائس چانسلر کے عہدے کے امیدوار

Marfat.com

لوگوں کی دوڑ دھوپ تک یونیورسٹی میں شدید نوعیت کی مالی و انتظامی بدعنوانیوں کا بازار گرم ہے۔

ان بدعنوانیوں کے ذکر کی ابتدا کرتے ہوئے تمام ذرائع اور افراد قائم مقام چانسلر ڈاکٹر محمد رفیق کا نام سرفہرست رکھتے ہیں۔ جن پر سب سے بڑا الزام یہ ہے کہ وہ فیصل آباد کے مہنگے ترین علاقے پیپلز کالونی میں اپنا معمولی مکان گرا کر ۷۰ لاکھ روپے سے عالی شان محل نما مکان تعمیر کرا رہے ہیں اور تعمیر کا یہ کام یونیورسٹی کے وسائل سے ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ لیبر تک یونیورسٹی ملازمین پر مشتمل ہے۔ باوثوق ذرائع اس بات کا بھی انکشاف کرتے ہیں کہ زرعی یونیورسٹی کے تحقیقی فارم "پارس" کے کمزور پودوں کے لیے پانچ سو بوریاں کھاد خریدنے کے انتظامات کیے لیکن اسی دوران ڈاکٹر محمد اسلم نے حیرت انگیز طور پر کھاد کی ان پانچ سو بوریوں کا آرڈر سیمنٹ کی بوریوں میں بدل دیا اور یہ سیمنٹ ڈاکٹر محمد رفیق خان کے زیر تعمیر "عصمت محل" واقع پیپلز کالونی میں پہنچا دیا۔ جہاں زرعی یونیورسٹی کے ملکیتی ٹریکٹر، ٹرالیاں اور چوکیدار تعمیری کام میں دن رات مصروف تھے۔

ڈاکٹر محمد رفیق خان نے زرعی یونیورسٹی میں زیر تعلیم اپنے بڑے بیٹے فرخ ہمایوں کو اعلیٰ درجے میں کامیاب کرانے اور بیرون ملک اعلیٰ تعلیم دلوانے کے لیے یونیورسٹی رولز تک میں ردو بدل کر دیا۔ انہوں نے فرخ ہمایوں خان کو کینیڈا میں سکالر شپ دلوانے کے لیے یونیورسٹی کا ایک سمسٹر معینہ مدت سے اڑھائی ماہ پہلے شروع کرا دیا اور پھر فوری طور اپنے بیٹے کو یونیورسٹی کے شعبہ انٹامالوجی میں لیکچرار بھی مقرر کر دیا۔ فرخ ہمایوں کو گولڈ میڈل دلوانے کے لیے اساتذہ پر دباؤ ڈالا گیا اور بعد میں اس کو یونیورسٹی میں بطور لیکچرار جوائن کرا کے کینیڈا میں پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے بھیج دیا کیونکہ اگر یونیورسٹی کا سمسٹر اپنی معیاد پر ختم ہوتا تو اس صورت میں کینیڈا میں پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے یونیورسٹی کے کسی ذہین استاد کو بلایا جانا تھا۔

۲ سال پہلے زرعی یونیورسٹی کے گرین سٹوریج پراجیکٹ کے لیے غیر ملکی امداد سے ۳۰ لاکھ روپے میں دو اعلیٰ پجارو گاڑیاں خریدی گئیں۔ ان میں سے ایک پجارو گاڑی نمبر ایف ڈی کیو ۶۶۶۶ ڈاکٹر رفیق خان نے اپنے چھوٹے صاحبزادے بابر رفیق کو عنایت کر دی۔ نوجوان بابر رفیق خان نے دو سال تک قیمتی پجارو استعمال کی اور اس دوران گاڑی کی مرمت کیلئے ۳۰ ہزار روپے یونیورسٹی فنڈ سے جاری کیے گئے۔ پچھلے دنوں اسی پجارو گاڑی کے خفیہ "نیلام" کا بندوبست کیا گیا اور ڈاکٹر محمد رفیق خان کے ایک عزیز کو یہ قیمتی گاڑی

محض ۲۵ ہزار روپے میں تفویض کر دی گئی۔ جب کہ دوسری پجاڑو گاڑی اس پراجیکٹ میں ڈاکٹر محمد رفیق خان کے ساتھ ڈاکٹر صوفی منظور احمد کے پاس ہے۔ گرین پراجیکٹ سے دونوں اساتذہ کو ایک کروڑ روپے کی بچت ہوئی پروفیسر ڈاکٹر منظور احمد صوفی کافی عرصے سے ریٹائر ہو چکے ہیں لیکن مذکورہ بالا پروجیکٹ کے لیے خصوصی طور پر ان کی خدمات حاصل کی گئیں لیکن پھر بھی پراجیکٹ مکمل نہ ہو سکا۔

زرعی یونیورسٹی کی انتظامیہ نے نجف علی لائبریرین کی ریٹائرمنٹ کے بعد چوہدری محمد اقبال کو لائبریرین مقرر کیا۔ انہوں نے آتے ہی لائبریری میں موجود کتب کی گنتی کرائی تو معلوم ہوا کہ ۳۵ ہزار انتہائی قیمتی کتب چوری ہو چکی ہیں۔ چوہدری محمد اقبال نے کتب کی اس چوری کے بارے میں یونیورسٹی انتظامیہ کو ایک تحریری رپورٹ دی لیکن کچھ بھی نہ ہو سکا۔

اس رپورٹ کے فوراً بعد یونیورسٹی انتظامیہ نے ریٹائرڈ لائبریرین نجف علی کو دوبارہ لائبریرین بنا دیا اور چودھری محمد اقبال کی تیار کردہ رپورٹ کو جھوٹ کا پلندہ قرار دے دیا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ۲۱ برس کی عمر میں نجف کو دوبارہ ۱۹ ویں گریڈ میں لائبریرین بنا دیا گیا اور کروڑوں روپے مالیت کی کتب چوری کا معاملہ ختم کر دیا گیا۔

ڈاکٹر محمد رفیق کی بدعنوانیوں کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے وائس چانسلر منتخب ہوتے ہی میرٹ کے بغیر تقرریوں کا سلسلہ شروع کر دیا جس کی سب سے بڑی مثال یونیورسٹی کے ایک استاد رانا عبدالجبار کی بطور سبجیکٹ سپیشلسٹ تقرری تھی۔ سوشل سائنس کے پروفیسر کو ماہر مضمون بنا کر اس مضمون کے سلسلے میں ان سے کوئی کام نہیں لیا گیا بلکہ یونیورسٹی کا پراجیکٹ ڈائریکٹر بننے کے بعد اس نے فیصل آباد میں ایک کروڑ روپے کا بنگلہ تعمیر کرایا اور یونیورسٹی میں مرمت کے کاموں میں لاکھوں روپے کمائے۔ رانا عبدالجبار ریٹائرمنٹ کے بعد بھی اپنی موت تک یونیورسٹی سٹاف کی اے۔ سی۔ آر لکھتے رہے۔

یونیورسٹی بچاؤ تحریک زرعی یونیورسٹی فیصل آباد کی طرف سے جاری کیے گئے ایک پمفلٹ بعنوان ڈریکولا ۱۹۹۵ء میں قائم مقام وائس چانسلر رفیق خان پر یونیورسٹی وسائل کے غلط استعمال' آڈیٹوریم کی مرمت اور خراب جنریٹر کی مرمت پر لاکھوں روپے کی خرد برد کے الزامات عائد کیے گئے ہیں۔ یونیورسٹی بچاؤ تحریک کے مطابق گزشتہ چند مہینوں میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ زرعی یونیورسٹی فیصل آباد کے وائس چانسلر رفیق خان ”عصمت محل“ کی

Marfat.com

تکمیل کے لیے یونیورسٹی فنڈز میں خورد برد کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے اپنے عہدہ کی مدت میعاد ختم ہونے کے چند روز پہلے مختصر کنٹریکٹ دیے۔ جن کی تفصیلات یونیورسٹی لورز نے یونیورسٹی بچاؤ تحریک کے دفتر میں پہنچائی۔ ان تفصیلات کے مطابق (۱۰۰۰۰ کلو واٹ گنجائش کا جنریٹر کو چالو کرنے کا ٹھیکہ) یہ جنریٹر آئی۔ ڈی۔ اے پروگرام کے تحت ۱۹۷۴ء میں خریدا گیا لیکن' چند وجوہات کی بنا پر اس نے کام شروع نہ کیا۔ اب تقریباً ۲۱ سال بعد جب کہ اس کے بیشتر پرزے یا تو چوری ہو چکے ہیں یا انہیں زنگ کھا گیا ہے۔ زیرک وائس چانسلر نے "یونیورسٹی فنڈز بچانے" اور جنریٹر کو چالو کرنے کے لیے اپنے منظور نظر افراد پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی جس نے ایک من گھڑت رپورٹ میں جنریٹر کو چالو کرنے کے لیے ۱۰ لاکھ ۲۰ ہزار روپے کی تجویز پیش کی اور بولی کے لیے ٹھیکہ داروں کو بلایا گیا۔ اس بات کا کہیں ذکر نہیں کہ یہ فنڈز کہاں سے حاصل کیے جائیں گے لیکن جنریٹر چالو حالت میں لانے کی منظوری دے دی گئی۔

آڈیٹوریم کی مرمت

۱۹۹۳ء میں کئی لاکھ روپے کی لاگت سے آڈیٹوریم کی مرمت کی گئی۔ مرمت کا کام اتنا غیر تسلی بخش تھا کہ پہلی ہی بارش میں چھت ٹپکنا شروع ہوگئی۔ اب چھت کی مرمت کا مکمل تخمینہ ایک لاکھ ۵۰ ہزار روپے کے علاوہ مزدوری لگایا گیا۔ اس کا ٹھیکہ اسٹیٹ کیئر ڈیپارٹمنٹ (جو کہ چانسلر صاحب کے محل کی تعمیر کا کام بھی انجام دے رہا ہے۔) کو دینے کی تجویز دی گئی۔

۳ - لائبریری کی پہلی منزل اور آڈیٹوریم میں ایئرکنڈیشننگ پراجیکٹ پر اٹھنے والے اخراجات میں ٦ لاکھ روپے لائبریری اور ۸ لاکھ روپے آڈیٹوریم کے لیے مختص کیے گئے۔ اس منصوبے میں ۶۰ اور ۱۲۰ ٹن کے کمپریسر چالو کرنا' آڈیٹوریم میں ڈکٹنگ' انٹروڈکٹنگ' سوئچ اوور سسٹم اور یونٹ روم کی مرمت شامل ہے۔ لائبریری کی پہلی منزل نیو کیمپس کی دوسری عمارتوں کے ساتھ ہی تعمیر کی گئی تھی۔ رفیق خان کو اچانک اپنی "رخصتی" سے چند ہفتے پہلے ہی خیال کیوں آیا کہ اس فلور کو ایئرکنڈیشنڈ کرنا چاہیے۔

۴ - گوبند پورہ گیٹ سے جناح ہال اور بابر ہال سے قاسم ہال چوک تک سڑک کی مرمت اور زیرو پوائنٹ پر چوک کے تعمیر کے لیے ۲ لاکھ ۴۷ ہزار پانچ سو روپے تخمینہ لگایا گیا اور یہ کیس فنڈز کے حصول کے لیے جمع کرا دیا گیا۔ فیصلہ ہوا تھا کہ انجینئرنگ کنسٹرکشن

Marfat.com

ڈیپارٹمنٹ کے رواں مالی سال کے غیر ترقیاتی فنڈز سے ایک لاکھ روپیہ مہیا کیا جائے گا۔ جب کہ باقی ماندہ ایک لاکھ ۴۷ ہزار روپے کی رقم خزانچی سے قرض لی جائے گی جس پر اس نے آمادگی کا اظہار کیا۔ قرض کی یہ رقم انجینئرنگ کنسٹرکشن ڈیپارٹمنٹ کے آئندہ سال کے بجٹ سے واپس کر دی جائے گی۔ پروجیکٹ کے لیے ۹۵-۰۵-۱۹ کو اخبارات کے ذریعے ٹینڈر طلب کیے گئے جو ۹۵-۰۶-۰۶ کو کھولے گئے۔ ذرا اس تیزی کا اندازہ کیجئے۔ گوبند پورہ گیٹ سے جناح ہال تک جانیوالی سڑک صرف پیدل' سائیکل سوار اور موٹر سواروں کے لیے بنائی گئی۔ حالانکہ جولائی ۹۴ء میں وینس کے قتل کے بعد سے یہ گیٹ ہر قسم کی ٹریفک کے لیے بند ہے۔

۵ - طارق ہال کی مرمت و آرائش کے لیے ایک لاکھ ۴۹ ہزار سات سو پچاس روپے کا تخمینہ لگایا گیا جس کے لیے ۹۵-۰۵-۱۳ کو قومی اخبارات کے ذریعے ٹینڈر طلب کر لیے گئے۔ جنہیں ۹۵-۰۶-۰۶ کو کھولا گیا۔ اس کام کے لیے کم سے کم بولی ۲ لاکھ ۴۷ ہزار ۸ سو ۹۰ روپے وصول ہوئی جس کے مطابق اسے یہ کنٹریکٹ دے دیا گیا۔

Marfat.com

غلام مصطفےٰ کھر نے سینکڑوں ایکڑ اراضی کیسے بنائی؟

جی ٹی روڈ پر شاہدرہ اور امامیہ کالونی کے درمیان واقع سابق وزیراعظم میاں نواز شریف خاندان کے ملکیتی کارخانے اتفاق فونڈریز کی شمالی دیوار کے ساتھ ساتھ کالا خطائی روڈ نام کی ایک خستہ حال سڑک چلتی ہوئی جی ٹی روڈ کو ضلع شیخوپورہ کے ایک معروف قصبے نارنگ منڈی سے ملاتی ہے۔ کالا خطائی روڈ شہرت کی خاص وجہ گزشتہ کئی برسوں سے اس سڑک کے اردگرد دیہات میں پناہ گزین پنجاب بھر کے پیشہ ور قاتل اور خطرناک ڈاکو تھے لیکن اب اس سڑک کی وجہ شہرت سابقہ گورنر پنجاب اور وفاقی وزیر بجلی و پانی ملک غلام مصطفیٰ کھر کا سو سے زائد مربع اراضی پر موجود زرعی فارم ہے۔

اسی کالا خطائی روڈ پر نارنگ منڈی کی طرف سفر کرتے ہوئے تقریباً ۳۰ کلومیٹر کے فاصلے پر سڑک کے بائیں کنارے "اولیا شریف" نامی گاؤں کی تختی نصب ہے۔ یہ گاؤں مدت ہوئی دریابرد ہوچکا ہے اور اس کے باسی بھوک سے بچنے کے لیے شہروں کا رخ کر چکے ہیں۔ سڑک کے ساتھ ساتھ مشہور نہر بی آر بی بہتی ہے۔ یہیں سے جو سڑک جنوب کی طرف واقع دریائے راوی اور ہندوستانی سرحد کو نکلتی ہے، کبھی یہ سڑک مدت کے دریابرد ہوئے گاؤں تلونڈی شیر خان کو کالائی خطائی روڈ سے جوڑتی تھی۔

غلام مصطفیٰ کھر نے ۹۳ء کے انتخابات کے بعد وفاقی وزیر بجلی و پانی کا عہدہ سنبھالتے ہی چھ کلومیٹر لمبی سڑک کو سطح زمین سے پانچ فٹ اونچی اور ۲۴ فٹ چوڑی کرانے کی منظوری حاصل کی۔ پہلے تو فوج کی خفیہ ایجنسی آئی ایس آئی نے اس سڑک کی تعمیر رکوانے کی کوشش کی کیونکہ اس ایجنسی کا خیال تھا کہ چونکہ یہ سڑک ہندوستانی سرحد کے بالکل قریب تک جاتی ہے، لہٰذا یہ ملکی دفاع کے لیے خطرناک ہے۔ لیکن طاقتور وفاقی وزیر نے یہ سڑک تعمیر کروالی۔

اس سڑک پر حکومت پنجاب کے توسط سے لوکل گورنمنٹ شیخوپورہ نے تقریباً ۵۰ لاکھ روپیہ صرف کیا' جس میں سے ۲۰ لاکھ روپیہ صرف اس ۲۴ فٹ چوڑی اور ۵ فٹ اونچی مٹی کا تھا' جو اس سڑک پر ڈالی گئی۔ اس سڑک پر لوکل گورنمنٹ اور بلدیہ مریدکے کی مشینری مسلسل پانچ ماہ تک کام کرتی رہی اور دن رات کی محنت کے بعد ایک مضبوط سڑک تیار کردی گئی۔

۱۹۵۵ء اور ۱۹۷۸ء کے شدید ترین سیلابوں کے باعث بی آر بی نہر کے جنوب میں واقع ۸۰ فیصد دیہات دریابرد ہوگئے ہیں' اس لیے اس جانب انسانی آبادی بہت کم ہے اور جو زمین ہے' اس پر دریا بردگی کے باعث ۳ سے ۴ فٹ تک ریت ملی مٹی چڑھ چکی ہے' جس کے باعث یہ اراضی ناقابل کاشت ہوگئی ہے اور پھر آہستہ آہستہ اس پر جنگل اگنے لگا اور اس بیلہ نما جنگل میں علاقہ کے اشتہاری ملزموں نے ڈیرے ڈال دیے اور قریب واقع ہندوستانی سرحد سے سمگلنگ ہونے لگی اور یہ سلسلہ پوری شدت کے ساتھ آج بھی جاری ہے۔

ملک غلام مصطفیٰ کھر نے پیپلزپارٹی کی پہلی حکومت کی برطرفی کے دوران اپنے اہم "کام" کے عوض نگران وزیراعظم غلام مصطفیٰ جتوئی کی حکومت سے سب سے بڑا فائدہ یہ اٹھایا کہ کالا خطائی روڈ پر ۸۰ مربع اراضی خریدی۔ اس کے بعد غلام مصطفیٰ کھر نے جلوپارک لاہور سے ملحق دو مربع رہائشی اراضی بھی خریدی۔ غلام مصطفیٰ کھر نے اس کے بعد ۳۶ مربع اراضی مزید کالا خطائی روڈ کے قریب خریدی۔

تین مختلف ذرائع سے غلام مصطفیٰ کھر کی اراضی کے بارے میں متضاد اعداد و شمار سامنے آئے۔ مقامی لوگوں نے بتایا کہ کھر تقریباً ۱۰۰ مربع اراضی خرید چکے ہیں اور اتنی ہی اراضی پر قابض ہو چکے ہیں جو ان کی خرید کردہ اراضی سے ملحق ہے۔ ایک اخباری رپورٹ میں ۸۰ مربع اراضی کا دعویٰ کیا گیا جبکہ غلام مصطفیٰ کھر کے فارم پر ان کے منشی غلام حسین نے بتایا کہ کل ۴۰ مربع اراضی ہے۔

کھر کی زمینوں کے پٹواری رانا شبیر نے بتایا کہ اس کے حلقے میں کھر نے چک دھیدو' تلونڈی شیرخان' اکرام پورہ اور کوٹلی ہیراں کے دیہات میں ۴۵ مربع اراضی (۱۱۲۵ ایکڑ) خریدی ہے۔ ایک اور حلقہ کے پٹواری نذیر حسین شاہ نے بتایا کہ کھر نے اس کے حلقہ میں موضع اولیا پور کی ۱۹ مربع اراضی (۴۷۵ ایکڑ) ۹۰ء سے لے کر ۹۴ء کے آخر تک خریدی۔

Marfat.com

بعض مقامی لوگوں نے یہ بھی بتایا کہ غلام مصطفےٰ کھرنے دریا برد ہونے والے گاؤں تلونڈی شیر خان کی کل اراضی ۵۵ مربع میں سے ۲۰ مربع اراضی خریدی اور باقی ماندہ ۳۵ مربع اراضی (۸۵۷ ایکڑ) پر قبضہ کر لیا۔ مذکورہ اراضی کے مالک چھوٹے چھوٹے زمینداروں کی ہمت نہیں کی وہ ملک غلام مصطفیٰ کھر سے ٹکر لے سکیں۔ مذکورہ بالا دریا برد اراضی کو قابل کاشت بنا سکیں' جس پر دریا بردگی کی وجہ سے ۴ سے ۵ فٹ تک مٹی ملی ریت چڑھ چکی ہے۔

کھر کی زمینوں واقع چک دھیدو' تلونڈی' اکرام پورہ اور کوٹلی ہیراں کے حلقہ کے پٹواری نے مزید بتایا کہ ان کے پاس جو رجسٹریاں خرید کی گئی زمین کی آئی ہیں ان میں ۲ سے لے کر ۳ روپے فی ایکڑ درج ہے۔ واضح رہے کہ زمین کا خریدار ہمیشہ حق شفع کے دعویٰ سے بچنے کے لیے اصل رقم میں رجسٹری وغیرہ کا خرچ جمع کرنے کے علاوہ جان بوجھ کر زیادہ رقم ظاہر کرتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دفتری اخراجات شامل کر کے بھی رجسٹریوں میں قیمت صرف ۲ سے ۳ ہزار تک ہیں جبکہ ان کی اصل قیمت کیا ہوگی۔ بعض مقامی لوگوں کے مطابق کھرنے صرف کاغذی کارروائی کا بھرم رکھا ہے حقیقت میں وہ حیران کن حد تک تھوڑے پیسے خرچ کر کے لا محدود زمینوں پر قابض ہوگئے ہیں اور اب جن بدنصیبوں کی زمینیں کھر کی زمینوں سے ملحق ہیں وہ ساری عمر اپنی موروثی زمین کی نشاندہی کو ترستے رہیں گے۔

۹۴ء کے بعد مذکورہ زمینوں پر غلام مصطفےٰ کھرنے ابتدائی کام شروع کیا لیکن دریا بردگی کی وجہ سے تمام اراضی پر چار سے پانچ فٹ تک ریت چڑھ جانے کی وجہ سے یہ زمین ناقابل کاشت ہوگئی تھی۔ لہٰذا اس ساری زمین کو قابل کاشت اور پھر زرخیز بنانے کے لیے بہت سرمائے کی ضرورت لیکن اس آڑے وقت میں مصطفیٰ کھر کی وفاقی وزارت آڑے آئی۔

پانی و بجلی کی وزارت ملتے ہی کھرنے مقامی واپڈا ڈویژن کے تمام تر وسائل ناقابل کاشت اراضی پر جھونک دیے اور تقریباً ۴۵ مربع اراضی پر سے واپڈا کے ٹریکٹروں اور مشینوں نے واپڈا ہی کی افرادی قوت کی مدد سے ۴ سے ۵ فٹ تک بچھی مٹی نکال کر زمینوں کے درمیان سڑکیں بنانے کے لیے کناروں پر چڑھا دی اور یوں عرصہ دراز کی بنجر پڑی زمین قابل کاشت سے زرخیز ترین کے زراعتی زمرے میں داخل ہوگئی۔

فارم پر کام کرنے والے ایک ملازم نے بتایا کہ ۱۱۲۵ ایکڑ کو زرخیز بنانے کے بعد

Marfat.com

ساری مشینری دریا پار کی زمینوں کو قابل کاشت بنانے میں مصروف ہوگئی اور اس ساری مشینری کو واپڈا کے ملازمین ہی چلاتے رہے اور لاہور میں واقع واپڈا ہی کے ایک پٹرول پمپ سے روزانہ ڈرموں کے حساب سے تیل فارم میں پہنچتا رہا۔ اس کام کے لیے واپڈا کا ایک ٹرک مخصوص رہا اور واپڈا کے سینکڑوں ملازمین یہاں کام کر رہے ہیں۔

واپڈا کے ایک ٹرک ڈرائیور نے بتایا کہ اس کی ڈیوٹی یہ ہے کہ وہ روزانہ ٹرک سمیت فارم پر حاضری دے بصورت دیگر اس کی غیر حاضری تصور کی جائے گی۔ ڈرائیور نے مزید بتایا کہ میں روزانہ لاہور سے مویشیوں کے لیے ونڈ وغیرہ لاتا ہوں اور دوسرے شہروں سے مویشی لاتا ہوں اور یہاں سے مختلف منڈیوں میں لے جاتا ہوں' میری تو نوکری گزشتہ ایک سال سے یہیں ہے۔

اس کے علاوہ واپڈا کے چار ٹرک ہر وقت فارم پر موجود رہتے ہیں جن کے ڈرائیور کو فارم کے لنگر خانے سے کھانا ملتا ہے اور یہیں ان کی محکمانہ حاضری لگتی ہے۔ ایک ٹیوٹا کرولا پک اپ sad ۵٦۴ نمبر کی بھی فارم پر چوبیس گھنٹہ کی ڈیوٹی ہے تاکہ بوقت ضرورت کام آ سکے۔ واپڈا کا مقامی ا یکسین صرف فارم کے معاملات کی دیکھ بھال کرتا ہے اور گاڑیوں اور ملازمین کو فوری ضرورت کے تحت فارم پر ان کی تعیناتی کر دی جاتی ہے۔

تقریباً ۱۲ مربع اراضی ہندوستان کی سرحد کے ساتھ ملتی ہے اور رینجرز کی دو چوکیاں جنڈیالہ پوسٹ اور فتح پور پوسٹ اپنے ایک سو دس فٹ اونچے ٹاوروں سمیت اراضی کے قریب واقع ہیں۔ جنڈیالہ رینجرز پوسٹ کے ایک افسر نے بتایا کہ انہیں کھر سے کوئی شکایت نہیں بلکہ وہ تو پوسٹ پر تعینات جوانوں کو روزانہ دو وقت دودھ پہنچاتے ہیں لیکن بعض مقامی لوگوں کے بقول رینجرز سمیت کسی بھی فرد کو اجازت نہیں کہ وہ کھر کے فارم کی حدود میں بغیر اجازت داخل ہو سکے۔

کھر کے فارم کو نارنگ منڈی کی پاور سپلائی میں سے ان کے وزیر بنتے ہی بجلی فراہم کی گئی اور اس وقت ۴ کے قریب ٹربائین زمین سیراب کر رہی ہیں۔ مقامی لوگوں کا سب سے بڑا خدشہ یہ ہے کہ رفتہ رفتہ ان کی ملکیتی زمینیں بھی کھر فارم میں شامل ہوتی جائیں گی کیونکہ تکونڈی شیر خان کی ۳۵ مربع اراضی پہلے ہی ان کے سایہ ملکیت میں چلی گئی ہے اور مقامی لوگ تو اتنے وسائل نہیں رکھتے کہ دریا برد ہوئی زمین کو مکمل طور پر کاشت کے قابل بنا سکیں لیکن کھر کے وسائل حکومتی وسائل ہیں اور حکومتی وسائل سے سب کچھ ممکن ہے۔

Marfat.com

کھر کے زرعی فارم پر اس وقت ۳۰۰ کے قریب مویشی' ۱۰۰ اعلیٰ نسل کے کتے' ۱۵۰ بھیڑیں' ٦ ہرن اور ۲ نیل گائے اور بہت سے مور اور تیتر ہیں۔ مظفر گڑھ اور لیہ کے تقریباً ۷۰ ملازمین زمینوں اور مویشیوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں' جن کو فی کس ہزار روپیہ تنخواہ اور کھانا دیا جاتا ہے۔ تمام مویشیوں کی دیکھ بھال کے لیے نارنگ منڈی کے تین وٹرنری ڈاکٹر ہفتہ میں دو دن فارم پر حاضری دیتے ہیں جب کہ ایک کمپوڈر کتوں کی دیکھ بھال کے لیے چوبیس گھنٹے فارم پر موجود رہتا ہے۔

غلام مصطفیٰ کھر نے اپنے فارم سے ملحق لاہور کے ایک زمیندار کی ۲۰۰ ایکڑ اراضی پر بھی قبضہ کرنے کی کوشش کی ہے لیکن زمین کے مالک نے نارنگ منڈی کے ایک مسلح گروپ کی خدمات حاصل کر لیں اور مصطفیٰ کھر کے فارم پر چڑھائی کر دی۔ جواب میں مصطفیٰ کھر نے نارنگ منڈی کے علاقہ کے ایک خطرناک اشتہاری ملزم کی خدمات مستعار لے لیں اور اس اشتہاری نے اپنے سو کے قریب ساتھیوں کی مدد سے کھر فارم پر مستقل ڈیرہ بنا لیا ہے۔ دونوں گروپوں میں گاہے بگاہے فائرنگ ہوتی رہتی ہے۔ غلام مصطفیٰ کھر نارنگ منڈی سے آئندہ انتخابات لڑنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور انہوں نے علاقہ میں اثر و رسوخ بڑھانے کے لیے خطرناک ملزموں کو اپنے فارم پر اکٹھا کرنا شروع کر دیا ہے۔

بیوروکریسی اور پولیس کا پروردہ کردار

شاہد سیٹھی اغوا برائے تاوان کیس کا مرکزی ملزم ۳۷ سالہ رانا ثروت اقبال، ضلع شیخوپورہ کے قصبہ نارنگ منڈی کے نواحی گاؤں ننگل وارث خان کا رہائشی ہے۔ ۴۰ گھرانوں پر مشتمل یہ چھوٹا سا گاؤں بی آر بی نہر اور مرالہ لنک نہر کے درمیان واقع ہے۔ مرالہ لنک نہر ننگل وارث خان سے مغرب کی طرف تقریباً ایک کلومیٹر کے فاصلے پر شمالاً جنوباً بہتی ہے جبکہ بی آر بی نہر گاؤں سے مشرق کی طرف تقریباً دو کلومیٹر کے فاصلے پر بہتی ہے۔ رانا ثروت اقبال اور ان کے ساتھیوں کی وجہ سے "دہشت زدہ" گاؤں ننگل وارث خان، مہتہ سوجا یونین کونسل میں شامل ہے۔ اس کی ساری آبادی راجپوت برادری پر مشتمل ہے۔ رانا ثروت اقبال ۵۹-۱۹۵۸ء کے برسوں میں ننگل وارث خان کے ایک معمولی کاشتکار رانا یعقوب کے گھر پیدا ہوا۔ رانا یعقوب جو بعد میں حاجی یعقوب خان بن گئے، ان کی زرخیز زرعی اراضی ۵۶-۱۹۵۵ء کی اشتمال اراضی میں بعض بااثر زمینداروں کی وجہ سے اشتمال کے عملہ نے مرالہ لنک نہر کے پار منتقل کر دی تھی۔ حاجی یعقوب کو اس کی زرخیز زمین کے بدلے نہر پار کے علاقہ میں جو ۱۲ ایکڑ زمین دی گئی وہ مکمل طور پر بنجر اراضی تھی۔

حاجی یعقوب کا بڑا بیٹا رانا ثروت اقبال جب پیدا ہوا تو قابل کاشت اراضی نہ ہونے کی وجہ سے اس کا خاندان شدید نوعیت کے مالی مسائل کا شکار تھا۔ والد نے بھینس اور دیگر مویشی بیچ کر گزر اوقات کی۔ اس دوران حاجی یعقوب معمولی نوعیت کے کام بھی کرتا رہا۔ رانا ثروت اقبال ۵ برس کا ہوا تو اسے تقریباً ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلہ پر مرالہ لنک نہر کے پار واقع گاؤں میرووال کے پرائمری سکول میں داخل کرا دیا گیا۔ بہت معمولی ذہنی استعداد کے مالک رانا ثروت اقبال نے بمشکل میروال سکول سے پہلے پرائمری اور پھر مڈل

Marfat.com

کا امتحان پاس کر لیا۔ مڈل کا امتحان پاس کرنے کے بعد رانا ثروت اقبال والد کا ہاتھ بٹانے کے لیے چھوٹی موٹی مزدوری بھی کرنے لگا۔

ننگل وارث خان سے تقریباً ڈیڑھ کلومیٹر شمال کی طرف موضع چکرالی کے ایک رہائشی نے (جو ثروت کے خوف سے اپنا نام نہیں بتانا چاہتا تھا) بتایا کہ "مڈل کلاس تک ثروت اقبال ایک خاموش طبع طالب علم کی حیثیت سے سکول میں رہا۔ اس شخص کے بقول اس نے میٹرک نہیں کیا بلکہ مڈل کا امتحان پاس کر کے اپنے کسی رشتہ دار کے گھر چلا گیا۔

رانا ثروت جب ۱۹۷۷ء میں واپس اپنے گاؤں ننگل وارث خان پہنچا تو وہ ایک نوجوان اور چالاک انسان کا روپ دھار چکا تھا۔ اسی دوران اس نے سمگلنگ شروع کی اور ہندوستان سے سونا اور دیگر قیمتی دھاتیں وغیرہ پاکستان لانے لگا۔ شروع میں پاکستانی سرحد پر متعین سرکاری اہل کاروں نے اسے ایک ساتھی سمیت گرفتار کر لیا لیکن بعد میں فوری طور پر دباؤ کے باعث رہا کرنا پڑا۔ رانا ثروت نے شروع میں لاہور کے ایک معروف تاجر کا مال لانا اور لے جانا شروع کیا' لیکن چند ماہ بعد اس نے "باقاعدہ ملازم" بھرتی کر لیے اور اپنا مال ہندوستان بھیجنا اور ہندوستان سے منگوانا شروع کر دیا۔ اس کے فوری بعد ہندوستان میں سکھ تحریک خالصتان نے زور پکڑ لیا اور نارنگ منڈی جیسے علاقوں سے "آسانی" کے ساتھ سمگلنگ ہونے لگی۔ اسی عرصہ میں رانا ثروت اقبال کا کاروبار بھی چمکا۔ بعض ذرائع کے مطابق حریت پسند سکھوں کو خطرناک آتشیں اسلحہ سمگل کرنے والوں میں سرفہرست نام رانا ثروت اقبال کا تھا' جو پاکستانی قبائلی علاقوں سے اسلحہ منگواتا اور اسے ہندوستان سمگل کر دیتا۔

اس دوران رانا ثروت اقبال نے لاہور کے مشہور اور مہنگے ترین کاروباری مرکز "اعظم کلاتھ مارکیٹ" میں ۵ عدد دکانیں خریدیں اور ان میں لاکھوں روپے کا سامان ڈال کر انہیں اپنے ملازموں کے حوالے کر دیا۔ رانا ثروت اقبال نے ہندوستان سے سونے کے علاوہ قیمتی کپڑا بھی سمگل کرنا شروع کیا جو اعظم مارکیٹ میں اس کی دکانوں پر فروخت ہوتا۔ انہی دنوں رانا ثروت اقبال نے قبائلی علاقوں سے ایک اور منافع بخش جنس یعنی ہیروئن منگوانا شروع کی اور اسے بھی اندرون ملک فروخت کے علاوہ ہندوستان بھیجنا شروع کیا۔

اس کے بعد رانا ثروت کے مالی حالات تیزی سے تبدیل ہونا شروع ہوئے تو اس کے رابطے بیورو کریسی سیاست دانوں اور پولیس عہدیداروں سے ہونے لگے اور رانا ثروت کے رابطوں کا جال تھانہ نارنگ منڈی اور تھانہ واہنڈو کی حدود سے نکل کر پنجاب کے

Marfat.com

سیاست دانوں اور بیورو کریسی تک پھیل گیا۔

۸۰ء کے عشرے کے شروع میں پہلی بار یہ دیکھا گیا کہ رانا ثروت نے اپنے گاؤں ننگل وارث خان میں مقامی پولیس افسروں کی دعوتیں کرنا شروع کیں۔ ساتھ ہی رانا ثروت اپنا اثرورسوخ علاقے کے مقامی لوگوں تک پھیلانے لگا اور اُس نے بلدیاتی انتخابات میں اپنے رشتہ داروں کو منتخب کرانا شروع کیا۔ بلدیاتی سیاست میں آتے ہیں اس نے اپنے اردگرد کے علاقے کے مفروروں اور اشتہاری ملزموں کو جمع کرنا شروع کیا۔ یہ اشتہاری ملزمان رانا ثروت کے مخالفین کو ڈراتے دھمکاتے' ڈکیتی اور چوری کی چھوٹی موٹی وارداتیں کرتے۔ رانا ثروت کا براہ راست تعلق کیونکہ ضلع کے تمام پولیس افسروں سے تھا' اس لیے ان افراد کے خلاف کوئی مقدمہ درج ہوتا' نہ کوئی کارروائی کی جاتی۔ نارنگ منڈی کے علاقہ میں رانا ثروت اقبال پہلا شخص ہے جس نے مفرور اشتہاری ملزموں کو پناہ دینا شروع کی اور اپنے "محافظوں" کے طور پر درجنوں مسلح افراد کے ہمراہ علاقے میں گھومنا شروع کیا۔

اسی دوران "گولڈن ٹمپل دربار صاحب امرتسر" پر بھارتی فوج کے آپریشن کے بعد بھارتی حکومت نے کشمیر کے علاوہ پاکستان کے ساتھ لگنے والی سرحد پر خاردار تار اور سرچ لائٹوں کی تنصیب کا کام شروع کیا' جس سے نارنگ منڈی کے علاقہ میں سے سمگلنگ تقریباً ختم ہو کر رہ گئی۔ اس دوران رانا ثروت اقبال نے اپنی سمگلنگ کا سلسلہ نارنگ منڈی کی سرحد سے ختم کر کے نارووال میں "داود" اور "رعیہ" کے دیہات کے قریب سے شروع کر دیا اور آہستہ آہستہ اپنے اس "کاروبار" کو مزید ترقی دی۔

ایک بڑی مقدار میں دولت اور طاقت حاصل کر لینے کے بعد رانا ثروت اقبال نے طاقت کا عملی مظاہرہ کرنے کے لیے اپنے گاؤں میں رہائش پذیر دیگر زمینداروں اور قریبی دیہات کے لوگوں کو منتخب کیا۔ رانا ثروت کے گاؤں "ننگل وارث خان" میں تو کسی کو ہمت نہ ہوتی کہ وہ اس کا مقابلہ کرتا جبکہ دوسرے دیہات خصوصاً قریبی گاؤں "چکرالی" اور "کوٹ بھناں" کے زمینداروں نے اس کی طرف خاص توجہ نہ دی۔

۸۰ء کے عشرہ کے آخر میں رانا ثروت خان نے قریبی گاؤں چکرالی میں وفاقی حکومت کی ملکیت متنازعہ تین مربع اراضی پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ رانا ثروت نے چکرالی کے چوہدری لیاقت علی وغیرہ کو اپنے ساتھ ملا لیا اور اس زمین پر قبضہ کر لیا۔ جبکہ چکرالی کے یوسف خان نامی زمیندار اور وکیل امانت علی نے مقبوضہ زمین کا قبضہ حاصل

Marfat.com

کرنے کی کوشش کی تو دونوں گروپوں میں تصادم ہوگیا۔ اس تصادم میں رانا ثروت گروپ نے مخالف پارٹی کے محمد اشرف ولد ابراہیم کو فائرنگ کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ابھی اس واقعہ کو تھوڑے دن ہی گزرے تھے کہ قاتل پارٹی نے ایک اور شخص شہباز ولد محمد عالم کو بھی اندھا دھند فائرنگ کر کے قتل کر دیا۔

یہ تین مربع اراضی جو دریا بردگی کی وجہ سے گذشتہ کئی برسوں سے ناقابل کاشت پڑی تھی۔ اصل میں ایک ریٹائر فوجی ملک فضل محمد کی ملکیت تھی' جو الاٹی کے طور پر طویل عرصہ سے اس کے مالک چلے آ رہے تھے۔ زمین کے اس تنازعہ میں مخالفین کے قتل کی کوئی واردات ہوتی تو رانا ثروت فوری طور پر بیرون ملک چلا جاتا۔ ملک کے دوسرے علاقوں میں اس کا حلقہ دوستی وسیع ہونے لگا اور جرائم پیشہ لوگوں کی بڑی تعداد اس کے پاس نارنگ منڈی آنے لگی۔ آہستہ آہستہ رانا ثروت کی طرف سے "مہمانوں" کی خاطر مدارت کے لیے "چکرالی" کے قریب ایک گھنے جنگل میں ڈیرے لگائے جانے لگے۔ جنگل میں کچھ جگہ صاف کی جاتی' جہاں جنریٹروں کی مدد سے بجلی پیدا کی جاتی' شراب و شباب کی ان محفلوں میں طوائفوں کو بطور خاص مدعو کیا جاتا۔

ایک پولیس ملازم نے بتایا کہ ان "محفلوں" میں اکثریت سیاست دانوں اور پولیس عہدیداروں کی ہوتی جو ولایتی شراب پیتے' طوائفوں کا ناچ دیکھتے اور پھر علاقے میں شکار کھیلتے۔ اس طرح چکرالی کے جنگل میں ہر ماہ باقاعدگی سے تین چار روز تک میلہ کا سماں رہتا۔

اس کے بعد چکرالی والی زمین کا جھگڑا شدت پکڑ گیا اور مخالفین میں مسلح ٹکراؤ شروع ہوگیا۔ یکے بعد دیگرے چکرالی کے دو نوجوان محمد شہباز ولد محمد عالم اور تنویر ولد معراج دین ہلاک کر دیئے گئے' لیکن رانا ثروت خان کے خلاف کوئی مقدمہ درج نہ کرایا جا سکا۔ ابھی اس واقعہ کو تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ ملزمان نے عدالت میں زمین کی ملکیت کا مقدمہ لڑنے والے محمد یوسف خان ولد سردار خان کو اندھا دھند فائرنگ کر کے قتل کر دیا اور پھر کچھ عرصہ بعد اس کے جواں سال بیٹے افتخار کو بھی ہلاک کر دیا گیا۔ یہاں بھی اصل ملزمان کے خلاف کوئی مقدمہ درج نہیں کرایا جا سکا۔

۹۰ء کے بعد رانا ثروت اقبال نے گاؤں کو تقریباً خیر آباد کہہ کر لاہور میں رہائش اختیار کر لی۔ گلبرگ III میں ایک کوٹھی خریدی گئی۔ رانا ثروت کی چکرالی گاؤں کے جنگلات میں جاری رہنے والی "سرگرمیاں" پوری شدت کے ساتھ لاہور میں بھی جاری

رہیں۔ رانا ثروت اقبال اپنے گاؤں ننگل وارث بھی جاتا اور اپنے حلیف مقامی لوگوں کو دعوتیں کھلاتا رہا۔

۷ دسمبر ۹۲ء کو تھانہ نارنگ منڈی میں ایک ایف آئی آر درج کرائی گئی۔ مقدمہ نمبر ۳۰۸/۹۲ کے تحت رانا ثروت اقبال پر ۳۰۲/۳۴ تعزیرات پاکستان مقدمہ قتل درج ہوگیا۔ اس میں رانا ثروت کے علاوہ دیگر افراد کو بھی ملزم نامزد کر دیا گیا۔ اس مقدمہ میں ملزم ثروت اقبال کو اشتہاری ملزم قرار دیا گیا لیکن پولیس اسے گرفتار نہ کر سکی۔ باوثوق رانا ثروت اقبال ایس ایس پی شیخوپورہ رانا الطاف مجید کی گاڑی میں گھومتا رہتا اور پولیس ملازمین اس کی حفاظت کرتے۔

اس دوران ایک اور واقعہ پیش آیا' پنجاب پولیس کے آئی جی چوہدری نثار چیمہ رانا ثروت اقبال کی دعوت پر اس کے گاؤں گئے۔ رانا ثروت نے نثار چیمہ کو کہا کہ اسے چند منٹ کے لیے ان کی سرکاری گاڑی چاہیے۔ آئی جی نے گاڑی دے دی۔ رانا ثروت آئی جی کی گاڑی میں سوار اپنے مسلح افراد کو لے کر "کوٹ بھناں" پہنچا اور وہاں سے اپنے دیرینہ حریف امانت علی وکیل کو اغوا کر لیا' جس کا مقدمہ تھانہ بی ڈویژن میں ۲۱ جولائی ۹۳ء کو ملزم رانا ثروت اقبال کے خلاف زیر دفعہ ۳۶۴/۳۲۷' ۴۵۲/۳۸۰ اور ۷۹/۶-۱۴ کے تحت درج کیا گیا۔ ملزمان روپوش ہوگئے اور مقامی پولیس امانت علی مغوی کو تلاش کرنے میں ناکام ہوگئی۔

اس وقت ملزم کو محکمہ پولیس کے صوبائی عہدیداروں کا مکمل تعاون حاصل تھا اور پولیس جان بوجھ کر ملزمان کو گرفتار کرتی اور نہ ہی مغوی کو برآمد کرتی۔ تقریباً ڈیڑھ ہفتہ کے بعد ایک دن اچانک مغوی امانت علی عدالت میں پیش ہوگیا اور اس نے عدالت کے روبرو حلفیہ بیان دیا کہ اس کو رانا ثروت نے اغوا نہیں کیا تھا۔ امانت علی وکیل کے بیان کے بعد عدالت نے رانا ثروت اقبال کو بے گناہ قرار دے دیا۔

۱۹ مئی ۹۵ء کو مزنگ لاہور کے علاقہ میں امانت علی وکیل کو دو نامعلوم نوجوان موٹر سائیکل سواروں نے اندھا دھند فائرنگ کر کے ہلاک کر دیا۔ چونکہ امانت علی خود عدالت میں پیش ہو کر رانا ثروت اقبال کو اغوا کے مقدمہ میں خارج کرا چکا تھا اور اس کی ثروت اقبال سے صلح بھی ہو چکی تھی۔ لہٰذا امانت علی کے لواحقین نے رانا ثروت اقبال کو اس واقعہ میں ملوث نہ کیا۔ شاہد سیٹھی اغوا کیس میں گرفتاری کے بعد رانا ثروت اقبال نے یہ اعتراف کیا کہ اس نے امانت علی وکیل کو اغوا بھی کرایا تھا اور بعد میں زمین کی ملکیت کے

Marfat.com

دعوے سے باز نہ آنے کی وجہ سے اسے اپنے آدمیوں سے قتل بھی کرا دیا تھا۔

اس کے بعد رانا ثروت کی طرف سے مقامی پولیس کو لاکھوں روپیہ "ماہانہ" کے طور پر وصول ہونا شروع ہوا۔ اس دوران جب کبھی رانا ثروت نارنگ منڈی کے دیہات میں آتا تو اس کی گاڑی ایس ایس پی الطاف مجید چلا رہا ہوتا جبکہ مسلح پولیس ملازمین اس کی حفاظت کرتے۔ اس کے بعد ان رانا ثروت نے مکمل طور پر لاہور میں سکونت اختیار کر لی اور گلبرگ میں دو کوٹھیاں خریدیں اور لاہور شہر میں جرائم کا سلسلہ شروع کیا۔ ملتان کی ایک طوائف رخسانہ ملتانی کو اپنی "رکھیل" بنا کر اپنے پاس رکھا جبکہ باقی دو گھروں میں اپنی دو بیویوں اور ان کی اولاد کو رکھا۔

مقامی ڈی ایس پی منظر شاہ اور رانا ثروت نے رخسانہ ملتانی کو فردوس مارکیٹ گلبرگ لاہور میں ایک قیمتی کوٹھی لے دی۔ رخسانہ ملتانی نے اپنی جیب سے کوٹھی کی تزئین و آرائش کا پانچ لاکھ روپے خرچ کیا اور اپنے پھوپھی زاد بھائی صداقت کے ہمراہ اس کوٹھی میں رہنے لگی۔ اس دوران رخسانہ ملتانی نے سرائیکی زبان میں نئی فلم "دھیاں نمانیاں" میں ہیروئن کا کردار بھی ادا کیا۔

ڈی ایس پی منظر شاہ جو ملتان سے رخسانہ ملتانی کو لے کر لاہور آیا تھا' اس نے رخسانہ ملتانی کا تعارف اپنے دوست رانا ثروت سے کرایا۔ اس دوران رخسانہ ملتانی نے جو منظر شاہ اور رانا ثروت سے باقاعدہ خرچہ وصول کرتی تھی' ابدالی روڈ ملتان کے ایک نواب اقبال خان خاکوانی کے بیٹے نواب جمشید خاکوانی اور ایک مقامی زمیندار سلیم ڈانگر اسے تعلقات استوار کر لیے۔ جمشید خان خاکوانی اور رخسانہ ملتانی کی بہت گہری دوستی رانا ثروت اور منظر شاہ کو اچھی نہ لگی تو انہوں نے رخسانہ کو ٹھکانے لگانے کا پروگرام بنا لیا۔

۱۷ اپریل ۹۵ء کو رخسانہ ملتانی کو اس کی کوٹھی ۳۸۔ بی سے نامعلوم افراد نے اغوا کر لیا۔ رخسانہ ملتانی کے قریبی عزیز الزام لگاتے ہیں کہ اس دوران ملزمان جن میں ثروت اقبال اور منظر شاہ شامل تھے' انہوں نے ۲ لاکھ روپے تاوان طلب کیا' لیکن بعد میں تاوان کی رقم پوری نہ ہونے پر انہوں نے رخسانہ ملتانی کو قتل کر دیا اور اس کی لاش غائب کر دی۔ ثروت اقبال اور منظر شاہ نے رخسانہ ملتانی کے بھائی رشید کو بیوی بچوں سمیت ملتان سے بلوا لیا اور بعد میں یرغمال بنا لیا اور اس شرط پر رہا کیا کہ اگر اس نے رخسانہ ملتانی کے "غائب" ہونے پر شور و غوغا کیا تو اس کا حشر بھی وہی ہو گا جو رخسانہ ملتانی کا ہوا۔

میں جب رانا ثروت کے آبائی گاؤں "ننکل وارث خان" پہنچا تو اس چھوٹے سے

گاؤں میں واقع سب سے بڑا اور خوبصورت مکان' جو رانا ثروت نے ۸۰ء کے عشرے میں تعمیر کرایا تھا' خالی پڑا تھا۔ "ننکل وارث خان" کا کوئی بھی شخص اس بات پر بھی مائل نہیں تھا کہ وہ رانا ثروت اقبال کے مکان کی نشاندہی کرے۔ رانا ثروت اقبال کے ایک قریبی عزیز سے رابطہ کیا گیا اور رانا ثروت کی ابتدائی زندگی کے بارے میں کچھ پوچھنے کی کوشش کی گئی تو اس نے کہا "آپ مجھے رانا ثروت اور اس کے آدمیوں سے نہیں بچا سکتے اور پھر رانا ثروت غلط کو صحیح اور صحیح کو غلط کر دینے والا شخص ہے اور کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا' اس کے خلاف تو کوئی بھی شخص گواہی نہیں دے گا"۔

تھانہ نارنگ منڈی کے ایک پولیس آفیسر نے بتایا کہ رانا ثروت کی تمام جرائم پیشہ کارروائیاں محکمہ پولیس کے اعلیٰ افسران کی ایماء پر جاری تھیں' جب ایک ضلع کا ایس ایس پی کسی ملزم کو اپنی گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر بٹھا کر خود سارا سارا دن گاڑی چلاتا پھرے اور پھر اس ملزم کے مغویان کو چھپانے کے لیے اپنی رہائش گاہ تک فراہم کرے' تو اس صورت میں ملزم کی دیدہ دلیری اور دہشت ناکی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس پولیس آفیسر کے بقول اب بھی پولیس انتظامیہ رانا ثروت کو بچانے کی کوشش کرے گی یا پھر اس کو کسی "مقابلہ" میں ہلاک کر دیا جائے گا۔ اس پولیس آفیسر کے مطابق یہ تو صرف وہ واقعات ہیں جو کسی وجہ سے منظر عام پر آگئے ہیں' لیکن رانا ثروت نے جس طرح دس پندرہ برس نارنگ منڈی کے اس علاقہ میں اغوا برائے تاوان' ڈکیتیوں' چوریوں' کرائے کے قاتلوں اور سمگلروں کی پشت پناہی کی ہے۔ ان کا کوئی ریکارڈ بھی نہیں اور نہ ہی کوئی شخص اتنی جرات کرے گا کہ وہ رانا ثروت کے خلاف کوئی ثبوت مہیا کر سکے۔

Marfat.com

محکمہ ہاؤسنگ پنجاب میں سیاست دانوں اور بیورو کریسی کی لوٹ مار

صوبائی محکمہ ہاؤسنگ اینڈ فزیکل پلاننگ کی طرف سے صوبہ بھر میں شروع کردہ ہاؤسنگ اسکیموں کے منصوبوں میں شدید نوعیت کی بدعنوانیوں کے انکشافات ملاحظہ کریں۔ ۸۸ء سے لے کر اب تک کے صوبائی وزراء ہاؤسنگ اور محکمہ کے اعلیٰ سرکاری عہدیداروں کی طرف سے مبینہ طور پر جعلی پلاٹوں کی الاٹمنٹ' تعمیراتی کاموں کے گھپلوں اور تعمیراتی میٹریل وغیرہ کی ناجائز فروخت سے متعلق یہ انکشافات ان "محکمانہ کمیٹیوں" اور سابقہ وزرائے اعلیٰ کی معائنہ ٹیموں کی وساطت سے سامنے آئے۔ جنہیں ہر نئی حکومت گزشتہ حکومت کے وفادار ہونے کے شبہ میں "فارغ" کر دیتی رہی۔

۹۵ء میں منظور وٹو حکومت کے خاتمہ کے ساتھ ایک بار پھر ان محکمانہ تحقیقاتی کمیٹیوں کے کام کو رد کر دیا گیا۔ منظور وٹو حکومت میں صوبائی وزیر ہاؤسنگ پیپلز پارٹی پنجاب کے صدر مشتاق اعوان تھے۔ انہوں نے بھی اپنے دورانیہ میں حسب استعداد گل کھلائے۔ ملک مشتاق اعوان نے اپنے آبائی شہر شیخوپورہ میں درجنوں قیمتی پلاٹ اپنے عزیز و اقارب کی خدمت میں پیش کر دیے اور محکمہ کے ملکیتی کئی قیمتی پلاٹ جو لاہور کے مختلف علاقوں میں واقع ہیں ان پر قبضہ جمانے کی کوشش کی لیکن محکمہ میں موجود وزیر اعلیٰ وٹو کے حمایتی افسران آڑے آتے رہے۔ جب منظور وٹو حکومت ختم کی گئی اور سردار عارف نکئی کو صوبائی کابینہ بنانے کا کہا گیا تو ان پر سب سے زیادہ جس وزارت کے لیے دباؤ پڑا وہ ہاؤسنگ کی وزارت تھی۔ پیپلز پارٹی کے ناظم حسین شاہ جو مخدوم الطاف اور مشتاق اعوان جیسے سینئر سیاستدانوں کی وجہ سے سینئر وزیر نہ بن سکے تو انہوں نے سپیکر قومی اسمبلی یوسف رضا

Marfat.com

گیلانی سے مل کر مطالبہ کیا تھا کہ کم از کم انہیں ہاؤسنگ کا وزیر ہی لگا دیا جائے۔ مخدوم الطاف کے انتقال کے بعد مشتاق اعوان سینئر وزیر بن گئے تو نکئی نے اپنے سب سے چہیتے چوہدری اختر علی وریو ایم۔ این۔ اے کے بیٹے خوش اختر سبحانی کو ہاؤسنگ کا وزیر بنا دیا۔ خوش اختر سبحانی جو اپنی پہلی وزارت (جیل خانہ جات و بہبود آبادی) کے دوران ہی اپنی "کارروائیوں" کی وجہ سے مشہور ہو گئے تھے انہوں نے ہاؤسنگ کا وزیر بنتے ہی "محکمہ میں تحقیقاتی" کام کرنے والی کمیٹیوں کو روک دیا اور محکمہ میں تقرریوں اور تبادلوں کے انبار لگا دیے۔

تحقیقات کے بعد جو بدعنوانیاں منظر عام پر آئی ہیں' ان میں ساہیوال اوکاڑہ ہاؤسنگ اسکیموں میں ۹۴ عدد قیمتی پلاٹوں کی غلط الاٹمنٹ اور اس الاٹمنٹ کے ذریعے محکمہ کو بھاری نقصان پہنچانے کی واردات سرفہرست ہے۔ ایک کروڑ روپے سے زائد مالیت کے یہ پلاٹ وزیر اعلیٰ غلام حیدر وائیں مرحوم کے ایما پر ہاؤسنگ کے ڈائریکٹر چوہدری رشید احمد نے جعلی ناموں پر الاٹ کیے۔ ان ہاؤسنگ اسکیموں میں پلاٹ الاٹمنٹ کے لیے ڈائریکٹر پبلک ریلیشنز کی طرف سے کوئی اشتہار نہ دیا گیا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ان ہاؤسنگ اسکیموں میں پلاٹ الاٹ کرانے کے لیے عوام الناس کو مطلع کرنے کے لیے لاکھوں روپے اخباری اشتہارات کی مد میں رکھے گئے' جو مذکورہ ڈائریکٹر خود ڈکار گئے۔

جب ان ہاؤسنگ اسکیموں کی الاٹ منٹ کے بارے میں بدعنوانیوں کے قصے مشہور ہونا شروع ہوئے تو وزیر اعلیٰ نے اپنی معائنہ ٹیم کو اس معاملے کی "تحقیقات" کرنے میں لگا دیا۔ وزیر معائنہ ٹیم کے ارکان نے ایک لاکھ روپے فی کس وصول کیے اور اپنی "تحقیقاتی رپورٹ" میں الاٹمنٹ کو شفاف اور اخبارات میں مشتہر نہ کرنے کو "صحیح" قرار دے دیا۔ ان ۹۴ پلاٹوں میں سے زیادہ تر بعد میں بھاری قیمت فروخت کر دیے گئے جب کہ دونوں اسکیموں میں زیادہ پلاٹ اس وقت ایک سیکشن آفیسر نے بعد میں خود خرید لیے۔

محکمانہ سطح پر جاری تحقیقات کے بعد جو انکشافات سامنے آئے ان کے مطابق مرحوم وزیر اعلیٰ غلام حیدر وائیں کی خصوصی ہدایت پر گوجرانوالہ ہاؤسنگ سکیم میں ایک ایک کنال کے ۸ پلاٹ غیر قانونی طور پر الاٹ کیے گئے۔ گوجرانوالہ شہر سے تعلق رکھنے والے مسلم لیگی غلام دستگیر خان نے یہ پلاٹ کوڑیوں کے بھاؤ حاصل کیے۔ جبکہ ان پلاٹوں کی قیمت ۵۰ سے ۶۰ لاکھ روپے کے درمیان ہے۔

اسی طرح گوجرانوالہ ہاؤسنگ اسکیم میں ہی تقریباً ایک درجن کے قریب پلاٹوں کی

Marfat.com

غلط الاٹ منٹ کا ایک اور کیس ملتا ہے۔ اس وقت کے ڈائریکٹر ہاؤسنگ نے بغیر کسی سرکاری حکم کے یہ پلاٹ غیر مستحق لوگوں کو ذاتی طور پر الاٹ کر دیے اور رقم اپنی جیب میں ڈال لی۔ بعد ازاں پلاٹوں کی یہ الاٹمنٹ منسوخ کر دی گئی تو نام نہاد الاٹی جنھوں نے ڈپٹی ڈائریکٹر کو روپے ادا کیے تھے' عدالت میں چلے گئے۔ عدالت نے محکمہ ہاؤسنگ کا کمزور موقف تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور ڈپٹی ڈائریکٹر توقیر کی ملی بھگت سے جعلی الاٹی کیس جیتنے میں کامیاب ہوگئے جس سے صوبائی حکومت کو ۷۰ لاکھ روپے کا نقصان پہنچا۔ محکمہ انٹی کرپشن نے اس واقعہ کے ذمہ دار ڈائریکٹر کے خلاف اقدام کرنا چاہا تو وزیر اعلیٰ نے گوجرانوالہ کے ایک رکن قومی اسمبلی کے دباؤ پر محکمہ انٹی کرپشن کو روک دیا۔ ڈائریکٹر جنرل ہاؤسنگ ڈیپارٹمنٹ شہزاد جمیل نے ہاؤسنگ اسکیمیں جو شروع میں لاکھوں روپے سے منظور ہوئیں' بعد میں ان کی لاگت کروڑوں میں کرا لی۔ ان سکیموں میں گوجر خان اسکیم نمبر II' شیر شاہ کالونی رائے ونڈ روڈ لاہور' ہاؤسنگ اسکیم شیخوپورہ اور ہاؤسنگ اسکیم قصور شامل تھیں۔ پلاٹوں اور تعمیرات کی لاگت کے لحاظ سے یہ اسکیمیں اسی طرح رہیں اور کسی نوعیت کی تبدیلی دیکھنے میں نہ آئی جب کہ ان پر اٹھنے والے حکومتی اخراجات کو لاکھوں کی بجائے کروڑوں روپے میں بدل دیا گیا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ایک ڈائریکٹر جنرل نے ان ہاؤسنگ اسکیموں کی کیفیت تک تبدیل کر دی لیکن کسی بھی تحقیقاتی ٹیم یا مجاز شخص نے ان غیر قانونی فیصلوں کی تحقیقات کرانے کا نہ سوچا۔ اس کے علاوہ سوک سنٹر ٹاؤن شپ لاہور میں ایک ایک کنال سائز کے کمرشل پلاٹ نمبر ۳' ۶' ۱۲' ۱۳ اور ۱۸ غیر قانونی طور پر الاٹ کر دیے گئے جس سے حکومت کو ۶۰ لاکھ روپے کا نقصان پہنچا۔ اس میں ڈائریکٹر طاہر رضا' ڈپٹی ڈائریکٹر توقیر احمد اور سب ڈویژنل آفیسر شہادت شامل تھے۔ وزیر اعلیٰ معائنہ ٹیم کے ارکان نے مذکورہ افراد سے لاکھوں روپے رشوت لے کر اس کیس کو مکمل طور پر ختم کر دیا اور مذکورہ افراد کے خلاف کوئی کاروائی نہ کی۔ اس واقعہ کے بارے میں فیصل آباد کے ایک وکیل سید صفدر بخاری نے صوبائی حکومت اور صوبائی تحقیقاتی اداروں سمیت وفاقی تحقیقاتی اداروں کو کئی درخواستیں ارسال کیں لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو سکا اور مذکورہ افسران اس وقت بھی اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں اور حکومت کے کمرشل پلاٹس پر با اثر افراد نے محل تعمیر کر لیے۔

گوجرانوالہ ہاؤسنگ سکیم نمبر ا کی واٹر سپلائی لائن انتہائی ناقص تعمیر کرائی گئی' جب کہ ۴۰ فیصد حصہ میں واٹر سپلائی لائن ڈالی ہی نہیں گئی۔ سپلائی لائن تعمیر کا یہ کام شہزاد

Marfat.com

جمیل کی زیر نگرانی ہوا۔ شہزاد جمیل جو بعد میں ڈائریکٹر جنرل کے عہدے پر فائز ہوئے۔ انہوں نے گوجرانوالہ کی ہاؤسنگ اسکیم میں واٹر سپلائی لائن میں پی۔ وی۔ سی پائپ ڈال دیا جبکہ محکمہ سے پختہ ڈرین پائپ کے پیسے وصول کر لیے۔ اسی طرح صوبائی محکمہ ہاؤسنگ کو ۴۰ لاکھ روپے کا نقصان پہنچایا گیا۔ شہزاد جمیل نے لاہور ٹاؤن شپ میں دو کنال رقبہ پر مشتمل پلاٹ نمبر 1_1/C0_44 ناجائز طور پر ایک مقامی پراپرٹی ڈیلر کے نام منتقل کر کے سرکاری خزانہ کو ۱۰ لاکھ روپے کا نقصان پہنچایا۔ شہزاد جمیل اس دوران ڈائریکٹر ہاؤسنگ لاہور ڈویژن تھے۔

اسی طرح ڈائریکٹر جنرل ہاؤسنگ شہزاد جمیل نے میسرز سعد اللہ اینڈ کمپنی D/I_ 75 گلبرگ II کو متعلقہ قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے لاہور ٹاؤن شپ کا کرشنگ پلانٹ صرف ۲۰۰ روپے ماہوار کرائے پر دے دیا جب کہ قانونی طور پر اس پلانٹ کا کرایہ ۱۵۰۰ روپے یومیہ مقرر ہے۔ سالانہ ٹھیکہ کی صورت میں اس پلانٹ کا کرایہ ۵ لاکھ ۴۰ ہزار روپے بنتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور بی اینڈ آر کوڈ کے تحت اس پلانٹ کو تین ماہ سے زائد عرصہ کے لیے کرایہ پر نہیں دیا جا سکتا جب کہ اس کو پہلی دفعہ ہی تین سال کے لیے دیا گیا اور کرایہ کی وصولی بھی نہ ہو سکی۔ یہ پلانٹ لگاتار تین برس تک مذکورہ کمپنی کے زیر استعمال رہا اس کے بعد شہزاد جمیل نے وفاقی حکومت سے غلط بیانی کرتے ہوئے اس پلانٹ کو نیلام کرنے کی اجازت طلب کر لی۔ پلانٹ جس کا کرایہ تقریباً ۱۷ لاکھ روپے بنتا ہے لیکن محکمہ کو صرف چند ہزار روپے وصول ہو سکے اور تین برس میں اس کی ٹکنیکی عمر ختم ہو گئی۔

اسی طرح وزیر اعلیٰ وائیں کی ہدایت پر ایریا ڈویلپمنٹ سکیم ماموں کانجن میں بجلی کے کام کا ٹھیکہ بابر الیکٹرک کمپنی کو ۴۸ لاکھ روپے میں دے دیا گیا جب کہ محکمہ کے منظور شدہ تخمینہ میں اس کام کے لیے ۱۱ لاکھ روپے کی رقم مختص کی گئی تھی۔ محکمہ کے منظور شدہ تخمینہ میں ردو بدل کے لیے قانوناً محکمہ پلاننگ اینڈ ڈویلپمنٹ سے منظوری لینا ضروری تھی لیکن اس کا تردد نہ کیا گیا۔ اس کے بعد ہاؤسنگ کے ڈائریکٹر جنرل سے ٹیکنیکل منظوری بھی لینا ضروری تھی لیکن یہ بھی حاصل نہ کی گئی اور اپنے طور پر کام شروع کرا دیا۔ بعد ازاں ڈائریکٹر جنرل کو راضی کر کے اس منصوبہ کے واجبات کی آخری منظوری حاصل کر لی گئی۔ اس طرح محکمہ کو یکشت ۳۷ لاکھ روپے کا نقصان پہنچایا گیا۔

چیچہ وطنی ہاؤسنگ اسکیم میں سڑکوں کی تعمیر کے سلسلے میں وسیع پیمانہ پر بدعنوانیوں کے انکشافات سامنے آئے۔ گورنمنٹ کے پراجیکٹ ڈائریکٹر رشید احمد نے منظور شدہ پی۔

Marfat.com

آئی- سی اور ٹیکنیکل منظوری تخمینہ بابت ہاؤسنگ اسکیم چیچہ وطنی سے تجاوز کرتے ہوئے ایک ٹھیکیدار کو دو میل فاصلے پر سے مٹی بھرائی کی بجائے چار میل تک مٹی بھرائی کی اجازت دے دی۔ ڈائریکٹر ہاؤسنگ اس نوعیت کی اضافی اجازت دینے کے لیے محکمہ پلاننگ اینڈ ڈویلپمنٹ کی اجازت کا پابند ہے۔ لیکن رشید احمد نے محکمہ پلاننگ اور ڈویلپمنٹ سے اجازت لینا گوارہ نہ کی۔ دو میل زائد فاصلہ سے مٹی اٹھانے کے لیے محکمہ کی طرف سے ٹھیکیدار کو تقریباً ۴۰ لاکھ روپے زیادہ ادا کرنے پڑے جب آڈٹ ٹیم نے اس تجاوز کے جرم میں مذکورہ ٹھیکیدار کو رقم کی ادائیگی روکنے کا کہا تو وہ عدالت میں چلا گیا۔ عدالت نے ریکارڈ دیکھتے ہوئے ٹھیکیدار کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ ذمہ دار ڈائریکٹر رشید احمد سے پوچھ کچھ نہ کی گئی کیونکہ رشید احمد کے تعلقات کا دائرہ وزیر اعلیٰ غلام حیدر وائیں تک پھیلا ہوا تھا۔

اسی دوران محکمہ ہاؤسنگ میں لاتعداد بدعنوانیوں کے اصل محرک ڈپٹی ڈائریکٹر لاہور چوہدری رشید احمد جس کو وزیر اعلیٰ معائنہ ٹیم اور محکمہ انٹی کرپشن بدعنوان ثابت کر چکی تھی کو ڈائریکٹر ہاؤسنگ سرکل فیصل آباد تعینات کر دیا گیا۔ چوہدری رشید کو سابقہ وزیر ہاؤسنگ چوہدری نذیر احمد نے برادری کی بنیاد پر ۱۹ گریڈ میں تعینات کیا جب کہ اس کے خلاف محکمہ میں درجن کے قریب انکوائریاں چل رہی تھیں اور ان میں کئی انکوائریاں یہ ثابت بھی کر چکی تھیں کہ چوہدری رشید بدعنوانی کا مرتکب ہوا ہے۔

ہاؤسنگ سرکل لاہور میں جو جعلی الاٹ منٹ کے گھپلے ہوئے ان میں سب سے بڑا گھپلا ٹاؤن شپ لاہور میں انڈسٹریل پلاٹ نمبر ۱۰/۱۳ ۱۱۱ کے سلسلے میں ہوا۔ یہ پلاٹ جس کی مارکیٹ قیمت ۵۰ لاکھ روپے تھی محکمہ کے اعلیٰ عہدیداروں نے مقبول شاہ نامی ایک پراپرٹی ڈیلر کو دے دیا۔ ان عہدیداروں میں اس وقت کے ڈپٹی ڈائریکٹر ہاؤسنگ لاہور رشید احمد کا نام بھی شامل ہے۔ چوہدری رشید احمد پر اس پلاٹ کی جعلی الاٹ منٹ کا الزام ثابت ہو گیا تھا لیکن سیاسی اثر و رسوخ کے باعث اس کے خلاف تادیبی کاروائی نہ کی جا سکی جب کہ دیگر چھوٹے درجے کے ملازم تین افراد کو محکمہ کی طرف سے تجویز کردہ سزا کا سامنا کرنا پڑا۔

چوہدری رشید احمد جو سزا تو نہ پا سکا البتہ ۱۸ ویں سے ۱۹ ویں گریڈ میں ترقی ضرور پا گئے۔

ٹاؤن شپ اسکیم میں ایک اور فراڈ انڈسٹریل پلاٹ نمبر ۱۷/۱۲ ۱۱۱ کے عوض الاٹ کیا جب کہ یہی پلاٹ ڈپٹی ڈائریکٹر رشید احمد نے میسرز رمنا پائپ کو ریویو پٹیشن کی بنیاد پر متبادل پلاٹ کے طور پر عنایت کر دیا جب کہ اس سے قبل وہ رمنا میسرز کی اپیل بھی نامنظور کر چکے تھے اور اپیل نامنظور کرنے کی صورت میں رشید احمد قانوناً ریویو پٹیشن کے مجاز نہ تھے

Marfat.com

کیونکہ قانوناً ڈپٹی ڈائریکٹر کے احکام کے خلاف اپیل کمشنر لاہور سن سکتا تھا۔ رشید احمد کی غلط کاروائی کی وجہ سے میسرز مائی کارپوریشن کو عدالت سے رجوع کرنا پڑا۔

ہاؤسنگ اینڈ فزیکل پلاننگ فیصل آباد میں ڈائریکٹر ہاؤسنگ سمیت اعلیٰ عہدیداروں نے محکمہ کی ۴۵۰ ٹن تارکول ٹھکانے لگا دی۔ تقریباً ۲۰ لاکھ روپے مالیت کی یہ تارکول مختلف ہاؤسنگ اسکیموں میں سڑکوں کی تعمیر کے لیے پڑی تھی۔ جب محکمانہ طور پر تحقیات شروع ہوئیں تو ڈائریکٹر نے ٹھیکیداروں کو بلیک میل کرتے ہوئے گم شدہ تارکول کی قیمت ادا کرنے کو کہا۔ تارکول کی اتنی بڑی مقدار کی چوری کا واقعہ ایک معمولی کاروائی بن کر رہ گئی اور ذمہ دار افراد کے خلاف کچھ نہ کیا جا سکا۔

صوبائی حکومت کی مقرر کردہ آڈٹ ٹیم نے ہاؤسنگ ڈیپارٹمنٹ کے ایک منظور شدہ ٹھیکیدار کو ۸۰۸۳۸ روپے کی رقم ناجائز طور پر محکمہ کے ڈائریکٹر کی طرف سے دینے کا نوٹس لیا۔ آڈٹ ٹیم نے وزیر ہاؤسنگ سے سفارش کی کہ وہ مذکورہ ڈائریکٹر اور ٹھیکیدار کے خلاف ایکشن لیں۔ نہ تو ڈائریکٹر صاحب پر کوئی آنچ آئی اور نہ ٹھیکیدار کو کوئی سزا دی گئی۔ حتیٰ کہ ٹھیکیدار کی رکنیت بھی معطل نہ کی گئی۔

محکمہ ہاؤسنگ کی اپنی تحقیقاتی ٹیموں، گزشتہ دو وزرائے اعلیٰ کی معائنہ ٹیموں اور صوبائی محکمہ انٹی کرپشن کی تحقیقات مختلف ادوار میں سامنے آتی رہی۔ لیکن محکمہ کے سربراہ صوبائی وزرا کی طرف سے بھی کوئی ایکشن نہ لیا گیا۔ بلکہ وزیر محکمہ میں ترقیوں اور تبادلوں کے لیے بھاری رقوم رشوت کرتے رہے۔

سابقہ وزیر ہاؤسنگ مشتاق اعوان نے محکمہ میں تقرر و تبادلوں کا سلسلہ شروع کیا۔ درجنوں افراد کو محکمہ میں جگہ نہ ہونے کے باوجود بھرتی کیا گیا اور لاتعداد کے تبادلے رشوت لے کر روکے گئے۔ اس کی مثال شیخوپورہ کے رہائشی تقریباً بیس افراد کی ناجائز بھرتی تھی جو مشتاق اعوان نے منظور وٹو حکومت کے خاتمے سے دو روز پہلے کی۔

مشتاق اعوان کے بعد ہاؤسنگ کے نئے وزیر خوش اختر سبحانی بنائے گئے خوش اختر سبحانی نے محکمہ میں تقرر و تبادلوں اور ترقیوں کا ایک بڑا سلسلہ شروع کیا اور انہوں نے گزشتہ ادوار کی بدعنوانیوں کے بارے میں تحقیقات کرنے والی محکمانہ ٹیموں کو کام سے روک دیا ہے اور ان بدعنوانیوں کے مرتکب افراد سے بھاری رقوم وصول کر کے انہیں مزید ترقیاں اور من پسند تبادلوں کا موقع فراہم کیا۔

خوش اختر سبحانی نے محکمہ میں تبادلے کے لیے ۵۰ ہزار روپیہ ریٹ مقرر کیا اور

کسی ایک عہدے سے اگلے عہدے پر ترقی کے لیے کم سے کم ریٹ ایک لاکھ اور زیادہ سے زیادہ دس لاکھ روپیہ مقرر کر دیا۔ اس دوران خوش اختر سبحانی نے وزیر اعلیٰ عارف نکئی کے بیٹے سے مل کر پنجاب کا سب سے بڑا قبضہ گروپ تشکیل دیا اور صوبائی دارالحکومت میں درجنوں پلاٹ قبضہ میں لے لیے۔ خوش اختر سبحانی اور عارف نکئی کے بیٹے نے لاہور ریڈیو اسٹیشن کے سامنے واقعہ ایک قیمتی پلاٹ پر قبضہ کر لیا پلاٹ کا مالک ایس۔ ایس پی لاہور حاجی حبیب الرحمٰن کے پاس پہنچا تو ایس۔ ایس۔ پی نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اس کو تقدیر کا لکھا ہوا سمجھ کر بھول جائے۔ کیونکہ اس وقت صوبے میں عارف نکئی اور خوش اختر کے والد چودھری اختر وریو سے طاقتور کوئی چیز نہیں۔ اور وہ شکر کرے کہ اس کا پلاٹ ہی گیا ہے' جان نہیں گئی۔ بعد میں جب یہ شخص لاہور ہائی کورٹ میں پہنچا تو عدالت کے حکم کے باوجود خوش اختر سبحانی نے عدالت میں پیش ہونے سے انکار کر دیا۔ عدالت نے ایس۔ ایس۔ پی کو طلب کیا تو اس نے اپنی معذوری بیان کر دی۔ بعد میں گورنر راجہ سروپ خان نے اس پلاٹ پر سے خوش اختر سبحانی اور عارف نکئی کے فرزند کا قبضہ چھڑایا لیکن پلاٹ کا مالک جان کے خوف سے ملک چھوڑ گیا۔

خوش اختر سبحانی نے وزیر ہاؤسنگ کی حیثیت سے محکمہ میں سینکڑوں افراد کو کروڑوں روپے رشوت حاصل کر کے بھرتی کیا اور سیالکوٹ میں دریائے چناب کے ساتھ لگنے والی ۲ ہزار ایکڑ اراضی پر قبضہ کر لیا۔ بعد ازاں اس اراضی کو وفاقی حکومت سے کوڑیوں کے مول حاصل کر لیا اور ساتھ لگنے والے غریب دیہاتیوں کی زمینوں پر بھی قبضے شروع کر دیے۔

Marfat.com

"پولیس مقابلوں" کی آڑ میں قتل و غارت

پنجاب پولیس نے ۹۶ء کے پہلے صرف چھ ہفتوں میں "جعلی پولیس مقابلوں" میں ۱۳ افراد کو ہلاک کر دیا۔ گذشتہ سال صرف لاہور میں ہونے والے پولیس مقابلوں میں ۴۳ افراد کو ہلاک کر دیا گیا جو کہ ایک ریکارڈ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان تمام افراد کو پولیس نے باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت گرفتار کر کے ہلاک کیا اور بعد میں پولیس مقابلہ ظاہر کر دیا۔

پنجاب پولیس کی دیدہ دلیری کا یہ عالم ہے کہ وہ کوئی "پولیس مقابلہ" رچانے سے پہلے رائے عامہ کو "ہموار" رکھنے کے لیے ذرائع ابلاغ کو بھی پیشگی اعتماد میں لینے تک آن پہنچی ہے۔ اس نوعیت کی واضح مثال لاہور کے نواحی قصبہ رائے ونڈ میں گذشتہ سال ایک چھ سالہ بچی آمنہ کو زیادتی کے بعد قتل کرنے والے نوعمر ملزمان سے "پولیس مقابلہ" تھا۔ آمنہ سے زیادتی اور قتل کے مرتکب افراد کی نشاندہی عوامی سطح پر ہو گئی تھی کیونکہ دونوں ملزمان آمنہ کے والد کے ملازم تھے اور قتل سے کچھ دیر پہلے ان میں سے ایک کو آمنہ کے ساتھ جائے وقوعہ کی طرف جاتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ دونوں کی گرفتاری کے بعد مقامی لوگوں میں اشتعال بھڑک اٹھا اور انہوں نے احتجاجی مظاہروں کے دوران مطالبہ کر دیا کہ ملزموں کو سرعام پھانسی دی جائے۔

جس رات دونوں ملزموں کو پولیس نے گرفتار کیا' اس کی اگلی صبح ایس ایس پی لاہور حاجی حبیب الرحمٰن نے لاہور کے تمام اخبارات کے کرائم رپورٹروں کے گھروں میں خود فون کیے اور انہیں جگا کر شام کے کھانے پر اپنے گھر مدعو کیا۔ سوائے ایک معروف اخبار کے کرائم رپورٹر کے باقی تمام کرائم رپورٹر شام کو ایس ایس پی کے گھر پہنچے۔ کھانے کے دوران ایس ایس پی نے تمام رپورٹروں سے درخواست کی کہ وہ اپنی کل کی پیشہ ورانہ سرگرمیوں میں صرف ایک واقعے کے لیے پولیس کا ساتھ دیں۔ پولیس نے رائے ونڈ کے

Marfat.com

واقعے میں ملوث دونوں نوجوانوں کو گرفتار کر لیا ہے اور پولیس کو یہ خدشہ ہے کہ ناکافی شہادتوں کے باعث ملزمان کو بہت معمولی سزا ملے گی اور کچھ عرصہ بعد وہ رہا ہو جائیں گے جبکہ مقامی لوگوں میں شدید غم و غصہ پایا جاتا ہے۔ اس لیے پولیس کے اعلیٰ عہدیداران نے فیصلہ کیا ہے کہ ملزمان کو "پولیس مقابلے" میں ہلاک کر دیا جائے۔ اب آپ کا "تعاون" درکار ہے۔ معمولی بحث و مباحثے کے بعد کھانے پر حاضر تمام کرائم رپورٹروں نے "کلیرنس" دے دی اور چند گھنٹوں کے بعد دونوں نوجوانوں یونس اور آصف کو درجن بھر پولیس والوں نے بے تحاشہ گولیاں برسا کر ہلاک کر دیا۔ اگلے روز حسب وعدہ تمام کرائم رپورٹروں نے "پولیس مقابلے" میں ہلاک شدگان کی گذشتہ سفاکی کو مد نظر رکھتے ہوئے رپورٹنگ کی جبکہ ایس ایس پی کے کھانے سے غیر حاضر اخبار کے رپورٹر نے پولیس کی اس یکطرفہ کارروائی پر معروضی رپورٹ تیار کی جسے بعد ازاں نیوز روم میں دبا لیا گیا اور محض کارروائی پوری کرنے کے لیے دو کالمی خبر کا درجہ دے کر اس کو غیر اہم اور کم نمایاں جگہ پر لگایا گیا۔

نئے سال کے آغاز سے پنجاب پولیس نے بڑھتے ہوئے سنگین جرائم اور سیاسی دباؤ سے بوکھلا کر راہ چلتے بے گناہ لوگوں کو اور چھوٹے موٹے جرائم میں زیر حراست افراد کو بھی "پولیس مقابلوں" میں ہلاک کرنا شروع کر دیا۔ بے گناہ لوگ جو اس نوعیت کے "پولیس مقابلوں" میں مارے گئے' ہلاکت کے بعد ان کے کھاتے میں درجنوں سنگین جرائم ڈال دیئے گئے۔ گردونواح کے تھانوں میں عرصہ دراز سے درج "نامعلوم" مقدمات کے خالی خانوں میں ان افراد کے نام شامل کر دیے گئے تاکہ کسی دباؤ کی صورت پولیس کی "بے گناہی" ثابت کی جا سکے۔

جنوری ۱۹۹۶ء میں جب اندھا دھند "پولیس مقابلوں" کا سلسلہ شروع ہوا تو صرف ۲۰ جنوری تک لاہور اور فیصل آباد میں پانچ ایسے افراد کو پولیس نے قتل کر دیا جن کی عمریں ۱۲ سے ۱۷ سال کے درمیان تھیں اور انتہائی غریب گھرانوں سے تعلق رکھنے والے ان لڑکوں کی "پولیس مقابلے" میں ہلاکت کے بعد پولیس نے ان کے لواحقین کو بھی گھروں سے اٹھا لیا' سنگین نتائج کی دھمکیاں دیں اور معصوم بچوں کے نام بعض ایسی وارداتوں میں بھی درج کر دیئے جو کم سن بچے کر ہی نہیں سکتے۔

پولیس کی بھاری نفری نے کئی بے گناہ اور نہتے بچوں کو اندھا دھند فائرنگ کر کے چھلنی کرنے کے بعد شہر کے دیگر تھانوں کے گذشتہ ریکارڈ میں موجود "نامعلوم مقدمات" کے خالی صفحات پر ان کا نام "اشتہاری مفروروں" کے طور پر درج کر دیا بلکہ بعض اوقات

Marfat.com

"پولیس مقابلوں" کے مقتولین کے خاندان کی عورتوں کو بھی گذشتہ برسوں میں درج ہوئے سنگین نوعیت کے نامعلوم ملزمان والے مقدمات میں شامل کر لیا اور "پولیس مقابلے" کے بعد ان خواتین کو گرفتار بھی کر لیا گیا۔

صرف لاہور کے ۹۰ کے قریب تھانوں میں ہر وقت پانچ سو کے قریب ایسے سنگین جرائم کے مقدمات "نامعلوم ملزمان" کے نام درج رہتے ہیں جن میں کسی بھی کے کسی بھی شخص کا نام اس کی ہلاکت کے بعد یا زندگی میں ہی درج کیا جا سکتا ہے جبکہ اب تک ان "خالی اور نامعلوم مقدمات" کا صحیح استعمال صرف جعلی پولیس مقابلوں کے بعد ہوا ہے اور ہر مقتول موت کے فوری بعد بے شمار مقدمات میں "اشتہاری" کے طور پر دریافت ہوا ہے۔ جبکہ "پولیس مقابلے" کے بعد اکثریت کا یہی خیال ہوتا ہے کہ پولیس نے مقتول کے مخالف فریق سے معاوضہ لے کر یہ کام کیا ہے۔

۹۰ء سے ۹۵ء تک جتنے بھی "پولیس مقابلے" ہوئے ان میں سوائے چند کے اکثریت جعلی پولیس مقابلوں کی تھی جن میں نہ تو کوئی پولیس ملازم ہلاک ہوا نہ زخمی۔ اس نوعیت کے جعلی پولیس مقابلوں میں عموماً ملزمان کو پولیس حراست سے چھوڑا جاتا ہے کہ وہ فائر کی رینج میں رہیں اور ایسا محسوس ہو کہ فرار ہوتے ہوئے مارے گئے' کئی بار ایسا بھی ہوا کہ پولیس نے مقابلے کی غرض سے کچھ افراد کو اپنے نشانہ بازوں کے سامنے چھوڑا تاکہ انہیں گولی ماری جائے لیکن ان میں سے کچھ افراد بھاگ نکلے اور زندہ بچ جانے میں کامیاب ہوگئے۔ ایسا ہی ایک واقعہ گذشتہ سال لاہور کے علاقہ شاد باغ میں بھی پیش آیا تھا جب پولیس کی طرف سے "مقابلے" کے لیے چھوڑا گیا ایک ملزم گلیوں میں گم ہوگیا اور پولیس ڈھونڈتی رہ گئی۔

پولیس کا موقف یہی ہوتا ہے کہ ملزمان نے مقابلہ کیا اور گھات لگا کر پولیس پارٹی پر فائرنگ شروع کر دی لیکن ۹۵ء فی صد "پولیس مقابلوں" کے بعد جب ہلاک شدگان کے ہتھیار چیک کیے گئے تو یا تو وہ لاک تھے یا پھر ان میں کوئی ایسا نقص تھا کہ وہ قابل استعمال نہیں تھے۔

"پولیس مقابلوں" کے بعد چونکہ ہلاک شدگان کا پوسٹ مارٹم پولیس اپنی "نگرانی" میں کراتی ہے' اسی لیے پوسٹ مارٹم رپورٹ میں بھی اس کی مرضی کو ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے۔ لیکن بارہا ایسا ہوا کہ ہلاک شدگان کی پوسٹ مارٹم رپورٹ میں لکھا گیا کہ انہیں انتہائی قریب سے گولیاں ماری گئیں اور اکثریت کے جسموں پر پولیس تشدد کے نشانات تھے

Marfat.com

جو ظاہر کرتے تھے کہ انہیں گرفتاری کے بعد تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور پھر "پولیس مقابلے" میں ہلاک کر دیا گیا۔

"پولیس مقابلوں" میں مارے جانے والے ملزمان کی اکثریت کے پاؤں میں جوتے نہیں تھے اور نہ ہی ان کے پاؤں کو مٹی وغیرہ لگی ہوتی جبکہ پولیس کا موقف تھا کہ انہوں نے میلوں بھاگ کر پولیس مقابلہ کیا اور مارے گئے۔ بعض اوقات پولیس نے خطرناک ملزموں کو کسی درخت وغیرہ کے ساتھ باندھ کر بھی ہلاک کیا۔

پولیس مقابلوں کے بعد عموماً ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ (ڈپٹی کمشنر) ان پولیس مقابلوں کی جوڈیشل انکوائری کے لیے کسی مجسٹریٹ یا اسسٹنٹ کمشنر کو مقرر کرتا ہے کہ وہ جائے وقوعہ پر پہنچ کر چشم دید گواہوں کے بیانات لے کر اپنی رپورٹ تیار کرے۔ گزشتہ سال صرف لاہور میں اس نوعیت کی ۵۰ سے زائد انکوائریاں چل رہی تھیں جو حسب معمول اپنی موت آپ مر گئیں۔ اس نوعیت کی ۹۹ فی صد انکوائریاں "پولیس مقابلوں" کو اصلی قرار دے دیتی ہیں جبکہ شاذونادر یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ پولیس مقابلہ کرنے والی پارٹی پر قتل کا مقدمہ درج کیا جائے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ کسی جوڈیشل انکوائری کے بعد پولیس والوں کے خلاف قتل کا مقدمہ اسی تھانے میں انہی اہلکاروں کو اپنے اوپر درج کرنا ہوتا ہے جنہوں نے اس "پولیس مقابلے" میں حصہ لیا تھا۔ اس صورت میں کوئی گنجائش نہیں رہتی کہ ان کی درج کردہ ایف آئی آر پہلی پیشی میں ہی خارج نہ ہو جائے۔ اگر کسی مقتول کے لواحقین پولیس کے خلاف مقدمہ درج کرانا چاہیں تو پولیس ایف آئی آر کے اندراج میں اتنی واقعاتی غلطیاں بھر دے گی کہ مقدمہ پہلی یا دوسری پیشی پر عدالت کو خارج کرنا پڑے گا۔

پنجاب پولیس کی صورتحال یہ ہے کہ سابقہ آئی جی پنجاب عباس خان کے بقول اس وقت پولیس میں ۲۵ ہزار نااہل اور جرائم پیشہ افراد موجود ہیں جو مختلف حکومتوں کے دوران سیاسی دباؤ یا رشوت کے زور پر بھرتی کرائے گئے۔ لاہور میں تعینات ۱۶ ہزار پولیس ملازمین میں ۱۰ ہزار کے قریب پولیس ملازمین صوبائی دارالحکومت میں رہائش پذیر اور موجودہ اعلیٰ سرکاری و سول حکام کی حفاظت پر مامور تھے جبکہ پورے شہر میں گزشتہ ایک ماہ سے ایک ہزار سے زائد پولیس ملازمین چوبیس گھنٹے ناکوں پر تعینات تھے۔ پولیس ملازمین کی ایک بڑی تعداد شہر میں جاری امتحانات کی نگہبانی کے فرائض انجام دے رہی تھی جبکہ ۵ ہزار سے بھی کم پولیس ملازمین ۶۰ لاکھ سے زائد کی آبادی والے شہر لاہور کو "تحفظ" اور "امداد" مہیا کر رہے ہیں۔

جرائم پیشہ سیاستدانوں کا گڑھ --- گجرات

شمالی پنجاب کا اہم ترین ضلع گجرات' جو پاکستانی سیاست میں ہمیشہ اہم کردار کا حامل رہا ہے' آج جرائم پیشہ سیاستدانوں اور پیشہ ور قاتلوں کے باعث جرائم کا گڑھ بن چکا ہے۔ جہاں صوبائی حکومت نے ایک بڑے فوجی آپریشن کا بھی مطالبہ کیا تھا' لیکن پیپلزپارٹی کی سابقہ حکومت نے اس معاملے کو دبا دیا تھا۔

ضلع گجرات میں قتل و غارت کی وارداتوں میں شدت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ گزشتہ پانچ برسوں میں سالانہ اوسطاً ۵۰۰ افراد آپسی دشمنیوں میں قتل کر دیے گئے۔ ضلع کے مختلف دیہات اور قصبوں میں تقریباً ۳۰ ایسے متحارب گروپ سرگرم ہیں' جو اپنی خاندانی دشمنیوں کے نام پر مقتدر اور اقتدار سے باہر بااثر سیاست دانوں کی مکمل پشت پناہی میں جدید ترین اسلحہ کے ساتھ مخالفین کا خاتمہ کر رہے ہیں۔

علاقہ کے قاتل گروپوں کے پاس موجود جدید ترین اسلحہ کی صورت حال یہ ہے کہ ان کے پاس جو غیر ملکی اسلحہ ہے' اس کی کارکردگی اتنی بہتر اور مہلک ہے کہ ملک کی دفاعی فورسز کے پاس بھی ایسے ہتھیار نہیں۔ مثال کے طور پر ۹۶ء میں گجرات کے علاقہ میں ایک نئی قسم کی ہلکی مشین گن متعارف ہوئی ہے' جو امریکی اسلحہ ساز کمپنی "ونچسٹر" کی تیار کردہ ہے اور اس کا نام "ڈینجربور" ہے' جسے مقامی زمیندار "ڈنگر بور" کے نام سے پکارتا ہے۔

ایک مقامی پولیس آفیسر نے بتایا کہ چھوٹے سے گاؤں میں بھی لوگوں کے پاس کروڑوں روپے مالیت کا اسلحہ ہے۔ لوگ ضروریات زندگی کی خرید میں اتنا تردد نہیں کرتے' جتنا اسلحہ کی خرید میں کرتے ہیں۔ صرف دشمن دار لوگوں میں اسلحہ خریدنے کا رواج نہیں بلکہ ایسے لوگ بھی جدید ترین اور مہلک اسلحہ خریدتے ہیں' جنہیں اپنی حفاظت کا کوئی خاص

Marfat.com

مسئلہ درپیش نہیں ہوتا۔ اس پولیس آفیسر نے مزید بتایا کہ مقامی پولیس کے پاس جو اسلحہ ہے' وہ اس اسلحہ کے سامنے انتہائی فرسودہ نظر آتا ہے اور اگر کہیں پولیس کو کسی گاؤں پر ریڈ کرنا ہو تو صرف ایک گن بردار پولیس کی درجنوں کی نفری کو روک لیتا ہے۔

تاریخی اعتبار سے دو جنگجو قوموں گوجر اور جاٹ برادری کے گڑھ ضلع گجرات میں امن و امان کی صورت حال کا دارومدار ایسے لوگوں پر ہے' جو ہر وقت اپنے حریف کو موت کی نیند سلانے کے جتن کرتے رہتے ہیں اور ان کی کوشش ہوتی ہے کہ پورے کا پورا خاندان بھی اگر قتل کیا جا سکے تو مضائقہ نہیں۔ جیسا کہ منگووال میں پورے خاندان کا قتل تھا۔ مخالف کو کسی بھی جگہ اور کسی بھی حالت میں دیکھتے ہی اس پر فائر کھول دیا جاتا ہے اور عموماً ایسا ہوتا ہے کہ ایک مخالف شخص اپنے ساتھ بے گناہ لوگوں کو بڑی تعداد بھی قتل کرا بیٹھتا ہے۔

ضلع گجرات میں قتل و غارت کا باقاعدہ آغاز بلدیاتی انتخابات سے پھوٹتا ہے۔ پاکستان کی تاریخ کے پہلے بلدیاتی انتخابات میں سب سے زیادہ ہلاکتیں ضلع گجرات میں ہوئیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ۲۷ سے زائد افراد ان انتخابات کے انعقاد سے پہلے قتل کیے جا چکے تھے۔ کیونکہ نیم پسماندہ گجرات کے دیہات میں گاؤں کی سطح پر "چودھراہٹ" کا پہلا تصور ان بلدیاتی انتخابات نے مہیا کیا۔ ان انتخابات میں باہمی مخالفت کے جو واقعات منظر عام پر آئے' ان میں سب سے مشہور واقعہ ایک گاؤں مدینہ سیداں کا ہے۔ مدینہ سیداں میں سادات خاندان آباد ہیں لیکن ۵۰ کے قریب گھر غریب مصلیوں کے بھی ہیں۔ بلدیاتی انتخابات میں مدینہ سیداں کی ایک بلدیاتی سیٹ کے لیے ۶ سید افراد نے اپنے کاغذات جمع کرائے۔ ان کے علاوہ ایک مصلی نے بھی اپنے کاغذات جمع کرا دیے لیکن انتخابات سے پہلے ہی باقی تمام امیدوار مل بیٹھے اور مصلی خاندان پر حملہ کر دیا۔ اس خاندان کو اتنا تشدد کا نشانہ بنایا گیا کہ وہ کراچی بھاگ گیا اور آج تک واپس نہیں آ سکا۔

گجرات میں قتل و غارت کا پہلا بڑا سلسلہ ۱۹۷۹ء کے بلدیاتی انتخابات کے موقع پر شروع ہوا۔ ان انتخابات میں گجرات کے بڑے سیاسی گھرانوں چودھری ظہور الٰہی خاندان' پگانوالہ خاندان اور نوابزادہ خاندان نے پورے ضلع میں اپنے اپنے امیدوار کھڑے کیے۔ چونکہ ضیا دور کی وجہ سے چودھری ظہور الٰہی خاندان کا بہت زیادہ اثر و رسوخ تھا۔ اس لیے اس خاندان کے حامی افراد نے چودھریوں کے بھروسے پر اپنے انتخابی مخالفین کو زک پہنچانا شروع کر دی۔ ۷۹ء کے بلدیاتی انتخابات کے بطن سے پیدا ہونے والی بڑی بڑی اور مشہور

دشمنوں میں کوٹلہ ارب علی خان کے چودھری عبدالمالک گروپ (پیپلز پارٹی) اور ڈوئیاں اور بوچھ گروپ (مسلم لیگ) کی دشمنی اب تک ۲۳ افراد کا خون پی چکی ہے۔ خواص پور نامی گاؤں میں دو انتخابی مخالف گروپوں میں ۲۷ افراد مارے جا چکے ہیں۔ شیخ پور اور کوٹ نکے والا نامی دیہات میں یہ انتخابی دشمنیاں ۴۵ سے زائد افراد کی جان لے چکی ہیں جب کہ ان انتخابات نے علاقے میں ایسے "آزاد بدمعاشوں" کے گروہ بھی پیدا کیے جو سینکڑوں افراد کو موت کے گھاٹ اتار چکے ہیں۔

معاشی لحاظ سے غیر متوازن ضلع گجرات میں باہمی دشمنیوں میں شدت کی دوسری بڑی وجہ بعض خاندانوں کے پاس پیسہ کی بے جا فراوانی ہے۔ مثال کے طور پر اس وقت صرف ناروے میں ۲ لاکھ غیر ملکی افراد کاروبار اور ملازمت کی غرض سے مقیم ہیں۔ ان ۲ لاکھ میں ۲۸ ہزار افراد پاکستانی ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ان ۲۸ ہزار پاکستانیوں میں ضلع گجرات سے تعلق رکھنے والوں کی تعداد ۲۴ ہزار ہے اور ان کی اکثریت گجرات کی تحصیل کھاریاں سے تعلق رکھتی ہے۔ بعض دیہات میں پورے کا پورا خاندان یورپ میں آباد ہے جب کہ صرف ایک فرد اپنی روایتی دشمنی کو برقرار رکھنے کے لیے اپنے مسلح ساتھیوں کے ہمراہ گاؤں میں موجود ہے، جو موقع ملتے ہی اپنے مخالفین کو قتل کر دے گا یا خود قتل ہو جائے گا۔ اس کے خود قتل ہو جانے کی صورت میں اس کے لواحقین میں سے کوئی دوسرا شخص اس کی جگہ پر کرے گا۔ اس طرح کی مثالیں کوٹلہ ارب علی خان، شیخ پور، مدینہ سیداں، کلیوال سیداں، ڈوئیاں اور منگووال وغیرہ میں کثرت سے ملتی ہیں۔

مقامی پولیس اور دیگر افراد گجرات میں ۱۹۷۰ء کے بعد سے ہونے والی خونریزی کا الزام تین سیاسی گھرانوں پر لگاتے ہیں، جن میں چودھری ظہور الٰہی خاندان، نوابزادہ غضنفر علی گل خاندان اور چودھری احمد مختار خاندان شامل ہیں۔ مقامی لوگوں کے بقول گجرات کے بڑے بڑے حریف گروپ ان سیاست دانوں کی مکمل امداد حاصل کرتے ہیں اور اس کے عوض انتخابات کے دوران ان کو بھرپور امداد بھی فراہم کرتے ہیں۔ اس نوعیت کا "بدل اشتراک" گزشتہ ۲۵ برسوں سے جاری ہے۔ ۸۰ء کے بعد سے اب تک گجرات کا ہر متحارب گروپ مخالفین کے قتل و غارت کی وارداتوں کے بعد ان سیاست دانوں کے ڈیروں پر پناہ لیتا آیا ہے۔ اگر ان سیاست دانوں میں ایک فریق اقتدار سے باہر ہو تو وہ اپنے کارندوں کو ضلع سے باہر بھیج دیتا ہے جو حالات ٹھیک ہونے کے بعد واپس آ جاتے ہیں۔ اکثر و بیشتر یہ گروپ بڑی وارداتیں کرنے کے بعد یا تو چودھری خاندان کے سیاسی مرکز

"ظہور پیلس" میں دیکھے جاتے ہیں یا پھر احمد مختار خاندان کی ملکیتی "سروس شوز انڈسٹریز" میں یا پھر یہ مفرود نوابزادہ غضنفر علی گل سابقہ ایم این اے کے آبائی علاقے اجنالہ میں یا کوٹلہ ارب علی خان میں پناہ گزین ہوتے ہیں۔

مقامی لوگوں کا سب سے بڑا ذریعہ معاش بیرون ملک ملازمت ہے۔ جو لوگ ملک سے باہر ہیں' ان کی دولت کے صرف دو مصرف ہوتے ہیں۔ یا تو وہ عالیشان گھر بنواتے ہیں اور یا پھر قیمتی گاڑیاں اور جدید ترین اسلحہ خریدتے ہیں اور دشمن کو قتل کرتے ہیں۔

بااثر سیاستدان اپنے حریفوں پر جھوٹے مقدمات درج کراتے ہیں۔ جھوٹے مقدمات کا یہ اندراج علاقے میں بڑھتی ہوئی جرائم کی صورت حال کا موجب بنتا ہے۔ پولیس ذرائع کے مطابق تحصیل کھاریاں کے دیہات میں اس نوعیت کے مقدمات نوابزادہ غضنفر علی گل سابقہ ایم این اے اور ان کے چھوٹے بھائی نواب زادہ مظہر علی سابقہ ایم پی اے اپنے سیاسی مخالفین پر درج کراتے ہیں۔ گجرات شہر میں چودھری احمد مختار اور چودھری ظہور الٰہی خاندان' جبکہ دیگر علاقوں میں اس نوعیت کی "ذمہ داری" سابقہ ممبران قومی و صوبائی اسمبلی کے پاس ہے جیسا کہ کلیوال سیداں کے رہائشی سید منظور حسین شاہ سابقہ ایم این اے' چودھری محمد اصغر کائرہ سابقہ ایم این اے' مشتاق حسین پگانوالہ خاندان اور جوڑا خاندان وغیرہ مشہور ہیں۔

بابا سردار عرف دارا گروپ

گجرات شہر سے پانچ کلومیٹر دور جنوب کی طرف دریائے چناب کے کنارے شیخ پور نام کا ایک خوبصورت گاؤں آباد ہے۔ آج ے بیس سال پہلے یہ ایک سادہ اور پرامن گاؤں تھا۔ آبادی کی اکثریت گوجر برادری سے تعلق رکھتی ہے جب کہ چیدہ چیدہ گھر جٹ برادری کے بھی آباد ہیں۔

۸۰ء کے شروع میں شیخ پور میں مقیم بابا سردار نامی ایک معمولی زمین دار نے اپنے مخالفین کو قتل کرانا شروع کر دیا۔ شیخ پور کے سکول ماسٹر مرزا اشتیاق نے عنایت نامی ایک مقامی زمیندار کے بچے کو چال چلن سرٹیفکیٹ دیتے ہوئے اس پر "غیر ذمہ دار اور کاہل" کے الفاظ لکھ دیے۔ اگلے روز عنایت نے مقامی رہائشی بابا سردار کے بیٹوں ریاض' منور اور اعجاز کو ساتھ لیا اور مرزا مشتاق کے گھر حملہ کر دیا۔ مرزا مشتاق کا ۱۸ سالہ بیٹا اختر اس حملے میں ہلاک ہوگیا۔ کچھ عرصہ بعد عنایت اور اس کے جواں سال بیٹے کو بھی قتل کر دیا گیا۔

مرزا مشتاق کے بیٹے کا قتل ایک مقامی وکیل ایم۔ آر اظہر کی ایماء پر ہوا۔ اصل دشمنی مرزا مشتاق اور ایم۔ آر اظہر کے درمیان چل رہی تھی لیکن ایم۔ آر اظہر نے بابا سردار کے بیٹوں کو ساتھ لے کر مرزا مشتاق کے بیٹے کو قتل کرا دیا۔

ابھی یہ مقدمہ قتل عدالتوں میں زیر سماعت تھا کہ وکیل ایم۔ آر اظہر نے کوشش کی کہ وہ مقدمے سے نکل جائے اور بابا سردار کے بیٹوں ریاض، اعجاز اور منور کو پھنسا دے۔ اس کوشش کا علم بابا سردار کو ہوا تو اس نے اپنے بیٹوں کو کہا کہ وہ ایم۔ آر اظہر کو بھی قتل کر دیں۔ لہٰذا کچھ عرصہ بعد بابا سردار کے بڑے بیٹے ریاض نے ضلع کچہری گجرات میں ایم۔ آر اظہر کو کلاشنکوف کا برسٹ مار کر قتل کر دیا۔

اس کے بعد بابا سردار اور قریبی گاؤں کوٹ نکے والوں میں دشمنی کا آغاز ہوا۔ بابا سرداز کے بیٹوں نے ۹۰ء کے آخر میں کوٹ نکے والا پر حملہ کر کے اپنے چار مخالفوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور پولیس کے ساتھ مل کر اس واقعہ کو پولیس مقابلہ بنا دیا۔ بابا سردار باقاعدہ لوگوں سے رقوم وصول کرتا اور اپنے بیٹوں سے قتل کرا دیتا۔ شیخ پور کا ہی ایک اور گروپ ملی گروپ بھی بابا سردار کے خلاف سرگرم ہوا اور پہلے ہی معرکے میں دونوں گروپوں کے چھ افراد قتل ہوگئے۔

۹۰ء کے بعد ایک افسوس ناک واقعہ ہوا، جس نے شیخ پور میں دشمنی کی آگ پوری طرح بھڑکا دی اور مخالفین کو باقاعدہ مورچہ بند ہو جانے پر مجبور کر دیا۔ بابا سردار کے ایک بیٹے کو کسی نامعلوم شخص نے بدفعلی کے بعد قتل کر دیا۔ بابا سردار گروپ کے مطابق یہ واردات ان کے دیرینہ مخالفت کوٹ نکاوالوں اور ملی گروپ نے کی تھی۔ ملی گروپ نے چودھری ظہور الٰہی خاندان کی حمایت حاصل کر لی اور بابا سردار خاندان چودھری احمد مختار خاندان کی طرف مائل ہوگئے۔

چودھری احمد مختار سابقہ وزیر تجارت، نے نومی بٹ نامی ایک مقامی بدمعاش کو ۵ ہزار راؤنڈ (گولیاں) خرید کر دیے تاکہ وہ بابا سردار کے پوتوں میں سے کسی ایک کو قتل کر سکے۔ اس کے بعد دونوں گروپوں نے اپنی سیاسی وفاداریاں تبدیل کر لیں اور بابا سردار چودھری شجاعت خاندان کی طرف چلا گیا۔ اور ملی گروپ نے احمد مختار گروپ میں شمولیت اختیاز کرلی۔

چند برس پہلے جب گجرات جیل میں سرنگ نکال کر درجن کے قریب خطرناک مجرمان فرار ہوئے تھے تو ان مجرموں کا سرغنہ بابا سردار کا بیٹا ریاض تھا۔ ریاض اور اس کے

ساتھی جیل سے فرار ہونے کے بعد سب سے پہلے (ظہور پیلس) چودھری ظہور الٰہی خاندان کی رہائش گاہ پہنچے تھے' جہاں انہوں نے چودھری ظہور الٰہی کے بیٹے چودھری وجاہت حسین سے کلاشنکوفیں حاصل کیں۔ واضح رہے کہ چودھری وجاہت کے الیکشن کے موقع پر ریاض وغیرہ نے بعض پولنگ اسٹیشنوں پر سے مخالفین کے پولنگ ایجنٹ اغوا کر لیے تھے اور کئی سیاسی حریفوں کو بھی اغوا کر کے تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ ریاض وغیرہ نے وجاہت حسین کے حریف عبداللہ یوسف کے قریبی رشتہ داروں کو بھی انتخابات کے دوران اٹھا لیا تھا۔

مئی ۹۶ء تک کے اعداد و شمار کے مطابق شیخ پور میں دشمنی کی وجہ سے بابا سردار گروپ اور ملی گروپ کے ۴۳ افراد قتل ہو چکے تھے۔ بابا سردار کا پورا خاندان اس دشمنی میں قتل ہو چکا ہے' سوائے ایک پوتے کے جس کا نام امتیاز ہے اور وہ ان دنوں گجرات جیل میں عمر قید کی سزا کاٹ رہا ہے۔ بابا سردار بھی پچھلے دنوں ۹۰ سال کی عمر پانے کے بعد طبعی موت مر گیا ہے جب کہ اس کا گروپ بھی تتر بتر ہو گیا ہے۔

بابا سردار کے بارے میں مشہور ہے کہ جب اس کے مخالفین میں سے کوئی قتل ہوتا تو وہ اسی وقت نیا لباس پہنتا اور گاؤں کے چوک میں چارپائی ڈال کر حقہ پیتا اور اپنے بیٹوں اور ان کے ساتھیوں کی بہادری کی داستانیں لوگوں کو سناتا جب کہ اس دوران دو درجن سے زائد مسلح افراد اس کی حفاظت کر رہے ہوتے اور جب اس کا کوئی عزیز قتل ہوتا تو اس کی قبر کے ساتھ دو قبروں کی جگہ چھوڑ دیتا اور اس موقع پر یہ جملہ ضرور کہتا "ایہہ تھاں شریکاں دے دفنان لئی رکھی اے" (یہ جگہ مخالفین کو دفن کرنے کے لیے ہے)

بابا حنیف شاہ گروپ

اس وقت ضلع گجرات میں سب سے بڑی اور جدید ترین اسلحہ سے لیس پرائیویٹ فوج بابا حنیف شاہ کی ہے۔ ۴۰ سالہ بابا حنیف شاہ سو سے زائد افراد کو قتل کر چکا ہے اور ہر وقت اس کے "قافلے" میں ڈیڑھ سے دو سو مسلح افراد موجود رہتے ہیں۔ بابا حنیف شاہ چیلیانوالہ کے ایک نواحی گاؤں چک معموری کا رہنے والا ہے۔ اس کا والد مجذوب تھا اور سخت ترین سردی میں چھت پر چڑھ کر ٹھنڈے پانی سے نہاتا تھا۔ مقامی لوگ اس کی اس حرکت کو "ولایت" سے منسوب کرتے اور اسے علاقے کا ولی قرار دیتے۔

اس مجذوب کے ہاں ایک ہی اولاد پیدا ہوئی جس کا نام حنیف شاہ رکھا گیا۔ حنیف شاہ نے ۱۴ سال کی عمر میں ایک غریب اور بے گناہ شخص کو قتل کیا تھا لیکن "بددعا" کے ڈر

Marfat.com

سے علاقہ بھر میں کسی نے بھی بابا حنیف شاہ کے خلاف گواہی نہ دی اور وہ باعزت بری ہوگیا۔ اس دوران گجرات شہر سے تعلق رکھنے والے دو افراد بابا حنیف شاہ کے پاس آئے اور انہوں نے استدعا کی کہ بابا حنیف شاہ ان کے لیے دعا کریں کہ وہ سزائے موت سے بچ جائیں۔ روایت ہے کہ وہ دونوں افراد پھانسی پانے سے بچ گئے اور بابا حنیف شاہ کے مرید خاص بن گئے۔

اس دن سے بابا حنیف شاہ کو مقامی لوگوں نے "ولایت" کا درجہ دے دیا اور جوق در جوق اس کے مرید بننا شروع ہوئے۔ بابا حنیف شاہ گجرات کا واحد مسلح گروپ ہے جو مستقل سیاسی وابستگی نہیں رکھتا۔ آج کل بابا حنیف شاہ سابقہ ایم این اے منظور حسین شاہ کلیوال کی مقامی مخالف پارٹی میں شامل ہے اور اس کے مسلح افراد منظور حسین شاہ کے آدمیوں سے مسلح جنگ میں مصروف ہیں۔

ایک مقامی سیاست دان نے بتایا کہ بابا حنیف شاہ ایک نیم پاگل شخص ہے جو اپنے سامنے آنے والے کسی بھی انسان کو قتل کر دیتا ہے۔ بابا حنیف شاہ سو سے زائد قتل کر چکا ہے لیکن وہ قتل کے صرف ۷ مقدمات میں نامزد ملزم ہے لیکن ان مقدمات میں کوئی بھی شخص بابا حنیف شاہ کے خلاف گواہی دینے کو تیار نہیں۔ ایک تو بابا حنیف شاہ کے "جلال" سے لوگ خوفزدہ ہیں اور دوسرے کوئی بھی شخص اس کے خلاف گواہی دینے جیسی حماقت نہیں کر سکتا کیونکہ بابا حنیف شاہ اس کے پورے خاندان کو ایک لمحے میں قتل کرا سکتا ہے۔

بابا حنیف شاہ کو قتل کرنے میں مزا آتا ہے اور اگر وہ اپنے گروپ کے ساتھ کہیں سے گزر رہا ہو اور وہاں دو گروپوں میں جھگڑا ہو رہا ہو تو بابا حنیف شاہ بغیر کسی دلچسپی یا تحقیق کے کسی ایک گروپ کے ساتھ شامل ہو کر مخالف گروپ کو ختم کر دے گا' کیونکہ بلاوجہ قتل کرنا حنیف شاہ کا مشغلہ ہے۔ بابا حنیف شاہ جسمانی لحاظ سے بھی معذوری کی حد تک کمزور ہے اور اگر اسے گھوڑے پر سفر کرنا مقصود ہو تو وہ گھوڑے پر آگے خود بیٹھتا ہے اور اس کے پیچھے ایک شخص اس کو سنبھالے رکھتا ہے۔ بابا حنیف شاہ بالکل ان پڑھ ہے اور ساتھ ہی زبان کا توتلا بھی ہے۔ مثال کے طور پر وہ اپنی زبان سے پستول اور کاربین جیسے الفاظ ادا نہیں کر سکتا اور پستول کو اپنی زبان میں "کٹا" (بھینس کا چھوٹا بچہ) کہتا ہے جب کہ دو نالی بندوق کو "مجھ" (بھینس) پکارتا ہے۔

بابا حنیف شاہ کے مریدوں میں پڑھے لکھے لوگوں کی ایک بڑی تعداد شامل ہے۔ یہ

Marfat.com

لوگ مہینوں تک بابا حنیف شاہ کو تلاش کرتے رہتے ہیں کہ وہ کس کے پاس پناہ لیے ہوئے ہیں یا کس ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق گجرات کے تقریباً ۵ ہزار افراد بابا حنیف شاہ کے خاص مرید ہیں جو ان دنوں ملک سے باہر ہیں اور گاہے بگاہے فون پر بابا سے منسلک رہتے ہیں۔ ایک مقامی پولیس آفیسر نے بتایا کہ پورے ضلع کی پولیس کا اعتقاد ہے کہ اس کو زندہ ہوتے ہوئے گرفتار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اگر حنیف شاہ کو گرفتار کر لیا گیا تو وہ پولیس آفیسر جو بابا حنیف شاہ کو گرفتار کرے گا' اگلے روز یا تو اس کا تبادلہ ہو جائے گا یا پھر اس کو نوکری سے نکال دیا جائے گا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ مر جائے۔

ایک مقامی چودھری نے بتایا کہ اس وقت بابا حنیف شاہ کے مریدوں کا بڑا حصہ ناروے اور دیگر یورپی ممالک میں ملازمتیں کر رہا ہے اور ان مریدوں کی ایک بڑی تعداد بابا حنیف شاہ کو لاکھوں روپے ماہانہ بھیجتی ہے۔ بابا حنیف شاہ گجرات اور جہلم کی سرحد کے قریب واقع ایک ۲۶ میل لمبی اور ۶ میل چوڑی جنگلاتی پٹی "بھی سرکار" میں اپنی مفروری کا زمانہ گزارتا ہے جب کہ کئی بار ایسا ہوا ہے کہ حنیف بابا کسی کو قتل کرنے کے بعد یورپی ممالک میں بھی چلا گیا جب کہ وہ ہر سال مشرق وسطیٰ کے ممالک میں اپنے مریدوں سے "نیاز" حاصل کرنے ضرور جاتا ہے۔ اس وقت بابا حنیف کا مستقل ڈیرہ چیلیانوالہ کے نواح میں ہے۔ پنجاب کے سابقہ گورنر چودھری الطاف (مرحوم) کے ساتھ بھی بابا حنیف کی جذباتی وابستگی تھی۔ ان دنوں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ چودھری الطاف کا بیٹا فرخ الطاف' بابا حنیف کی حمایت اور مدد کرتا ہے۔ اس کے علاوہ بابا حنیف کی سیاسی وابستگی چودھری محمد اصغر کائرہ سابقہ ممبر قومی اسمبلی کے ساتھ بتائی جاتی ہے۔

بابا حنیف شاہ کے مسلح ساتھی کسی ایک سیاسی گروپ سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ ان میں ۹۵ فیصد افراد اشتہاری ملزمان ہیں۔ چونکہ بابا حنیف شاہ کے گروپ میں کھانا اور جدید ترین اسلحہ مفت ملتا ہے' اس لیے چھوٹے موٹے بدمعاش اور واردا تیے بھی بابا حنیف شاہ کے گروپ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی اکثریت بھی گروپ میں شامل ہے' جو قتل کر کے بھاگے ہوئے ہیں۔

احمد مختار اور چوہدری خاندان کے بدمعاش

تازہ ترین اعداد و شمار کے مطابق منگووال میں رضا گروپ' میاں گروپ اور ولایت

Marfat.com

گروپ میں اب تک دو درجن سے زائد مسلح مقابلے ہوئے ہیں جن میں ۱۵ افراد قتل ہو چکے ہیں۔ اس جنگ کا آخری قتل گروپ کے لیڈر ولایت بٹ کا تھا' جسے بھلوال کے قریب رضا گروپ کے آدمیوں نے پولیس کی وردیوں میں فائرنگ کر کے دو ساتھیوں سمیت قتل کر دیا تھا۔ بیس ہزار سے زائد آبادی والے اس گاؤں منگووال غربی کی شہرت ۸ مئی ۱۹۹۶ء کو ملک بھر کے اخبارات میں اس طرح ہوئی کہ اس قصبہ کے ایک محلہ میں نامعلوم مسلح افراد نے ایک گھر میں گھس کر اندھا دھند فائرنگ کر کے ۹ افراد کو ہلاک کر دیا۔ ہلاک شدگان میں ضعیف مردوں اور حاملہ عورتوں سمیت کم سن بچے بھی شامل تھے۔ واردات کے بعد علاقہ میں دہشت اور خوف و ہراس کا یہ عالم تھا کہ مقتولین کی لاشیں ۱۲ گھنٹے تک بے یار و مددگار پڑی رہیں اور کسی کو ہمت نہ ہوئی کہ وہ انہیں اٹھا کر پوسٹ مارٹم کے لیے ہسپتال پہنچائے۔

اس سانحہ کو گجرات کے بڑے سیاسی خانوادوں چودھری ظہور الٰہی خاندان اور احمد مختار (وفاقی وزیر تجارت) خاندان نے ایک دوسرے کی شہرت داغدار کرنے کے لیے استعمال کیا۔ چودھری ظہور الٰہی خاندان کے چودھری شجاعت حسین اور چودھری پرویز الٰہی نے الزام لگایا کہ نو بے گناہ افراد کو احمد مختار کے دست راست ولایت بٹ کے بیٹوں امجد بٹ اور منور بٹ وغیرہ نے قتل کیا ہے جب کہ احمد مختار گروپ کا الزام تھا کہ یہ قتل چودھری پرویز الٰہی کے آدمیوں نے کیے ہیں تاکہ احمد مختار خاندان کو سیاسی طور پر بدنام کیا جائے۔

ضلع گجرات کی روایت کے مطابق کسی ایک گاؤں یا قصبہ میں "دشمن داری" کے نام پر ایک دوسرے سے بر سر پیکار خاندان اپنا پہلا رابطہ کسی مقامی سیاسی شخصیت سے جوڑتے ہیں۔ ایسی سیاسی شخصیات بوقت ضرورت خصوصاً انتخابات میں "دشمن دار" گروپوں سے مسلح حمایت مستعار لیتی ہیں اور کامیابی کی صورت میں ان گروپوں کی ہر طرح کی حمایت کرتی ہیں۔

دیرینہ دشمنی کی یہ "روایت" کنجاہ کے قریبی قصبہ منگووال میں بھی گزشتہ کئی دہائیوں سے چلی آ رہی ہے۔ کنجاہ کے علاقہ میں جاٹ برادری کثرت سے آباد ہے۔ اس لیے اس علاقہ کو چودھری ظہور الٰہی خاندان کا انتخابی علاقہ کہا جاتا ہے۔ چودھری خاندان کے مدمقابل چودھری احمد مختار خاندان ہے' جو سیاسی سطح پر چودھری ظہور الٰہی خاندان سے کم شہرت کا حامل ہے لیکن گزشتہ کئی انتخابات سے چودھری ظہور الٰہی خاندان کا سخت حریف چلا آ رہا ہے۔

Marfat.com

دونوں خاندانوں کو انتخابات میں کامیابی کے حصول کے لیے جن لوازمات کی ضرورت تھی' ان میں سب سے اہم چیز کسی مقامی مسلح گروپ کی حمایت حاصل کرنا تھی کیونکہ دشمنیوں میں گھرے اس علاقہ میں کامیابی کا واحد ذریعہ جدید ترین اسلحہ اور پتھر دل بدمعاش ہیں۔ ۷۰ء کے انتخابات میں چودھری خاندان کے گڑھ اس علاقہ سے غیر متوقع طور پر ایک غیر معروف شخص انور سماں انتخابات میں چودھری خاندان کے مقابل آ گیا۔ اس "دشمنی" کا منطقی نتیجہ نکلا اور انور سماں بے دردی کے ساتھ قتل کر دیا گیا۔ انور سماں کی وفات کے بعد ضمنی انتخابات میں چودھری احسن علیگ کے بیٹے چودھری اعتزاز احسن کامیاب ٹھہرے۔ چودھری اعتزاز احسن اگرچہ ایک بہت بڑے جاگیردار خاندان سے تعلق رکھتے تھے' لیکن چودھری ظہور الٰہی خاندان کے مقابل میں ان کی خاص شہرت نہ تھی۔ واضح رہے کہ منگووال کا سب سے بڑا زمین دار خاندان چودھری اعتزاز احسن کا ہے۔ منگووال میں اس خاندان کی آٹھ مربع زرخیز زرعی اراضی ہے۔

چودھری ظہور الٰہی خاندان نے انتخابی معرکوں میں جیت حاصل کرنے کے لیے مستقل طور پر مقامی مسلح گروپ چودھری رضا گروپ کی مسلح حمایت حاصل کر لی۔ چودھری رضا مقامی گاؤں موضع متا کا رہنے والا ہے۔ چودھری ظہور الٰہی خاندان پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے ۹۳ء کے انتخابات میں احمد مختار سے شکست کھانے کے بعد رضا گروپ کو لاہور میں ایک کوٹھی لے دی جس میں رضا گروپ کے اشتہاری رہتے ہیں۔ ۹۳ء کے انتخابات میں رضا پر شاہین چوک گجرات میں فائرنگ کی گئی جس میں رضا شدید زخمی ہوا اور گجرات سے لاہور منتقل ہو گیا۔ رضا کے ساتھ ایک اور گروپ میاں خان گروپ بھی چودھری خاندان کی حمایت میں شامل تھا۔ چونکہ رضا اور میاں خان دونوں کا مشترکہ دشمن ولایت بٹ تھا۔ اس لیے انہوں نے چودھری خاندان سے پناہ حاصل کی۔

ولایت بٹ تحصیل کھاریاں کے ایک گاؤں باگڑیاں کا رہنے والا تھا۔ باگڑیاں میں جٹ برادری کی اکثریت تھی جبکہ بٹ برادری کے چند گھر آباد تھے۔ جٹ برادری اور بٹ برادری میں کسی معاملہ پر کشمکش شروع ہو گئی۔ چودھری ظہور الٰہی خاندان نے جٹ برادری کی حمایت کی۔ بٹ برادری جو غریب تھی اور قصابوں کے طور پر کام کر کے زندگی گزار رہی تھی۔ جٹ برادری سے دشمنی نہ چلا سکی اور مجبوراً تمام گھرانوں کو باگڑیاں سے نقل مکانی کرنا پڑی۔ اس وقت چودھری خاندان کے سامنے کوئی دوسرا سیاسی حریف نہیں تھا۔ اس لیے ولایت بٹ اور اس کی برادری کو کہیں سے بھی امداد نہ مل سکی۔ ولایت بٹ اور اس

Marfat.com

کے رشتہ دار باگڑیاں سے منگووال چلے آئے اور چھوٹا موٹا کاروبار کرنے لگے۔ اسی اثناء میں سروس انڈسٹریز کے مالک چودھری سعید اور احمد مختار نے چودھری ظہور الٰہی خاندان کے ساتھ سیاسی میدان میں جنگ کا فیصلہ کیا۔ احمد مختار خاندان کے اپنے افراد ملازمت پیشہ اور اعلیٰ انتظامی عہدوں پر فائز تھے اس لیے انہیں خاندان میں سے افرادی قوت نہ مل سکی۔ احمد مختار کے بڑے بھائی چودھری احمد سعید نے چودھری ظہور الٰہی خاندان کے ساتھ مسلح مقابلہ کرنے کے لیے ولایت بٹ خاندان کا انتخاب کیا۔ کیونکہ پورے علاقہ میں ولایت بٹ کے علاوہ کوئی ایسا شخص موجود نہیں تھا جو چودھری خاندان سے ٹکر لیتا۔

عوامی سطح پر چودھری احمد مختار اور احمد سعید کا کوئی خاص اثر و رسوخ نہیں تھا' اس لیے شروع کا "تاثر" قائم کرنے کے لیے ولایت بٹ کو کہا گیا کہ وہ علاقہ بھر کے جرائم پیشہ افراد اور اشتہاری مجرموں کو اکٹھا کر کے انہیں جدید اسلحہ دے۔ اسی اثناء میں چودھری ظہور الٰہی گروپ کے حامی میاں خاں اور چودھری رضا نے ولایت بٹ کے ایک آدمی کو قتل کردیا۔ اس طرح دونوں گروپوں میں باقاعدہ جنگ کا آغاز ہوا۔ احمد سعید نے ولایت بٹ کی مالی حالت بہتر بنانے کے لیے اسے مویشی منڈیوں کے ٹھیکے دلوانے شروع کیے۔ ولایت بٹ منڈیوں کے ٹھیکے لینے اور ساتھ متنازعہ زمینوں پر قبضہ کرنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے کروڑ پتی بن گیا۔ ایک وقت ایسا آیا کہ ولایت بٹ منگووال کا امیر ترین شخص اور علاقے کا سب سے بڑا زمیندار بن گیا۔ اس سے پہلے منگووال کے سب سے بڑے زمیندار چودھری اعتزاز احسن تھے جن کے پاس آٹھ مربع زرعی اراضی تھی لیکن ولایت بٹ نے چند برسوں میں منگووال اور اس کے گرد و نواح میں ۱۶ مربع زرعی زمین حاصل کرلی جس میں زیادہ تر متنازعہ اراضی تھی جس پر ولایت بٹ نے قبضہ کرلیا۔ دوسری طرف چودھری خاندان کی آشیرباد سے چودھری رضا گروپ کروڑ پتی ہوگیا اور اس کی دہشت کا یہ عالم ہوگیا کہ علاقے میں کوئی بھی شخص اس کے سامنے دم نہ مارتا۔

ولایت بٹ گروپ اور رضا گروپ علاقے میں ہر طرح کی وارداتیں اور آپس میں قتل و غارت کا بازار گرم رکھتے اور دونوں بڑے سیاسی خاندان ان کو ہر طرح کی امداد مہیا کرتے رہے۔ پیپلز پارٹی کی حکومت آتی تو ولایت بٹ گروپ چھا جاتا۔ مسلم لیگی دور آتا تو ولایت بٹ کے اشتہاری سروس انڈسٹریز کے تہہ خانوں تک محدود ہو کر رہ جاتے اور رضا گروپ سرعام وارداتیں کرتا۔ چودھری خاندان ان کی عبوری ضمانتیں کرواتا اور جیل سے رہائیاں دلواتا رہتا۔

Marfat.com

علاقے کے سیاسی دانشوروں کا خیال ہے کہ چودھری خاندان اور احمد مختار خاندان نے علاقے بھر میں کامیاب "سیاست کاری" کے لیے تین تین شعبے بنا رکھے ہیں۔ چودھری خاندان کا شرافت کا شعبہ چودھری شجاعت حسین کی نگرانی میں کام کرتا ہے۔ "سیاسی چالوں اور سیاسی تدبر" کا شعبہ چودھری پرویز الٰہی کے پاس ہے جب کہ "عسکری شعبہ" کا انچارج چودھری وجاہت حسین ہے۔

دوسری طرف "شعبہ شرافت" چودھری احمد سعید کے پاس ہے۔ "سیاسی چالوں اور سیاسی تدبر کے شعبہ" کا چارج چودھری احمد مختار کے پاس اور "عسکری شعبہ" کا انچارج ولایت بٹ تھا جو اب قتل ہو چکا ہے اور اس کی جگہ اس کے بیٹے امجد بٹ کو اس کا "انچارج" بنایا گیا ہے۔ امجد بٹ ان دنوں منگووال کے ۹ افراد کے مبینہ قاتل کی حیثیت سے جیل میں ہے۔

ولایت بٹ کے قتل سے ایک روز پہلے منگووال کے مقتول خاندان کے سربراہ غلام سرور اور اس کی بیوی رسولاں بی بی نے ولایت بٹ سے درخواست کی کہ وہ ان کی بیٹی کی شادی میں شرکت کرے۔ ولایت بٹ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ایک تو منڈی میں کام کا دن ہے اور دوسرے اس کی طبیعت بہتر نہیں۔ دونوں میاں بیوی مسلسل کئی گھنٹے تک ولایت بٹ کو شادی میں شرکت کرنے پر راضی کرتے رہے۔ بالآخر ولایت بٹ نے ولیمہ میں شرکت کرنے کی حامی بھر لی۔

ولایت بٹ کی زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا کہ اس نے اپنے ڈیڑھ درجن باڈی گارڈ ساتھ نہ لیے اور اپنی جیپ میں ڈرائیور اور ایک مسلح شخص کے ساتھ سوار ہو کر بھلوال میں غلام سرور کی بیٹی کی شادی میں چلا گیا۔ واپسی پر بھلوال کے قریب ریلوے پھاٹک پر پولیس کی وردیوں میں ملبوس پانچ چھ افراد نے اس کی جیپ پر حملہ کر دیا جس سے تینوں افراد موقع پر ہلاک ہو گئے۔ ولایت بٹ کے قتل کا مقدمہ رضا کے چھوٹے بھائی ذوالفقار اور اس کے دیگر ساتھیوں پر درج کرایا گیا۔

اگلے روز ولایت بٹ کے رشتہ داروں نے غلام سرور اور اس کی بیوی رسولاں بی بی کو گھر سے اٹھا لیا۔ مسلسل ایک ہفتہ تک ولایت بٹ کے رشتہ دار غلام سرور اور رسولاں بی بی سے پوچھ گچھ کرتے رہے۔ انہیں خدشہ تھا کہ یہ میاں بیوی مخالف گروپ سے ملے ہوئے ہیں اور ولایت بٹ کا قتل ان کی مخبری سے ہوا ہے۔ واضح رہے کہ مقتول خاندان (منگووال خاندان) کا گزشتہ کئی برس سے ولایت بٹ خاندان سے قریبی تعلق تھا اور اس

Marfat.com

خاندان نے انتخابات میں احمد مختار کو ووٹ دیے تھے۔

دونوں بڑے سیاسی حریفوں' احمد مختار خاندان اور چودھری ظہور الٰہی خاندان نے اخبارات میں ایک دوسرے کو قاتل ٹھہرایا اور اپوزیشن لیڈر میاں نواز شریف صحافیوں کے ہمراہ مقتول خاندان کے بچ رہنے والے افراد سے تعزیت کرنے منگووال گئے۔

احمد رضا گروپ

چودھری عبدالمالک گروپ اور ڈویّاں گروپ بوچھ گروپ اور ڈاکٹر اصغر گروپ میں جاری اس خونی جنگ میں اب تک ۲۲ افراد موت کا شکار ہو چکے ہیں۔ جب کہ یہ سلسلہ پوری شد و مد سے جاری ہے اور ایک شخص کی ہلاکت کے بعد اس کا جانشین اس کی جگہ آ جاتا ہے اور مخالفین کی قتل و غارت کے لیے عملی اقدام کرنا شروع کر دیتا ہے۔

کوٹلہ ارب علی خان میں گوجر اور جاٹ برادری آباد ہے۔ گوجر اکثریت میں ہیں جب کہ جاٹ برادری کی تعداد بہت کم ہے۔ ۱۹۸۰ء تک کوٹلہ ارب علی خان میں مکمل امن کی صورت حال ملتی ہے۔ مقامی لوگوں کی اکثریت یورپی ممالک میں رہائش پذیر ہے جب کہ تعلیم کا معیار اتنا بلند نہیں۔ چھوٹی چھوٹی زمینداریاں بھی موجود ہیں لیکن اکثریت کا تکیہ بیرون ملک مزدوری کے پیسے پر ہے۔ ۷۹ء کے بلدیاتی انتخابات میں کوٹلہ اور اس کے گرد و نواح میں چودھراہٹ کا مسئلہ پیدا ہوا۔ علاقے کی چودھراہٹ کے امیدواروں میں سب سے پرانا نام گجر برادری کے چودھری عبدالمالک کا تھا۔ انتخابات سے پہلے علاقے کے لوگوں کے تھانہ کچہری کی سطح کے کام چودھری عبدالمالک ہی کرتا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ وہ چودھری فضل الٰہی (سابق صدر پاکستان) کا دوست بھی تھا۔ بلدیاتی انتخابات میں چودھری عبدالمالک کو کامیابی حاصل ہوئی اور اس نے مقامی بااثر سیاسی خاندان "نوابزادہ خاندان" سے تعلق جوڑ لیا۔

فضل الٰہی چودھری اور نوابزادہ خاندان کی کوششوں سے چودھری عبدالمالک کوٹلہ ارب علی خان یونین کونسل کے چیئرمین منتخب ہوگئے۔ چودھری عبدالمالک کا چیئرمین بننا تھا کہ علاقے میں چودھراہٹ کے خواہش مند دیگر لوگوں کی طرف سے اس کی مخالفت شروع ہوگئی۔ پرانے جرائم پیشہ افراد کے گاؤں موضع ڈویّاں کے ایک رہائشی برکت علی عرف بکا ڈویّاں نے بڑھ چڑھ کر چودھری عبدالمالک کی مخالفت کی۔ اس مخالفت کی ایک اور بڑی وجہ کوٹلہ ارب علی خان میں "بکا ڈویّاں" کے بھتیجے کی بندش تھی جس کا سبب چودھری

Marfat.com

عبدالمالک تھا۔ مقامی لوگوں نے چودھری عبدالمالک کا ساتھ دیا اور "ڈوئیاں والوں" کو بھتہ دینا بند کر دیا۔

۱۹۸۱ء میں مقامی تھانہ گکرالی کے ایک اے ایس آئی محمد اشرف نے "بکا ڈوئیاں والا" کی بیوی کو گرفتار کر لیا اور تھانے لے آیا۔ تھانے میں محمد اشرف نے اس عورت کی گت (بال) کاٹ دی۔ محمد اشرف اس وقت راولپنڈی میں ڈی ایس پی پولیس کے طور پر تعینات ہے۔ چودھری عبدالمالک کے مخالفین کا خیال تھا کہ اس نے "بکا ڈوئیاں والا" کو نیچا دکھانے کے لیے اس کی بیوی کی گت کٹوائی ہے۔

۲۳ فروری ۸۱ء کو چودھری عبدالمالک کو سرائے عالمگیر جاتے ہوئے راستے میں فائرنگ کر کے قتل کر دیا گیا۔ اس واقعے میں چودھری عبدالمالک کا ڈرائیور زخمی ہوا۔ ڈرائیور کے بقول "بکا ڈوئیاں والا" کے بیٹے ریاست علی' عنایت علی' رشتہ دار سرور بوچھ اور کرایہ کے قتل بشیرا تیلی نے چودھری عبدالمالک پر کھاریاں چھاؤنی کے قریب فائرنگ کی۔ ڈرائیور چودھری عبدالمالک کو شدید زخمی حالت میں سی۔ ایم۔ ایچ کھاریاں تک لے گیا۔ لیکن راستہ میں ہی چودھری عبدالمالک جاں بحق ہوگیا۔ چودھری عبدالمالک کے بیٹے عبدالخالق نے ریاست علی' عنایت علی' سرور بوچھ اور بشیرا تیلی وغیرہ پر مقدمہ درج کرایا لیکن ملزمان کو گرفتار نہ کیا جا سکا۔ تقریباً ڈیڑھ سال بعد عنایت علی اور بشیرا تیلی عدالت میں پیش ہوگئے جب کہ دیگر ملزمان نے ضمانتیں کروا لیں۔ ملزمان چودھری ظہور الٰہی خاندان کے دباؤ کے باعث ضمانتوں پر رہا ہوئے۔ اس دوران چودھری عبدالمالک کیس کے مدعی ملک گلزار کو بھی قتل کر دیا گیا۔ ملزمان کے دباؤ کی وجہ سے مقدمہ کے گواہ عدالتوں میں گواہی نہ دے سکے اور ملزمان باعزت بری کر دیے گئے۔

اس دوران چودھری عبدالمالک کا اصل قاتل بشیرا تیلی احاطہ عدالت میں قتل کر دیا گیا۔ قاتل عارف نے خود کو پولیس کے حوالے کر دیا۔ عارف کے باپ کو ریاست علی وغیرہ نے سزائے موت دلوائی تھی اس لیے عارف نے ریاست کے دیرینہ ساتھی بشیرا تیلی کو قتل کر دیا۔ جب کہ مخالفین یہ الزام لگاتے ہیں کہ بشیرا تیلی کو عبدالمالک کے بیٹے عبدالخالق نے قتل کرایا۔

چودھری عبدالمالک خاندان کی سیاسی وابستگی پیپلز پارٹی کے نوابزادہ غضنفر گل وغیرہ کے ساتھ ہوگئی اور دوسرا گروپ چودھری شجاعت حسین اور چودھری پرویز الٰہی کی حمایت میں مسلم لیگ میں چلا گیا۔ اس دوران دونوں گروپوں میں مسلح تصادم ہوتا رہا اور سات کے

Marfat.com

قریب ایک دوسرے کے حمایتی قتل ہوگئے۔ اس کے بعد ایک دن ریاست علی کو تھانے سے واپس آتے ہوئے قتل کر دیا گیا۔ ملزمان میں منشی، عباس گگرالی اور سجاد بٹ وغیرہ کو نامزد کیا گیا۔ دونوں گروپوں کے مسلح افراد ایک دوسرے کی تاک میں رہنے لگے اور جدید ترین اسلحہ خریدتے رہے۔ چودھری عبدالمالک کے بڑے بیٹے چودھری عبدالخالق نے اپنے پانچ چھوٹے بھائیوں کو حفاظت کی خاطر اٹلی اور ناروے بھجوا دیا اور خود اپنے وفاداروں کی فوج کے ساتھ مخالفین کا مقابلہ کرنے لگا۔

ڈوئیاں والا خاندان جو علاقے میں چوری ڈکیتی اور قتل کی وارداتوں کے لیے مشہور تھا۔ اس کے افراد نے عبدالمالک خاندان سے دشمنی شروع ہونے کے بعد کاروبار اور سیاست میں آنا شروع کیا۔ ۸۷ء کے بلدیاتی انتخابات میں "بکا ڈوئیاں والا" کا بیٹا ریاست علی کامیاب ہوگیا۔ ریاست علی کے قتل کے بعد ڈوئیاں والا گروپ کے ساتھ ریاست کا بہنوئی سید وال گاؤں کا رہائشی محمد سرور بوچھ سابقہ ایم پی اے مسلم لیگ (ن) میں شامل ہوگیا۔ بعض ذرائع الزام لگاتے ہیں کہ سرور بوچھ گروپ کی ڈوئیاں والا گروپ میں شمولیت کے بعد چودھری شجاعت حسین کے چھوٹے بھائی وجاہت حسین نے اس گروپ کو جدید ترین اسلحہ لے کر دیا اور اس گروپ کو منظم کیا۔

ریاست علی کے قتل کے بعد دونوں گروپوں میں ایک بار شدید لڑائی ہوئی اور ۳ افراد ہلاک ہوگئے۔ ہلاک شدگان کرائے کے افراد تھے جو گجرات کے مختلف علاقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کے بعد گوجرانوالہ میں واقع کشمیر فلور ملز میں ایک رات عنایت علی جو وہاں اپنے رشتہ دار کا مہمان تھا، نامعلوم افراد کے ہاتھوں قتل ہوگیا۔ ملزمان فرار ہوتے ہوئے اس کی ملکیتی بندوق بھی ساتھ لے گئے۔ ڈوئیاں والا اور سرور بوچھ گروپ نے کوٹلہ ارب علی کے چودھری عبدالخالق کے خلاف قتل کا مقدمہ درج کرا دیا۔ عبدالمالک کے بڑے بیٹے چودھری عبدالخالق ایک مقدمہ قتل میں ۱۲ سال کی قید کاٹنے کے بعد اس واقعہ کے ڈیڑھ ماہ پہلے جیل سے رہا ہو کر آئے تھے۔

عنایت علی کے قتل کا مقدمہ براہ راست چودھری عبدالخالق اور ان کے ساتھیوں پر درج کرایا گیا۔ کوٹلہ ارب علی قصبہ میں اس مقدمہ قتل کے خلاف مقامی لوگوں نے علامتی ہڑتال کی اور ایک احتجاجی جلوس نکالا۔ ہزاروں کے مجمع میں چودھری عبدالخالق نے اپنی بے گناہی کا اظہار کیا اور اس کے بعد عبوری ضمانت کروا لی۔

عبدالمالک کے قتل اور چودھری عبدالخالق کی قید کے دوران کوٹلہ ارب علی خان

Marfat.com

میں "چودھری" کی جگہ خالی ہوگئی۔ چونکہ کوٹلہ ارب علی خان میں عبدالخالق کے مسلح حامی موجود تھے، اس لیے ڈویئاں والوں اور بوچھ گروپ کو ہمت نہ ہوئی کہ وہ کوٹلہ میں آتا لیکن ایک مقامی شخص ڈاکٹر اصغر (ایم۔ بی بی ایس) نے چودھراہٹ حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دی اور چودھری عبدالخالق کی مخالفت میں ڈویئاں گروپ اور بوچھ گروپ کے ساتھ جا ملا۔ اس کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر اصغر نے چودھری احمد مختار کے ساتھ بھی اپنے روابط بڑھا لیے۔

۲۹ دسمبر ۹۴ کی شام چودھری عبدالخالق اپنے ایک درجن باڈی گارڈز کے ساتھ لالہ موسیٰ میں حاجی اصغر کائرہ ایم۔ این۔ اے کی رہائش گاہ پر پہنچے ہی تھے کہ دو درجن سے زائد مسلح افراد نے اچانک حملہ کر دیا۔ جدید ترین اسلحہ سے لیس افراد آدھ گھنٹہ تک مسلسل فائرنگ کرتے رہے۔ اس فائرنگ سے حاجی عبدالخالق اور پانچ محافظ موقع پر ہلاک ہوگئے۔ حاجی عبدالخالق کے قتل میں سرور بوچھ سابقہ ایم پی اے اور ڈاکٹر اصغر کو براہ راست ملزم نامزد کیا گیا۔

چودھری عبدالخالق کا چھوٹا بھائی چودھری احمد رضا جو ناروے میں مقیم تھا، بھائی اور اس کے پانچ ساتھیوں کا بدلہ لینے کے لیے پاکستان چلا آیا۔ چودھری احمد رضا نے بتایا کہ اس نے مراکشی لڑکی سے شادی کر رکھی ہے اور گزشتہ کئی برسوں سے ناروے میں مقیم تھا۔ لیکن بھائی کی ہلاکت کے بعد انہیں ہر صورت میں بھائی کی جگہ سنبھالنا تھی اور بھائی کا بدلہ لینا تھا۔ اس لیے وہ مستقل طور پر پاکستان آ گئے ہیں۔

حاجی عبدالخالق کے قتل کے بعد ڈاکٹر اصغر گروپ کے افراد قصبہ چھوڑ کر بھاگ گئے۔ لیکن ڈاکٹر اصغر نے بدستور وہیں رہنے کا فیصلہ کیا۔ ۲۴ فروری ۹۶ء کو کوٹلہ ارب علی خان میں ایک مسلح شخص نے فائرنگ کر کے گھر کے دروازے پر ڈاکٹر اصغر کو قتل کر دیا۔ ڈاکٹر اصغر کے قتل کا مقدمہ حاجی عبدالخالق کے رشتہ داروں اور ساتھیوں پر درج کرایا گیا۔ جب کہ احمد رضا کو مشورہ دینے کی ذیل میں رکھا گیا۔ اس واقعہ کے ایک ماہ بعد دو نامعلوم موٹر سائیکل سواروں نے احمد رضا کے ملازم عبدالحمید کو اس کی حویلی کے باہر قتل کر دیا۔

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ چودھری احمد رضا اپنے بھائی کا بدلہ سرور بوچھ سے لینا چاہتا ہے جب کہ سرور بوچھ گروپ ہر صورت احمد رضا کو قتل کرنا چاہتا ہے۔ چودھری احمد رضا کو نواب زادہ غضنفر علی گل کی حمایت حاصل ہے جبکہ ڈویئاں والا گروپ کو چودھری شجاعت حسین خاندان کا تعاون حاصل ہے۔ ڈاکٹر اصغر گروپ کی حمایت سابقہ وفاقی

وزیر تجارت چودھری احمد مختار کر رہے ہیں۔ واضح رہے کہ چودھری عبدالخالق' جو نواب زادہ غضنفر علی گل کا دست راست تصور کیا جاتا تھا' اس کے قتل میں نامزد ملزم ڈاکٹر اصغر کی ضمانت پر رہائی چودھری احمد مختار کی کوششوں سے ہوئی تھی۔

چودھری احمد رضا نے میرے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے کہا "ہمیں سمجھ نہیں آتی کہ چودھری احمد مختار ہمارے ساتھ دشمنی کیوں مول لے رہا ہے کیونکہ ہمارا تو کام ہی دشمن کو ختم کرنا ہے یا پھر اس کوشش میں خود ختم ہو جانا ہے۔ گولی کسی بھی وی آئی پی شخصیت کا لحاظ نہیں کرتی اور نہ ہی دشمن داری میں یہ احساس ہوتا ہے کہ گولی کس شخصیت کو ماری جا رہی ہے۔ اگر ہم نہ چاہیں تو کوئی بھی سیاست دان ہمارے علاقے سے قومی و صوبائی اسمبلی کا ممبر نہیں بن سکتا۔ احمد مختار اپنی سیاست کو اپنے حلقہ انتخاب تک محدود رکھیں یہی ان کے لیے اور ان کے سیاسی کیریئر کے لیے بہتر ہے"۔

ایک مقامی زمیندار نے مجھے بتایا کہ چودھری احمد رضا روزانہ ہزاروں روپے مقامی لوگوں کے کھانے پر خرچ کرتا ہے۔ کوٹلہ ارب علی خان اور گرد و نواح کے سینکڑوں افراد روزانہ دو وقت چودھری احمد رضا کے ڈیرے سے کھانا کھاتے ہیں اور چودھری احمد رضا کو اپنی حمایت کا یقین دلاتے ہیں۔

سابقہ ایم این اے نوابزادہ غضنفر علی گل ہفتہ میں ایک بار چودھری احمد رضا کے ڈیرے پر حاضری دیتا ہے کیونکہ مقامی لوگوں کے مطابق اگر چودھری احمد رضا خاندان ۹۳ء کے انتخابات میں نواب زادہ غضنفر علی گل کی حمایت نہ کرتا تو پیپلز پارٹی کا یہ امیدوار کبھی بھی الیکشن نہ جیت سکتا۔ چودھری احمد رضا نے مجھے مزید بتایا کہ ابھی تک اس نے کوئی ایسا فیصلہ نہیں کیا کہ عملی سیاست میں آنا چاہیے کیونکہ اسے کبھی کسی سیاست دان کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ بلکہ علاقہ بھر کے سیاست دان یہ خواہش کرتے ہیں کہ انہیں چودھری احمد رضا کی حمایت حاصل ہو جائے۔ لیکن کل کلاں کو اگر الیکشن لڑنا پڑا تو امید ہے کہ میرے مقابلے میں کوئی بھی گجرات کا سیاست دان نہیں آئے گا کیونکہ ہمارا خاندان موت کو ہمیشہ ساتھ لے کر چلتا ہے اور ہماری دشمنی کوئی آسان کام نہیں۔ احمد رضا نے بتایا کہ وہ مرنے کو بالکل تیار ہے اور اس کی جگہ لینے کے لیے اس کے چار بھائی ناروے اور اٹلی میں بیٹھے انتظار کر رہے ہیں۔

میری اور میرے ساتھی قیوم صدیقی کی کوٹلہ موجودگی میں آزاد کشمیر قانون ساز اسمبلی کے انتخابات میں مسلم لیگ (ج) کے امیدوار شاہد حمید چودھری اپنے درجن بھر مسلح

Marfat.com

ساتھیوں کے ہمراہ چودھری احمد رضا کی حمایت حاصل کرنے کے لیے پہنچے۔ دوران گفتگو چودھری شاہد حمید نے اپنے ایک ساتھی کا تعارف کرواتے ہوئے کہا "چودھری رضا صاحب یہ شخص وہ ہے جس نے سرگودھا کے ڈپٹی کمشنر حمید اللہ اور اس کے چار ساتھیوں کو راکٹ لانچر فائر کر کے قتل کر دیا تھا" اس کے بعد خان نام کے اس سانولے رنگ کے آدمی نے ڈپٹی کمشنر کو قتل کرنے کے دوران آنے والی مشکلات کے بارے میں بتایا اور یہ بھی بتایا کہ کس طرح اس نے افغانستان میں ڈیڑھ سال جدید ترین اسلحہ استعمال کرنے کی تربیت حاصل کی۔

چونکہ گجرات میں اشتہاری ملزموں کو گرفتار کرنے کی روایت نہیں اس لیے چودھری احمد رضا کے ڈیرے پر بھی چھ سات اشتہاری ملزمان موجود تھے جن میں شامل ایک شخص عباس نے بتایا کہ "مجھے ایک مقدمہ قتل میں رشوت نہ دینے پر عمر قید کی سزا ہوئی ہے۔ چونکہ یہ سزا بالکل غلط سنائی گئی ہے اس لیے میں اپنی گرفتاری کیوں دوں اور اگر مجھے گجرات پولیس نے گرفتار کرنا ہے تو میں پھر اس ڈیرے (چودھری احمد رضا کے ڈیرے) پر کیوں بیٹھا ہوں"۔

فتیازا گروپ اور چودھری پرویز الٰہی

فتیازا گروپ کا تعلق تھانہ کڑیانوالہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں پیرو شاہ سے ہے۔ پیرو شاہ گاؤں کی صرف اتنی تاریخ ملتی ہے کہ اسے تقریباً ۲ سو سال پہلے مسمی پیرو قوم گوجر کھٹانہ نے اپنے بیٹے منور شاہ سے مل کر آباد کیا تھا۔ یہ دونوں باپ بیٹا موضع عمروال سے اٹھ کر اس جگہ آئے تھے۔ اس ویران جگہ پر اپنے گھر تعمیر کرنے کے بعد انہوں نے آبادی کا نام اپنے ناموں کی نسبت سے "پیرو شاہ" رکھا۔

پیرو شاہ میں قتل و غارت کا سلسلہ ۱۹۶۵ء میں شروع ہوا۔ دو مقامی گروپوں میاں خان گروپ اور مختار گروپ نے ایک دوسرے کے تین تین افراد قتل کر دیے اور دونوں گروپ اپنے آپ کو جدید خطوط پر مسلح کرنے کے لیے گاؤں سے بھاگ گئے۔ ۶۶ء میں فضل الٰہی چودھری (سابق صدر پاکستان) نے دونوں گروپوں کو واپس بلا کر صلح نامہ کرا دیا۔

تقریباً بیس برس کی خاموشی کے بعد میاں خان گروپ کے ایک نوعمر لڑکے امتیاز عرف فتیازا نے گھات لگا کر فائرنگ کی اور مختار گروپ کے تین افراد کو ایک ہی دن میں قتل کر دیا اور گاؤں سے فرار ہو کر سرور بوچھ گروپ میں شامل ہوگیا۔ اس کے بعد فتیازا کا

براہ راست تعلق چودھری پرویز الٰہی سے بنا اور اس نے اپنے ایک اور مخالف چودھری عنایت کے تین بیٹے بے دردی سے قتل کر دیے اور اسلحہ سمت "ظہور پیلس" میں چودھری پرویز الٰہی کے پاس چلا آیا۔ جو تین بھائی فتیانزا کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے' ان کے جنازہ میں شرکت کرنے کے لیے گجرات جیل میں سزائے موت کا منتظر ان کا چھوٹا بھائی پرویز بوچھ پیرول پر رہا ہو کر موضع بوچھ پہنچا۔ پرویز بوچھ کے ساتھ چند مسلح پولیس والے بھی تھے۔ اس موقع پر پرویز بوچھ نے اپنے ایک درجن مسلح ساتھیوں سے مل کر پولیس ملازمین کو زد و کوب کیا اور جنازہ پڑھنے کے بعد ہتھکڑیوں سمیت فرار ہو گیا۔

چونکہ فتیانزا گروپ کی حمایت پرویز الٰہی کر رہے تھے' اس لیے مفرور پرویز بوچھ نے پورے گجرات میں اعلان کرا دیا کہ وہ اب اپنے بھائیوں کے قاتل فتیانزا کو بعد میں قتل کرے گا لیکن پہلے چودھری پرویز الٰہی کو قتل کرے گا۔ پرویز بوچھ نے کئی بار مسلح ساتھیوں کے ہمراہ "ظہور پیلس" میں داخل ہونے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ چودھری پرویز الٰہی گجرات سے اسلام آباد منتقل ہو گئے اور انہوں نے اعلان کر دیا کہ فتیانزا گروپ کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہیں۔ چودھری پرویز الٰہی کے اس اعلان کے فوری بعد مقامی پولیس نے فتیانزا کو گرفتار کر لیا۔ ناکافی شہادتوں کے باعث فتیانزا کو سزائے موت تو نہ ہو سکی لیکن عمر قید کی سزا سنا دی گئی۔

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ پرویز بوچھ جو فرار ہونے سے پہلے سزائے موت کا منتظر تھا' آج تک گرفتار نہیں ہو سکا اور اس کی سیاسی وابستگی چودھری احمد مختار سابقہ وفاقی وزیر تجارت کے ساتھ ہے۔ باوثوق ذرائع کے مطابق پرویز بوچھ اپنا زیادہ وقت چودھری احمد مختار اور چودھری احمد سعید کے ساتھ گزارتا ہے اور اسے کئی بار سروس انڈسٹریز میں بھی دیکھا گیا ہے جب کہ فتیانزا گوجرانوالہ ڈسٹرکٹ جیل میں عمر قید کی سزا کاٹ رہا ہے۔ پرویز بوچھ کا اپنا گروپ ہے اور یہ گروپ علاقہ میں ناجائز اسلحہ کی فروخت اور دیگر چھوٹے موٹے جرائم کر کے گزارہ کرتا ہے۔

ڈوئیاں والا گروپ

تھانہ ککرالی کے اس گاؤں "ڈوئیاں" کے بارے میں روایت مشہور ہے کہ یہ چوروں اور ڈاکوؤں کا مسکن تھا۔ ڈوئیاں کئی بار برباد ہوا اور پرانی جگہ سے ہٹتا رہا۔ ڈوئیاں کے ایک رہائشی برکت علی عرف بکا ڈوئیاں کے بارے میں مشہور ہے کہ اس نے ۱۰۰ سے

Marfat.com

زائد قتل کیے۔ ۱۰۰ سال کی عمر پائی اور کبھی کسی لڑائی میں زخمی بھی نہ ہوا اور آخر کار طبعی موت مرا۔ برکت عرف بکا ڈوئیاں والا کو گجرات کا سب سے بڑا ڈاکو اور کرائے کا قاتل قرار دیا جاتا ہے۔ بکا ڈوئیاں والا کسی کو قتل کرتا تو مقتول گروپ قتل ہونے والے کی لاش دفناتا اور خوف کے مارے گاؤں سے نکل جاتا۔ کیونکہ آدمی قتل کروا کے بھی ڈوئیاں میں رہائش رکھنا اس کے مترادف تصور کیا جاتا کہ مقتول خاندان ڈوئیاں میں رہتے ہوئے برکت کا مقابلہ کرنا چاہتا ہے یا بدلہ لینا چاہتا ہے۔

برکت علی عرف بکا ڈوئیاں کے بارے میں یہ روایت مشہور ہے کہ وہ بعض اوقات اپنا اسلحہ چیک کرنے کے لیے کسی بے گناہ شخص کو قتل کر دیتا کیونکہ کسی بھی ایسے قتل کے بعد مقامی پولیس بکے کے خلاف مقدمہ درج نہ کرتی بلکہ مقتول فریق کو مجبور کرتی کہ وہ بکے کو بے گناہ قرار دیتے ہوئے فوراً اس گاؤں یا علاقہ کو چھوڑ دے ورنہ بکے کو کسی وقت بھی دوبارہ غصہ آ سکتا ہے۔

ڈوئیاں گروپ کا ایک بڑا رکن سیدوال کا بوچھ خاندان ہے۔ شروع میں بوچھ خاندان کی دشمنی اپنے ہی گاؤں کی جٹ برادری سے ہوگئی۔ ۵۰ء کے عشرے میں ایک جھگڑے میں بوچھ خاندان نے جٹ برادری کے ایک شخص کو انتہائی بے دردی سے قتل کر دیا۔ جواب میں جٹ برادری نے بوچھ خاندان کے چار افراد قتل کر دیے۔ جٹ برادری کے ہاتھوں قتل ہونے والوں میں بوچھ گروپ کے موجودہ سربراہ محمد سرور بوچھ سابقہ ایم پی اے مسلم لیگ (ن) کا والد' دادا اور چچا شامل تھے۔ سرور بوچھ اس وقت پاکستان ایئرفورس میں ملازم تھا۔ علاقے کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے سرور بوچھ نے سرکاری ملازمت کو خیرباد کہا اور باپ' دادا اور چچا کے قاتلوں سے انتقام لینے کے لیے گاؤں آ گیا اور اپنا گروپ تشکیل دے دیا۔ جب دونوں طرف گروپ بندی شروع ہوئی اور قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوا تو مجبوراً جٹ برادری کو اپنی شکست تسلیم کرتے ہوئے گاؤں چھوڑنا پڑا۔

جٹ برادری کے گاؤں سے چلے جانے کے بعد سرور بوچھ گروپ کے سامنے کوئی دشمن نہ رہا تو اس نے اپنے مسلح ساتھیوں کے گروپ کو منتشر ہونے سے بچانے کے لیے اپنے آپ کو اپنے رشتہ دار ڈوئیاں گروپ میں مدغم کر لیا۔ بکا ڈوئیاں کے بیٹے ریاست علی کی شادی سرور بوچھ کی بہن سے ہوئی تھی۔

ڈوئیاں اور سرور بوچھ گروپ کے مخالف گروپ کوٹلہ ارب علی خان گروپ کا تعلق نوابزادہ غضنفر علی گل خاندان سے تھا اس لیے ڈوئیاں گروپ نے چودھری ظہور الٰہی

خاندان سے اپنا ناتا جوڑ لیا۔ دونوں گروپ ایک دوسرے کے آدمیوں کو قتل کرتے اور ان کی جائیدادوں پر قبضے کرتے رہے اور انہیں اپنے اپنے سیاسی گروپوں کی حمایت حاصل رہی۔ اسی اثناء میں ۹۰ء کا الیکشن آ پہنچا اور چودھری شجاعت حسین اور چودھری پرویز الٰہی نے سرور بوچھ کو ایم پی اے کا ٹکٹ دے دیا۔ سرور بوچھ چودھری خاندان سے مل کر سیاست کے میدان میں داخل ہوا اور انتخابات میں بھاری اکثریت سے جیت گیا۔

حکومت مسلم لیگ کی بنی اور مخالف سیاسی گروپ کے افراد کونے کھدروں میں جا چھپے۔ سرور بوچھ نے اپنے مسلح آدمیوں کو کھلی اجازت دے دی کہ وہ جہاں چاہیں بھتہ وصول کر سکتے ہیں' جسے چاہے قتل کر دیں اور جسے چاہیں اغوا کر لیں۔ تحصیل کھاریاں کی ساری انتظامیہ سرور بوچھ گروپ اور ڈوئیاں گروپ کے سامنے مفلوج ہو کر رہ گئی۔ سرور بوچھ نے اپنے مخالفین کو چن چن کر قتل کرانا شروع کیا اور اس کا گروپ گجرات کا سب سے بڑا اور جدید ترین اسلحہ سے لیس گروپ بن گیا۔

ڈوئیاں گروپ اور سرور بوچھ گروپ کی "کامیابی" کو دیکھتے ہوئے ایک مقامی گروپ شادیوال گروپ بھی اس میں شامل ہوگیا۔ شادیوال گروپ کے ایک درجن سے زائد اشتہاری بدمعاشوں نے ڈوئیاں اور سرور بوچھ گروپ میں شامل ہو کر اپنے پانچ مخالفین کو قتل کر دیا اور علاقہ بھر میں بھاری بھتہ وصول کرتے رہے۔ تینوں گروپوں کے اس آمیزہ کا پہلا اور بڑا نشانہ کوٹلہ ارب علی خان گروپ تھا لیکن کوٹلہ ارب کے چودھری عبدالخالق جیل میں تھے اور ان کے بھائی یورپ میں مقیم تھے' اس لیے انہیں کوئی جانی نقصان تو نہ پہنچایا جا سکتا تھا لیکن ان کی املاک کو اس گروپ نے تباہ کر دیا۔

اس وقت ڈوئیاں گروپ کے پاس کوئی سربراہ نہیں کیونکہ بکا کے بعد اس کے بیٹے ریاست علی اور عنایت علی وغیرہ بھی قتل ہو چکے ہیں اور ان کی اولاد میں سے ابھی تک کوئی اہم نام سامنے نہیں آیا۔ البتہ سرور بوچھ پوری آن بان کے ساتھ اپنے درجنوں مفرور ساتھیوں کے ساتھ اپنے گاؤں میں موجود ہے اور اپنے دیرینہ حریف کوٹلہ ارب علی خان گروپ پر وار کرنے کے مواقع تلاش کر رہا ہے۔ دوسری طرف مقتول عبدالخالق کا چھوٹا بھائی احمد رضا اپنے گروپ کو مقابلے کے لیے پوری طرح تیار کر چکا ہے اور دن رات سرور بوچھ گروپ کی تلاش میں ہے۔ کوٹلہ ارب علی کے ایک پولیس آفیسر نے بتایا کہ سرور بوچھ ہر وقت ظہور پیلس میں موجود رہتا ہے اور جیسے ہی حکومت تبدیل ہوئی وہ ایک بار پھر مخالفین کا مقابلہ کرنے کے لیے نکل آئے گا۔

Marfat.com

آج کل ڈاکٹر اصغر کے بھائی اور دیگر رشتہ دار ڈویئاں گروپ اور سرور بوچھ سے مل کر ڈاکٹر اصغر کے قتل کا بدلہ لینا چاہتے ہیں اور افغانستان وغیرہ میں تربیت حاصل کرنے میں مصروف ہیں۔

دیونہ کے اشرف اور اختر گروپ

دیونہ میں قتل و غارت کا بازار اس وقت گرم ہوا جب ۱۹۷۹ء میں بلدیاتی انتخابات کا مرحلہ آیا۔ آسودہ حال گاؤں کے گوجروں میں یہ خواہش جاگ اٹھی کہ انہیں گاؤں کا چودھری بننا چاہیے۔ دشمنی کا باقاعدہ آغاز ضلع کونسل کے ممبر اور دیونہ کے رہائشی چودھری اشرف کی طرف سے ہوا۔ چودھری اشرف کے مسلح افراد نے مخالف گروپ چودھری اختر کے ڈیرہ پر حملہ کر کے دو افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کے بعد چودھری اشرف نے پاکستان پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی اور مخالف گروپ خود بخود چودھری ظہور الٰہی خاندان کی طرف چلا گیا۔

اس کے بعد ایک جھگڑے میں اشرف گروپ نے جدید ترین اسلحہ سے فائرنگ کر کے اختر کا بھائی قتل کر دیا۔ جواب میں اختر گروپ نے حملہ کر کے اشرف کے بھائی چودھری مختار کو قتل کر دیا۔ دونوں گروپ اپنے اپنے سیاسی حلیفوں کے پاس پہنچے اور مزید کمک لے کر واپس آئے۔ وقفوں وقفوں سے دونوں گروپوں میں جنگ جاری رہی اور دونوں گروپوں کے لوگ قتل ہوتے رہے۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ چودھری اشرف اور چودھری اختر گروپ کے ۱۷ افراد قتل ہو چکے ہیں اور دونوں گروپ جدید ترین اسلحہ اور جدید گاڑیوں سے لیس ہیں اور ہر وقت کسی خونی تصادم کے لیے پر تولتے رہتے ہیں۔

چودھری اشرف اس وقت پیپلز پارٹی ضلع گجرات کے ایڈیشنل سیکرٹری جنرل ہیں اور ان کا براہ راست تعلق احمد مختار خاندان کے ساتھ ہے جب کہ چودھری اختر گروپ کے زیادہ افراد "ظہور پیلس" تک محدود ہو کر رہ گئے ہیں کیونکہ انہیں خدشہ ہے کہ باہر نکلنے کی صورت میں پولیس ان کو قتل کر دے گی یا مخالفین مار دیں گے۔

گجرات کی مختصر تاریخ

ضلع گجرات دریائے جہلم اور چناب کے درمیانی علاقہ پر محیط ہے اور گوجرانوالہ ڈویژن کا شمالی ضلع کہلاتا ہے۔ شمال مغرب میں دریائے جہلم اور جنوب میں دریائے چناب

Marfat.com

بہتا ہے۔ دریائے جہلم اور دریائے چناب کے درمیان اگر سیدھی لائن لگائی جائے تو یہ فاصلہ تیس میل بنتا ہے۔ ضلع گجرات جو پہلے تین تحصیلوں گجرات' کھاریاں اور پھالیہ پر مشتمل تھا' منڈی بہاؤالدین کے ضلع بن جانے سے اب صرف گجرات اور کھاریاں تحصیل تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق ضلع گجرات کی کل آبادی (تحصیل کھاریاں اور تحصیل گجرات) ۱۲ لاکھ ۸۸ ہزار ۸ سو ۱۹ نفوس پر مشتمل تھی۔

ایک تاریخی روایت کے مطابق گجرات کا سنگ بنیاد ایک غیر معروف شخص راجہ بکین پال سورج بنسی راجپوت نے رکھا۔ شہر کا اصل نام "اودھے نگری" تھا۔ یہ بات جنرل کینگ ہام نے تحریر کی ہے۔ پرانے شہر کی بحالی کا سہرا گوجر قبیلے کے ایک شخص علی خان کے سر باندھا جاتا ہے۔ دوسری طرف کیپٹن میکنزی کا کہنا ہے کہ یہ شہر سیالکوٹ کے راجہ رسالو کے بیٹے بدرسین نے رانی "گجراں" کیلئے ۱۸۸ء میں دوبارہ تعمیر کرایا تھا۔ دونوں مذکورہ بالا مصنف اس بات پر متفق ہیں کہ اکبر بادشاہ کے دور حکومت میں اس شہر کو بالاخر حتمی طور پر بحال کر دیا گیا۔

کیپٹن واٹر فیلڈ کی پیش کردہ تاریخ سے تقریباً ایک صدی پہلے اس ضلع کے ایک حصہ پر مستحکم حکومت کے نشانات ملتے ہیں۔ بہلول شاہ لودھی کے دور حکومت میں ایسا لگتا ہے جیسے دریائے چناب کے دائیں کنارے پر ملک کا ایک قطعہ جس میں یہ ضلع شامل تھا' کو سیالکوٹ کے صوبہ سے الگ کر دیا گیا اور یہ ضلع بہلول پور کے نام سے ایک آزاد مقام بن گیا۔ اکبر کے متعلق یہ روایت مشہور ہے کہ وہ اپنی حکومت کے تیسویں یا چو تیسویں سال میں ملک کے اس حصے میں آیا اور ملک کے اس حصہ کے پڑوس میں رہنے والے گوجروں کو اکسایا کہ وہ گجرات کو بحال کریں اور اسے ضلعی ہیڈ کوارٹر بنا لیا۔ آدھے حصے پر گوجر قبیلہ نے قبضہ کر لیا اور دوسرے حصہ پر جاٹ قوم قابض ہوگئی۔ بعد میں اس نئے ضلع کا نام چکلا گجرات رکھا گیا۔

کرنل واٹر فیلڈ کی رپورٹ کے مطابق گجرات میں وڑائچ جٹ قبیلہ کے پاس اول قسم کی زرعی اراضی (خصوصاً دریائے چناب کے ساتھ ساتھ) ہے۔ گوجر زیادہ تر تحصیل کھاریاں اور گجرات کے شمالی حصے میں آباد ہیں۔ "پنجاب چیفس" نامی کتاب کے مرتبہ مسٹر گریفن کے مطابق سلطان محمود غزنوی کے ہمراہ ایک شخص پہلی بار ہندوستان کی مہم پر آیا اور کلاچور جلالپور جٹاں کے نزدیک آباد ہوا۔ ۳۵۰ سال بعد اس کے خاندان میں ایک شخص وڑائچ نامی پیدا ہوا جس کی اولاد اب یہ سارے وڑائچ جٹ ہیں۔ چونکہ یہ علاقہ گوجر اور

Marfat.com

جاٹ لوگوں کی ملکیت تھا' انہی کے ناموں کی مناسبت سے "گوجرات" اور آج کل "گجرات" کہلاتا ہے۔

اجڑنے بسنے کی داستان---کوٹلہ ارب علی خان

گجرات سے بھمبر جاتے ہوئے تقریباً ۳۴ کلومیٹر کے فاصلے پر کوٹلہ ارب علی خان نام کا ایک بڑا قصبہ آباد ہے۔ ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی اس وقت آٹھ ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔

کوٹلہ ارب علی خان کے اردگرد کا علاقہ نالہ بھمبر کے بائیں کنارے سے شروع ہو کر نالہ بھنڈر کے مشرق تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ علاقہ کبھی آزاد کشمیر میں شامل تصور کیا جاتا تھا۔ انگریز دور حکومت میں ریاست کشمیر سے کٹ کر اس حدود میں شامل ہوا۔

۱۹۵۷ء کے بندوبست اراضی کے مطابق ۱۵۵۷ء میں ریحان نامی ایک شخص کھاریاں کے کسی گاؤں سے اٹھ کر یہاں آباد ہوا۔ ریحان جس کی قوم گجر اور ذات مراڑیہ تھی' کے بارے میں یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ اپنا گاؤں چھوڑ کر یہاں کیوں آباد ہوا۔ کچھ ہی عرصہ بعد یہ گاؤں چوری اور ڈکیتی کی بے شمار وارداتوں کے باعث غیر آباد ہو گیا۔ گاؤں کے مکینوں نے حاکم وقت "ارب علی خان" کے پاس پناہ لی۔ جس نے بعد میں مقامی لوگوں کی حفاظت کے لیے ایک قلعہ بنایا اور اسے مسمی بلور قوم گجر گوت ڈھینڈا کی ملکیت میں دے دیا۔ اس بستی کا پہلا نام سلیمان پور تھا۔ جب ارب علی خان نے قلعہ تعمیر کرا دیا تو اس بستی کا نام "کوٹ ارب علی خان" معروف ہوا جو رفتہ رفتہ "کوٹلہ" ارب علی خان بن گیا۔ "کوٹلہ" ہندی زبان میں چھوٹے قلعے کو کہتے ہیں۔

اب یہاں کسی قلعہ کے آثار تو نظر نہیں آتے البتہ پرانے شہر کی آبادی ایک ٹیلے پر ہے۔ جس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہاں کسی زمانے میں کوئی قلعہ موجود تھا۔ ٹیلے پر ایک کھلا میدان بھی ہے' جس پر ایک بزرگ کی درگاہ ہے۔

Marfat.com

بی ایل ایف کے احسان اللہ خان کی لوٹ مار

بی ایل ایف کی مطبوعہ تاریخ، بی ایل ایف کے اراکین، وکلاء، بھٹہ مزدور محاذ کے عہدیداران، مزدوروں، کارپٹ انڈسٹری، بھٹہ مالکان اور حتیٰ کہ اس وقت احسان اللہ خان کے شدید ترین مخالفوں کے پاس بھی ایک ہی مشترک داستاں ہے کہ احسان اللہ خان نے اپنا کیرئیر کیسے شروع کیا۔ ۶۶ء میں احسان اللہ خان جو ایم او کالج میں انٹرمیڈیٹ (آرٹس) کا طالب تھا، اس نے ایک شام مال روڈ کے کنارے ایک ضعیف دیہاتی کو روتے دیکھا، نوجوان احسان اللہ سمجھا کہ بزرگ سڑک پار کرنا چاہتا ہے۔ اس نے اسے سڑک پار کرانا چاہی لیکن بزرگ پہلے سے زیادہ رونے لگا اور نوجوان کے استفسار پر اس نے ٹھیٹھ پنجابی میں رندھی ہوئی آواز میں اپنی بپتا سنانی شروع کر دی۔ یہاں پر کہانی افسانوی موڑ لیتی ہے کہ بزرگ کی زبان نوجوان بلوچ احسان اللہ خان (بلوچ کی اصلیت متن کے اگلے حصے میں آئے گی) کی سمجھ سے بالاتر تھی اس لیے دونوں میں طے ہوا کہ وہ کل اپنے ساتھ ایسے افراد کو لے کر اسی مقام پر پہنچیں گے، جو باہم رابطے کا کام کریں اور دونوں خصوصاً نوجوان "بلوچ" احسان اللہ ضعیف اور مظلومیت کی تصویر بزرگ کی بات سمجھ سکے۔

سو کہانی کے مطابق ایسا ہی ہوا۔ اگلے دن نوجوان "بلوچ" نے ضعیف پنجابی بزرگ کی کہانی سنی جس کا دردناک پہلو یہ تھا کہ بزرگ جو کہ لاہور کے نواحی علاقے جلو موڑ میں صادق موٹا نامی ایک شخص کے بھٹہ خشت پر مزدوری کرتا تھا۔ اس نے مالک سے کچھ رقم بطور پیشگی لے رکھی تھی لیکن کوشش کے باوجود وہ پیشگی کی رقم لوٹانے سے قاصر تھا، سو مالک نے فیصلہ کیا کہ ضعیف مزدور بابا کلا کی پندرہ اور سترہ برس کی دو جوان بیٹیوں کو وہ اور منشی آپس میں بانٹ لیں۔ مالک نے بابا کلا کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا اور دو دن کی مہلت دے دی کہ اگر وہ پیشگی رقم (جس کے بارے میں صحیح اعداد و شمار نہیں ملتے) لوٹا دے تو

Marfat.com

اس کی لڑکیاں محفوظ رہیں گی، چنانچہ بابا کلا یہ قیامت کا فیصلہ سن کر آخری کوشش کے طور پر لاہور کی شاہراہ مال روڈ تک آ پہنچا تھا۔ نوجوان "بلوچ" احسان اللہ خان نے پوری داستان سنی اور بابا کلا کو اس وقت کے معروف وکیل چوہدری اصغر علی کے دفتر لے آیا۔ مذکورہ وکیل نے ڈپٹی کمشنر لاہور کو بچیوں کی رہائی کے لیے .یلف تشکیل دینے کی درخواست دے دی۔ .یلف نے چھاپہ مارا اور بابا کلا کی بچیاں باعزت برآمد ہوگئیں اور ساتھ ہی نوجوان بلوچ احسان اللہ ملک کے بھٹہ مزدوروں کی کسمپرسی دیکھتے ہوئے جذبہ صادق لے کر مزدور خدمت کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ بھٹہ مزدور محاذ کے بانی لیڈر بابا عنایت کے مطابق نوجوان احسان اللہ نے بابا کلا سے چوہدری اصغر علی کے علم میں لائے بغیر .یلف کے نام پر پیسے بٹورے اور یہ احسان اللہ خان کی پہلی بدعنوانی تھی۔

احسان اللہ خان کی جائے پیدائش اور تاریخ پیدائش کے بارے میں متضاد دعوے آئے ہیں۔ احسان اللہ خان ۱۹۴۶ء نومبر یا دسمبر میں محکمہ ڈاک کے منشی کریم بخش (واضح رہے کہ کریم بخش کا تعلق ارائیں خاندان سے تھا) کے گھر امرتسر کے نواحی گاؤں ولریاولوں میں پیدا ہوا، اور تقسیم کے بعد والد کے ہمراہ جن کا تبادلہ لسبیلہ (بلوچستان) ہو چکا تھا، پاکستان آگیا لیکن دوسرا دعویٰ یہ ہے کہ احسان اللہ کی پیدائش لسبیلہ میں ہوئی اور اس نے ابتدائی تعلیم بھی وہیں حاصل کی۔ البتہ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ تار بابو یم بخش نے دو شادیاں کیں۔ پہلی بیوی سے امان اللہ نام کا بیٹا اور دو بیٹیاں ثریا بی بی اور اس سے چھوٹی بیٹی (اس کا دماغی توازن درست نہیں) پیدا ہوئی۔ کچھ عرصہ بعد کریم بخش کی بیوی انتقال کر گئی تو انہوں نے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن پھر اچانک کریم بخش نے اپنی بیٹی ثریا بی بی کے وٹے سٹے میں پتوکی شہر میں دوسری شادی کر لی جس سے احسان اللہ پیدا ہوا۔ کریم بخش نے محکمہ ڈاک سے ریٹائرمنٹ کے بعد لاہور منتقل ہونے کا فیصلہ کیا اور خاندان کے ہمراہ ۲۲ مسلم روڈ پرانا سانده میں ایک پانچ مرلہ کا مکان خرید لیا۔ احسان اللہ خان نے میٹرک کے بعد ایم او کالج میں داخلہ لے لیا اور دوران تعلیم اس کا تعلق بابا کلا کے ذریعے بھٹہ مزدوروں سے ہوا اور احسان اللہ مزدوروں سے آملا۔

چوہدری اصغر علی ایڈووکیٹ جنہوں نے .یلف کے ذریعے بابا کلا کی بچیاں برآمد کرائی تھیں۔ بھٹہ مزدوروں کے مستقل قانونی مشیر کے طور پر مشہور ہوگئے اور مزدوروں کی بڑی تعداد نے ان کے پاس جانا شروع کر دیا۔ ۱۹۶۸ء میں بابا عنایت اور دوسرے بھٹہ مزدوروں نے چندہ اکٹھا کر کے ۴ مزنگ روڈ پر بھٹہ محاذ (واضح رہے کہ بھٹہ مزدور محاذ تادم

Marfat.com

تحریر رجسٹرڈ یونین نہیں) کے نام سے دفتر کھول لیا۔ اس دوران احسان اللہ خان کالج سے فارغ ہونے کے بعد روزانہ شام کو دفتر میں آتا اور مزدوروں سے ملتا رہا۔ اس کے بعد احسان اللہ انٹرمیڈیٹ کر کے فارغ ہوا تو اس نے اپنا تمام وقت بھٹہ مزدوروں کے درمیان گزارنا شروع کر دیا۔ انہی دنوں احسان اللہ نے چوہدری اصغر علی ایڈووکیٹ اور مزدوروں کو بیک وقت دھوکہ دینا شروع کیا' وہ ایسے کہ جب کوئی مزدور کسی بھٹہ مالک کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرتا تو احسان اللہ بیچ میں حائل ہو جاتا اور چوہدری اصغر علی کے نام پر مزدوروں سے بھاری رقم وصول کر لیتا جب کہ چوہدری اصغر علی ۱۹۶۲ء سے تادم تحریر بغیر فیس کے مزدوروں کے مقدمات لڑتے آ رہے ہیں۔ مزدوروں کے مطابق احسان اللہ جب مظلوم بھٹہ مزدوروں سے پیسے لیتا تو اگر مزدور مسیحی ہوتا تو بائبل اور اگر مسلمان ہوتا تو قرآن پر اس سے حلف لیتا کہ وہ چوہدری اصغر علی اور دوسرے مزدوروں سے اس کا ذکر نہیں کرے گا' کیونکہ اگر اس نے پیسوں کا ذکر کیا تو حکومت کو پتہ چل جائے گا جو چوہدری اصغر کو قید کر دے گی اور پاکستان میں کوئی دوسرا وکیل ایسا نہیں جو مزدوروں کے مقدمات عدالتوں میں دلیری کے ساتھ لڑے۔ اس طرح ملک کے سارے بھٹہ مالک مزدوروں کو قتل کر دیں گے اور ان کی بچیوں کو اٹھا لیں گے۔ بیچارہ سہما ہوا مزدور مزید اپنے ہونٹ بھینچ لیتا اور احسان اللہ کا بہترین روزگار چلتا رہا۔ ان دنوں احسان اللہ کا ریٹ فی مزدور ۲ سے ۴ ہزار روپے تھا۔ ۱۹۷۱ء میں بھٹہ مزدور محاذ کا دفتر ۴ مزنگ روڈ سے فیروز پور روڈ پر چاروں طرف پھیلے اینٹوں کے بھٹوں کے نواح میں منتقل کر دیا گیا۔ احسان اللہ کو فیروز پور روڈ کا دفتر اچھا نہ لگا کیونکہ یہ شہر سے دور تھا اس لیے اس نے اس کی شدید مخالفت کی اور مزدوروں کو آپس میں لڑا دیا۔ احسان اللہ کے حامی مزدوروں نے بھٹہ مزدور محاذ کے صدر بوٹا مسیح پر الزام لگایا کہ وہ مزدوروں کے اکٹھے کیے ہوئے چندے میں بدعنوانی کر رہا ہے۔ اس دوران احسان اللہ نے صوفی طفیل نام کا ایک منشی رکھ لیا جو مزدوروں سے پیسے لے کر احسان اللہ کو دینے لگا۔ مزدورں میں احسان اللہ کا گروپ مضبوط ہوگیا تھا اس لیے انہوں نے زبردستی ۱۹۷۳ء میں بھٹہ مزدور محاذ کے دفتر کو فیروز پور روڈ سے مال روڈ پر واقع دیال سنگھ مینشن میں منتقل کر دیا۔ ساتھ احسان اللہ خان نے ایک اخبار ہلال پاکستان کے نمائندے کے طور پر کام شروع کیا اور دیال سنگھ مینشن میں ہی دفتر کھول لیا جو بعد میں بھٹہ مزدور محاذ کے دفتر میں ضم کر دیا گیا۔ اس دوران لاہور ڈویژن کے بھٹہ مزدوروں تک احسان اللہ خان اور چوہدری اصغر کی شہرت پہنچ چکی تھی لہٰذا روزانہ دس پندرہ کیس احسان اللہ کے پاس آنے لگے۔

Marfat.com

جس سے ایک دم دولت آنا شروع ہو گئی۔ اس دوران احسان اللہ خان نے ہر جمعہ کے دن لاہور کے نواحی علاقوں میں بھٹوں پر حاضری دینا شروع کر دی۔ دائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی میں چابیوں کے گچھے کے ساتھ چھوٹی سی صلیب لٹکائے مسکراتا ہوا احسان اللہ مزدوروں اور خصوصاً مسیحی مزدوروں کے لیڈر کے طور پر پہچانا جانے لگا۔ اس کے ہر خطاب میں یہ الفاظ ضرور ہوتے "میں نے تو اپنی زندگی مزدوروں کے لیے وقف کر دی ہے' نہ میں نے شادی کی ہے اور نہ ہی میرے ماں باپ ہیں۔ ہر مزدور کا خاندان دراصل میرا خاندان ہے"۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس دوران مزدوروں کی طرف سے دائر کیے جانے والے کسی ایک مقدمے میں بھی احسان اللہ مدعی نہیں بنا۔

لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ قائم ہے کہ شروع میں جب احسان اللہ نے مزدوروں کے لیے جدوجہد کی تو اسے بہت کامیابی ہوئی اور اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ۱۹۷۰ء سے پہلے بھٹہ مزدوروں کی جو حالت تھی وہ بہت قابل رحم تھی اور انہیں واقعی ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جو انہیں بھٹہ مالکان کے عتاب سے بچائے۔ سو احسان اللہ خان نے یہ کام کر دکھایا اور مزدور جس کو خاندان سمیت زر خرید غلام سمجھا جاتا تھا' اس کو بھٹہ مالکوں کی قید سے رہائی دلوائی۔ اس کے بعد مزدوروں نے اپنے مسائل کے لیے عدالتوں سے رجوع کرنا شروع کر دیا۔ اگرچہ احسان اللہ کی حیثیت دلال کی ہو کر رہ گئی اور اس پر الزام لگایا جاتا کہ وہ مزدوروں سے وکیل کے علم میں لائے بغیر پیسے بٹور لیتا ہے۔

ملک کے معروف سائنس دان ڈاکٹر اسلم خان نے ۷۲ء میں احسان اللہ خان کی وساطت سے بھٹہ مزدوروں کے لیے کام شروع کیا۔ ڈاکٹر اسلم نے بتایا "میں نے احسان اللہ کے اصرار پر اس کے ساتھ مزدوروں کی حالت دیکھنے بھٹوں پر جانا شروع کیا اس دوران میں نے شدت سے محسوس کیا کہ بھٹہ مزدوروں کی اکثریت غذائی قلت کی وجہ سے مختلف قسم کی بیماریوں میں مبتلا ہے۔ پورے پنجاب کا دورہ کرنے کے بعد میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے کہ ۸۰ فیصد مزدور ٹی بی اور دوسری خطرناک بیماریوں کا شکار ہوگئے ہیں۔ میں نے روٹری کلب اور دوسرے رفاہی اداروں سے امداد حاصل کر کے بیمار مزدوروں کا علاج کرانا شروع کیا اور یوں بھٹہ مزدور محاذ کے ساتھ منسلک ہوگیا۔ ابتدائی دنوں میں میں نے احسان اللہ کو ایک دردمند کارکن کے طور پر محسوس کیا"۔

۸۸ء میں جسٹس افضل ظلہ کو بھائی پھیرو کے مزدوروں نے تار بھیجے کہ بھٹہ مالکان رانا شریف اور رانا قیوم نے لاتعداد مزدور خاندانوں کو جبری مشقت پر مجبور کر رکھا ہے اور

عورتوں کو جنسی تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ عدالت نے فوری ایکشن لیا اور مذکورہ مالکان کو اور مزدور خاندانوں کو عدالت میں طلب کر لیا۔ بھٹہ مالکان نے لاہور کے معروف وکلاء کی خدمات حاصل کر لیں جب کہ مزدوروں نے عدالت میں ۸۷ کے قریب مزدور عورتوں اور بچوں کو پیش کر دیا۔ بچوں کو عدالت میں پیش کرنے میں عاصمہ جہانگیر نے اہم کردار ادا کیا۔ احسان اللہ بھی مزدور بچوں کے ساتھ عدالت میں موجود تھا۔ اس موقع پر ایک کمسن بچی شریفاں نے عدالت میں بے دھڑک بیان دے دیا کہ اس کو بھٹہ مالک اور اس کے کارندوں نے کئی بار جنسی تشدد کا نشانہ بنایا ہے۔ تمام بیانات کے بعد جسٹس افضل ظلہ نے وہاں موجود احسان اللہ سے دریافت کیا کہ اس کا مزدوروں سے کیا تعلق ہے (حالانکہ احسان اللہ اس دوران بھٹہ مزدور محاذ کے صدر کے طور پر جانے جاتے تھے) تو احسان اللہ نے بھری عدالت میں جواب دیا کہ وہ خود مزدور ہے اور مزدوروں کے لیے کام کرتا ہے۔ جسٹس ظلہ نے مزدوروں سے مخاطب ہو کر کہا کہ میں چھ منٹ کا وقفہ کرتا ہوں مجھے بھٹہ محاذ کے عہدیداران کی لسٹ فراہم کی جائے۔ مزدوروں نے کمرہ عدالت کے باہر نکل کر محاذ کے عہدیداروں کا چناؤ کیا اور احسان اللہ کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ انہوں نے بابا عنایت مسیح کو صدر، فیروز مسیح کو چیئرمین، عزیزاں بی بی کو عورتوں کی صدر اور صوفی طفیل کو سیکرٹری چن لیا اور لسٹ احسان اللہ اور صوفی طفیل کے سپرد کر دی۔ مزدور کمرہ عدالت کے باہر ہی کھڑے رہے جب کہ احسان اللہ لسٹ اندر لے گیا۔ ایک ماہ بعد جب فیصلہ ہوا اور فیصلہ کی نقل مزدوروں کو ملی تو بھٹہ مزدور محاذ کے صدر کے طور احسان اللہ خان کا نام درج تھا جو احسان اللہ نے مزدوروں سے لسٹ لے کر اندر پہنچانے کے بہانے عنایت مسیح کا نام مٹا کر خود لکھ لیا تھا۔ عدالت نے فیصلہ کیا کہ مزدور پابند نہیں اور پانچ ہزار تک پیشگی معاف ہوگئی جب کہ اس سے زیادہ پیشگی وصول کرنے کے لیے سول کورٹ سے رجوع کرنے کا حکم دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی آئندہ سے پیشگی سسٹم ختم اور اگر کوئی پیشگی دینا چاہتا ہے تو وہ ایک ہفتے کے کام کی پیشگی دے۔ اگلے روز اخبارات میں جلی سرخیوں کا مقابلہ ہوا کہ "بھٹہ مزدور آزاد ہوگئے"۔ احسان اللہ نے تمام اخبارات سے خبر کے تراشے حاصل کیے اور انہیں ایک رنگین کاغذ پر چپکا کر چھپوا دیا اور اس کاغذ کو "پروانہ آزادی" کا نام دیا اور بھٹہ مزدور محاذ کے ممبروں کی ڈیوٹی لگ گئی کہ وہ "اس پروانہ آزادی" کو ملک بھر میں درج ذیل نرخوں کے تحت فروخت کریں۔

ا۔ ۱۰۰۰ روپے پیشگی والے خاندان سے ۲۰۰ روپے

Marfat.com

۲۔ ۲۰۰۰ روپے پیشگی والے خاندان سے ۳۰۰ روپے

۳۔ ۵۰۰۰ روپے پیشگی والے خاندان سے ۵۰۰ روپے

۴۔ ۱۰۰۰۰ روپے پیشگی والے خاندان سے ۱۰۰۰ روپے

بعض علاقوں میں پروانہ آزادی دس ہزار روپے میں بھی فروخت ہوا اور ایک محتاط اندازے کے مطابق احسان اللہ خان نے ڈیڑھ کروڑ روپیہ "پروانہ آزادی" سے کمایا۔ بھٹہ مزدور محاذ کے دفتر میں ملک بھر کے مزدوروں کا تانتا بندھ گیا اور احسان اللہ ملک گیر شہرت حاصل کر گیا۔ اس دوران یہ مسئلہ اٹھا کہ قالین بافی کی کھڈیوں پر جو لوگ پیشگی لے کر کام کرتے ہیں ان کو بھی آزاد کرایا جائے۔ اس وقت یہ طے ہوا کہ بھٹہ مزدور محاذ صرف بھٹہ مزدوروں کے معاملات میں دخل دے گا' لیکن صرف فرد واحد احسان اللہ نے اس کی مخالفت کی اور فیصلہ کیا کہ پیشگی لے کر کام کرنے والے تمام مزدوروں کو اس میں نمائندگی دی جائے گی اور بالآخر دسمبر ۹۰ء میں فیصلہ ہوا کہ تنظیم کا نام بانڈڈ لیبر لبریشن فرنٹ رکھا جائے جو پیشگی اور جبری مشقت کے خلاف کام کرے گی اور ساتھ ہی اس تنظیم کو رجسٹرڈ کرا دیا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ بی ایل ایل ایف کو ڈویژن کی سطح پر رجسٹرڈ کرایا گیا جو سارے ملک میں باقاعدہ عہدیداروں کے ساتھ کام کرتی رہی اور تادم تحریر بھی بی ایل ایل ایف قانونی طور پر صرف لاہور ڈویژن میں کام کرنے کی مجاز ہے۔

اسی دوران سب سے پہلے بی ایل ایل ایف کے پلیٹ فارم سے یونیسف کو درخواست دی گئی کہ وہ مزدوروں کے بچوں اور خصوصاً بھٹہ مزدوروں کے بچوں کے لیے پرائمری پراجیکٹ میں مدد کرے' ڈاکٹر اسلم خان نے سب سے پہلے ۳۰ پرائمری سکولوں کا پراجیکٹ مکمل کر کے یونیسف کو دیا جو غیر متوقع طور پر من و عن تسلیم کر لیا گیا اور یونیسف نے بہترین فرنیچر کے علاوہ ۳۰ ہزار روپے ماہانہ یعنی فی سکول ایک ہزار روپیہ دینا شروع کر دیا۔ بی ایل ایل ایف کے "اپنا پرائمری سکول" کا ماہانہ خرچہ ۱۲ سو روپے تھا۔ ہزار روپے یونیسف اور ۲ سو روپیہ والدین کمیٹی ادا کرتی۔ یونیسف کے توسط سے شروع کیے گئے سکول پراجیکٹ کے تحت سب سے پہلے لاہور' شیخوپورہ' قصور اور فیروز پور روڈ لاہور (بھٹوں کے نزدیک) سکول شروع کیے گئے اور یونیسف سے امداد تیس سکولوں کی لی جاتی لیکن اصل میں ۲۵ سکول کھولے گئے اور اس طرح احسان اللہ خان نے مذکورہ سکول پراجیکٹ سے ۲۵ ہزار روپیہ ماہانہ کمانا شروع کیے۔ یونیسف نے ان تیس سکولوں کو ایک سال تک امداد دی اس کے بعد نیا پراجیکٹ منظور ہوگیا۔ ۹۲ء کے لیے بی ایل ایل ایف نے

Marfat.com

یونیسف سے ۵۰ سکول مانگے جو منظور کر لیے گئے۔

اس دوران افغانستان میں جنگ کے باعث دنیا بھر سے جمع ہوئی رفاعی تنظیموں نے بی ایل ایل ایف کو اپنی خدمات پیش کیں بلکہ سویڈن کی ایک تنظیم این جی او نے چار مختلف منصوبوں کے لیے اپنی مالی معاونت کی پیشکش کر دی۔ مذکورہ تنظیم نے بھٹہ مزدوروں اور قالین مزدوروں کی صحت، تعلیم، قانونی امداد اور سماجی بہبود کے اخراجات کو اپنے ذمہ لے لیا۔

اس کے لیے سب سے پہلے ڈاکٹر اسلم نے ۴۸ لاکھ روپے کا پروجیکٹ بنایا، جس میں ایک موبائل ڈسپنسری، ایک لیڈی ڈاکٹر کے علاوہ پچاس نئے سکول۔ قانونی امداد کے لیے ملک کے بہترین وکلاء کی خدمات مستعار لینے کا پروجیکٹ اور مزدوروں کی بہبود کے لیے چھوٹی گھریلو صنعتوں اور ڈیری فارم وغیرہ کا منصوبہ شامل تھا۔ یہ پراجیکٹ سویڈش تنظیم نے منظور کر لیا۔ عین اسی وقت احسان اللہ نے مخالفت کر دی اور تنظیم کو کہا کہ وہ صحت میں اتنے زیادہ پیسے نہیں خرچ کر سکتے اور ان کی خواہش ہے کہ اس کی بجائے سکول کھولے جائیں اور بالآخر احسان اللہ اپنی کوشش میں کامیاب ہو گیا اور ۴۸ لاکھ روپیہ "اپنا پرائمری سکول" کی مد میں لے لیا جس کے بارے میں بی ایل ایل ایف کے ناراض کارکنوں کا الزام ہے کہ اس منصوبے میں احسان اللہ نے ۳۵ لاکھ روپیہ کمایا۔ ڈاکٹر اسلم نے بتایا کہ اس کے بعد انہوں نے بی ایل ایل ایف میں دلچسپی لینا چھوڑ دی کیونکہ احسان اللہ مکمل طور پر مزدوروں اور کارپٹ انڈسٹری کو دھوکہ دے رہا تھا۔

اس دوران احسان اللہ گاہے بگاہے اظہار کرتا کہ اس نے اپنی زندگی مزدوروں کے لیے وقف کر دی ہے اور شادی بھی نہیں کر سکا۔ ساتھ ہی اس کی دو شادیاں منظر عام پر آ گئیں۔ چونکہ احسان اللہ خان مبینہ طور پر خود کو بلوچ ظاہر کرتا تھا اور بلوچستان میں بچپن گزارنے کی وجہ سے بلوچی زبان جانتا تھا، اس نے فاطمہ جناح میڈیکل کی طالبہ زہرہ بلوچ سے مراسم قائم کیے اور شادی کر لی۔ بی ایل ایل ایف کا ناراض گروپ احسان اللہ پر اس شادی کے حوالے سے شدید نوعیت کے الزامات لگاتا ہے۔ البتہ زہرہ بلوچ ان دنوں ڈیرہ مراد جمالی بلوچستان میں وومن میڈیکل آفیسر کے طور پر کام کر رہی ہیں۔ زہرہ بلوچ سے احسان اللہ کا ایک بیٹا اور دو بیٹیاں ہیں۔ زاہدہ رسول احسان اللہ کی رشتہ دار ہے اور احسان اللہ نے اس سے شادی کر کے فین روڈ والا گھر اس کے نام کر دیا اس کے علاوہ احسان اللہ نے لارنس روڈ پر ۳۲ لاکھ روپے سے کوٹھی خریدی۔ زاہدہ رسول ان دنوں جیا بھگا میں

Marfat.com

ایک گورنمنٹ سکول میں ٹیچر ہے۔ اس دوران احسان اللہ نے اپنی ساری توجہ قالین بانی کی صنعت کی طرف کر دی اور ان علاقوں میں جہاں قالین بانی کی کھڈیاں زیادہ ہیں بی ایل ایل ایف کے احتجاجی جلسے شروع کر دیے۔ کارپٹ انڈسٹری جو برآمدات سے ۲۵۰ ملین سالانہ کما رہی تھی اس کی برآمدات کم ہونا شروع ہوئیں۔ احسان اللہ نے "پروانہ آزادی" کے بعد دنیا بھر میں ایک کارڈ بانٹ دیا جس پر تحریر تھا "بچوں کا خون مت خریدیں" کارڈ کے کونے میں تحریر تھا کہ قالین کی کھڈیوں پر کام کرنے والے بچوں میں ۵۰ فیصد بالغ ہونے سے پہلے ہی مر جاتے ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ احسان اللہ نے مختلف علاقوں میں افراد کو تعینات کیا کہ وہ قالین بانی کی کھڈیوں اور بھٹہ خشت پر چیک کریں کہ کہاں بچوں سے جبری مشقت لی جا رہی ہے۔ اس سلسلے میں ہارون مسیح صدر بی ایل ایل قصور نے ۱۴ نومبر ۹۳ء کو علاقہ مجسٹریٹ عرفان سندھو کے ہمراہ قصور میں ایک فیکٹری سے ۴ سے ۱۰ سال کی عمر کے ۳۰۰ بچے برآمد کرا دیے۔ اس مقدمہ میں کوئی بھی فرد بچوں کی طرف سے مدعی بننے کے لیے تیار نہ تھا، خود احسان اللہ نے معذرت کر لی تو ہارون مسیح کو سویڈش عورت برٹ میری کلانگ نے اصرار کر کے مدعی بنا دیا۔ ہارون مسیح سے وعدہ کیا گیا کہ اس دوران بی ایل ایف اس کے گھر کا خرچ برداشت کرے گی۔ ہارون مسیح کے بقول وہ مسلسل دس ماہ تک بی ایل ایل ایف کے فریڈم کیمپس واقع لارنس روڈ میں قید رہا اور احسان اللہ کا خیال تھا کہ کارپٹ مافیا اس کو قتل کرا دے گا۔ ۱۷ مارچ ۹۵ء کو ہارون مسیح نے ایک درخواست اخبارات اور دیگر اداروں کو ارسال کی جس کے مطابق احسان اللہ نے تمام بیرونی این جی اوز سے ملنے والی امداد کے اکاؤنٹ اپنے نام کھلوا رکھے ہیں۔ احسان اللہ مزدوروں سے ایک کیس کے پیسے ۱۰۰۰۰ سے ۳۰۰۰۰ روپے تک وصول کرتا ہے۔ بی ایل ایل ایف کے ۲۳۰ سکولوں کا دعویٰ غلط ہے جب کہ پورے ملک میں اس سے آدھے سکول بھی کام نہیں کر رہے۔ احسان اللہ نے شریف پارک میں ۳۵ خاندانوں کو بے گھر کر دیا۔ گزشتہ تین چار برسوں سے اس نے تمام پرانے کارکنوں کو "فارغ" کر دیا۔ بی ایل ایل ایف کو اس نے اپنا ذاتی معاملہ بنا لیا۔ وہ خود تنظیم کا صدر ہے۔ اپنی پہلی بیوی زاہدہ بلوچ کو نائب صدر بنا دیا۔ اپنے بھائی سلیم کو خزانچی اور کئی دوسرے رشتہ داروں کو اہم عہدے سونپ رکھے ہیں۔ اس کا بھائی امان بی ایل ایل ایف انگلینڈ کا صدر ہے۔ ہارون مسیح نے بتایا کہ اس نے فریڈم کیمپس میں قید کے دوران احسان اللہ اور برٹ میری کو قابل اعتراض حالت میں دیکھ

Marfat.com

اس لیے احسان اس کو قتل کرانا چاہتا تھا (واضح رہے کہ برٹ میری ایک سویڈش عورت ۱۸ سال پہلے بھٹہ مزدوروں کی حالت کے متعلق سروے کرنے کے لیے ایک وفد کے ہمراہ پاکستان آئی تھی۔ اس کے بعد برٹ میری نے بی ایل ایل ایف کے لیے کام شروع کر دیا اور تادم تحریر برٹ میری فریڈم کیمپس بی ایل ایل ایف میں موجود ہے۔ برٹ میری کا پورا نام برٹ میری کلانگ ہے اور سویڈن میں گائنا کالو جسٹ ہے)۔

۱۶ اپریل کو اقبال مسیح قتل ہوا۔ ۱۷ اپریل کو احسان اللہ نے اسلام آباد میں سندھ کے پندرہ خاندانوں کے حوالے سے پیرپگاڑہ کے خلاف پریس کانفرنس کی اور سیدھا اقبال مسیح کے گھر پہنچا۔ اس کی ویڈیو فلمیں بنوائیں اور اگلے دن جنیوا کے لیے روانہ ہوگیا۔ وہاں احسان اللہ نے اقبال مسیح کے قتل میں کارپٹ انڈسٹری کو ذمہ دار ٹھہرایا اور بیرونی ممالک کی ٹیموں نے پاکستان آکر اس قتل کیس کی تفتیش کی اور اقبال مسیح قتل کیس کو غلط رنگ دے کر ذاتی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ واضح رہے کہ احسان اللہ سویڈن' جرمنی' سوئٹزلینڈ اور کئی دوسرے ممالک میں درجنوں پاکستانیوں کو' جو بی ایل ایل ایف سے وابستہ تھے اور اس کے قریبی رشتہ دار تھے سیاسی پناہ دلوا چکا ہے۔

Marfat.com

سیاست اور جرم کا گڑھ "واھنڈو"

پاکستان میں امن و امان کی صورت حال بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے اور اس ابتری کا سب سے ننگا اظہار خون انسان کی شکل میں سامنے آ رہا ہے۔ کوئی سا اخبار اٹھا کر دیکھ لیں وحشیانہ قتل و خونریزی کی لرزہ خیز داستانوں کا تسلسل اس حوالے سے ایک بھیانک منظر نامہ پیش کرتا ہے اور یہ حقیقت چیخ چیخ کر اپنا آپ منواتی نظر آتی ہے کہ کسی غیر معمولی صورت حال کے نہ ہوتے ہوئے بھی مردم کشی کے اعداد و شمار کی رو سے ہمارا ریکارڈ نیم مہذب دور کے کسی معاشرہ سے بہتر نہیں۔

اجتماعیت انسانوں کا ایک فطری اور مثبت وصف ہے اور معاشرے کی وسیع تر ترقی اسی جذبے کی رہین منت ہے لیکن ہمارے ہاں اجتماعیت کا ایک معکوس تصور ابھرا ہے اور اس نے مجرمانہ جتھہ بندی کی صورت اختیار کر لی ہے' جس نے اجتماعی آبرو ریزی' اجتماعی قتل اور اجتماعی فراڈ جیسے جرائم کو نئے معنی پہنائے ہیں۔

اجتماعی قتل کے واقعات یوں تو گاہے بگاہے مختلف جگہوں پر ہوتے ہی رہتے ہیں لیکن بہت سے قارئین کے لیے یہ اطلاع باعث حیرت ہوگی کہ انتظامی طور پر نسبتاً آسان صوبے پنجاب کے دارالحکومت سے صرف تیس پینتیس کلومیٹر دور ایک ایسا علاقہ بھی موجود ہے جسے جتھہ بند قاتلوں کی سنگین سرگرمیوں کے حوالے سے پنجاب کا علاقہ غیر کہا جاتا ہے۔

مرید کے نارووال روڈ پر کالی صوبہ 'مانگا پل' قلعہ کالر والا مالو کے اور لکھڑ والی جیسے دیہات آتے ہیں یہاں پہلے گوجرانوالہ' سیالکوٹ اور شیخوپورہ کے اضلاع آپ میں ملتے تھے۔ لیکن نارووال کے علیحدہ ضلع بن جانے سے اب چار اضلاع کی سرحدیں یہاں ملتی ہیں۔ مانگا پل کا سٹاپ مشہور نہر بی آر بی پر واقع ہے۔ مانگا پل سے نہر کے کنارے کنارے

Marfat.com

تقریباً دو میل کے فاصلے پر موضع جاتر یکے واقع ہے۔ یہ پورا گاؤں راجپوت برادری کا ہے۔ تقسیم کے بعد سے لوگ سکھ چین سے رہ رہے تھے کہ اچانک اپریل ۱۹۹۰ء میں یہ گاؤں قتل و غارت کا میدان بن گیا۔

مانگا پل سے شمال کی طرف تین میل کے فاصلے پر اکو چک نام کا ایک گاؤں واقع ہے اور یہیں سے جنوب مغرب کی سمت تقریباً دو میل پر سکھانہ باجوا نامی گاؤں ہے۔ سکھانہ باجوا میں قتل و غارت گری کا بازار ۱۹۸۹ء میں گرم ہوا۔ اس گاؤں کے دو گروپوں محمد الٰہی باجوا گروپ اور غلام جیلانی گروپ کے درمیان چودھراہٹ کے مسئلے پر معمولی تو تکار ہوتی رہتی تھی پھر اچانک ایک واقعہ نے قتل در قتل کا ایک سلسلہ چھیڑ دیا۔ محمد الٰہی گروپ نے گوجرانوالہ' شیخوپورہ روڈ پر واقع گاؤں تتلے عالی کے بدنام اجرتی قاتل بشیر عرف بشیرے بھلار کے ذریعے دھوکے سے غلام جیلانی گروپ کے ایک حمایتی گوگی تیلی کو اپنے ڈیرے پر بلوا کر قتل کر دیا۔ قتل کے بعد محمد الٰہی گروپ نے گوگی کی لاش کے ٹکڑے بی آر بی میں بہا دیئے۔ گوگی کا قصور یہ تھا کہ وہ غلام جیلانی گروپ کے ساتھ میل جول رکھتا تھا۔

دسمبر ۸۹ء میں ایک جھگڑے کے دوران محمد الٰہی گروپ نے غلام جیلانی گروپ کا ایک آدمی قتل کر دیا۔ مقامی تھانے میں مقدمہ درج ہوا۔ جنوری ۹۰ء میں ایک دن محمد الٰہی گروپ کے آدمی مذکورہ مقدمہ قتل کی تاریخ بھگتنے گوجرانوالہ جا رہے تھے ان میں محمد الٰہی بھی شامل تھا۔ اس کے ہمراہ چار مسلح ساتھی اور موضع سکھانہ باجوا ایک ماچھی بھی تھا جو گوجرانوالہ جانے کے لیے جیپ پر سوار ہو گیا تھا۔ جب یہ جیپ میانوالی بنگلہ پہنچی تو محمد الٰہی نے سگریٹ لینے کے لیے گاڑی روکی' اسی اثناء میں غلام جیلانی گروپ کے جدید اسلحہ سے لیس آدمیوں نے جیپ پر اندھا دھند فائرنگ کر دی۔ جیپ میں سوار چھ کے چھ افراد موقع پر ہلاک ہو گئے۔

انہی دنوں ساتھ والے گاؤں جاتر یکے میں دو گروپوں جعفر گروپ اور گلو گروپ کے درمیان پانی کے تنازعہ پر خون آشام لڑائی ہوئی۔ اس لڑائی میں جعفر گروپ نے گلو گروپ کے تین آدمیوں کو قتل کر دیا۔ واردات کے بعد جعفر گروپ اپنے گاؤں سے بھاگ کر سکھانہ باجوا کے محمد الٰہی گروپ سے جا ملا۔ جعفر گروپ کے اس ملاپ سے محمد الٰہی گروپ مزید مضبوط ہو گیا اور انہوں نے غلام جیلانی گروپ کو گاؤں چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ غلام جیلانی گروپ کے لوگ اپنے رشتہ داروں کے پاس موضع مدریانوالہ چلے گئے مدریانوالہ کے یہ لوگ فیروزوالہ ضلع گوجرانوالہ سے تعلق رکھنے والے ایک سابقہ وفاقی وزیر بریگیڈیئر

Marfat.com

اصغر کے رشتہ دار ہیں اور انہیں موصوف کی حمایت حاصل ہے۔

غلام جیلانی گروپ کے گاؤں چھوڑنے کے بعد محمد الٰہی گروپ نے ان کے گھروں کو لوٹ کر آگ لگا دی۔ اس دوران سکھانہ باجوا کا مڈل سکول اور ہسپتال بند ہوگیا کیونکہ وہاں محمد الٰہی گروپ نے بہت سارے اشتہاری مفرور ملزموں کو پناہ دے دی جنھوں نے دونوں عمارتوں کے کمروں اور صحن میں مورچے قائم کر لیے۔

گاؤں میں آنے والے تمام راستوں پر بورڈ لکھ کر لگا دیے گئے کہ زبردست دشمنی کی وجہ سے گاؤں کی حدود میں داخل ہونے والے کسی بھی انجان آدمی کو گولی ماری جا سکتی ہے۔ پورے گاؤں کے لوگ اپنے گھربار چھوڑ کر جان بچانے کے لیے رشتہ داروں کے ہاں چلے گئے۔ اس دوران جیلانی گروپ نے محمد الٰہی کے بھائی ماسٹر منظور کو قتل کر دیا۔

جیلانی پارٹی زیادہ تر رات کو گاؤں پر ہلہ بولتی۔ اسی طرح محمد الٰہی گروپ کے آدمیوں نے مدریانوالہ میں حملہ کر کے غلام جیلانی گروپ کے دو افراد کو قتل کر دیا۔ مقتول مذکورہ سابق وفاقی وزیر کے عزیز تھے۔

جاتر کیے میں جعفر پارٹی کے گاؤں سے بھاگ جانے کے بعد گلو گروپ نے کرائے کے آدمی لا کر بٹھا دیے۔ انہوں نے مخالفین کے گھر جلا دیے اور ان کے کنوؤں، چارہ کاٹنے کے ٹوکوں، ٹیوب ویلوں اور نلکوں کا سارا سامان اکھاڑ کر سکریپ میں بیچ دیا اور مخالف پارٹی کے سارے مال مویشی ذبح کر کے کرائے پر لائے قاتلوں کو کھلا دیے اور گندم کی پکی ہوئی فصل بھی کاٹ کر بیچ دی۔ اس گروپ کو اس وقت کے مسلم لیگی وفاقی وزیر رانا نذیر احمد اور ایم -این -اے رانا تنویر حسین کی حمایت حاصل تھی۔ اسی وجہ سے مقامی پولیس ان لوگوں پر ہاتھ ڈالنے سے قاصر تھی۔ اس گروپ کے پاس کلاشنکوفیں، مشین گنیں، راکٹ لانچرز، دستی بم، جی تھری رائفلیں اور دوسرا جدید اسلحہ تھا۔

جب جعفر گروپ کو علم ہوا کہ ان کے گھر لوٹ لیے گئے ہیں تو اس نے تین چار مرتبہ جاتر کیے میں زبردست فائرنگ کی جس سے کئی افراد ہلاک ہوگئے۔ اب قتل در قتل کے واقعات اتنے تسلسل سے رونما ہونے لگے کہ ان کا شمار مشکل ہوگیا۔ وحشت و بربریت کا یہ شیطانی چکر پھیلتا گیا اور پورا علاقہ انتظامی طور پر ایک ناسور کی شکل اختیار کر گیا۔ انتہا درجے کی بدامنی اور لاقانونیت نے علاقے کے تمام مکینوں کے ذہنوں پر خوف و ہراس کے انمٹ نقوش ثبت کیے۔ اس طرح کی خونریزی میں حملہ آوروں کا مقصد چونکہ دشمن کے خاتمہ کے ساتھ ساتھ اپنی دہشت کی دھاک بٹھانا بھی ہوتا ہے اس لیے مقتولین کی لاشوں

Marfat.com

کے ٹکڑے کرنا، تیل چھڑک کر ان ٹکڑوں کو آگ لگانا اور پھر شعلوں کی روشنی میں وحشت کا ناچ درندگی کے اس عمل کا لازمی حصہ سمجھا جاتا ہے۔

سفاکی کے اس پس منظر میں ایک اندازے کے مطابق ستر انسانوں کی ہلاکت اور درجنوں گھروں کی تاراجی نے عمومی طور پر پورے علاقے کی فضا میں ایک مردنی گھول دی۔ بالخصوص ان قاتل درندوں کی کچھار بننے والی بستیوں میں خوشی عملاً ایک غیر فطری عنصر بن کر رہ گئی۔ موضع سکھانہ باجوا کی ایک عورت شہناز بی بی کے گھر اس کی بیٹی کی بارات آئی تو اس نے گاؤں سے دور ایک خیمہ گاڑا اور دو گھنٹے کے اندر اندر تمام کاروائی مکمل کر کے اپنی بیٹی بارات کے ساتھ روانہ کر دی۔

موت اور دہشت کی اس حکمرانی کے تمام عرصہ کے دوران قانون نام کی شے عملاً مفلوج رہی بلکہ علاقے میں تعینات پولیس اہلکار مجرموں کے کارندوں کا کام بھی کرتے رہے ہیں۔ اس بظاہر ناقابل یقین صورت حال کے بارے میں مسلسل اطلاعات موصول ہونے پر ۱۹۹۲ء میں اس وقت کے گورنر پنجاب میاں محمد اظہر علاقے کے کچھ حصوں کا دورہ کیا اور قانون کی عملداری بحال کرنے کے عزم کے ساتھ انہوں نے کچھ اقدامات کیے جن میں بلٹ پروف جیکٹوں میں ملبوس اور جدید اسلحہ سے لیس تیرہ سو پولیس کمانڈوز کی اس آفت زدہ علاقے میں تعیناتی بھی شامل تھی۔ ان اقدامات سے صورت حال کی سنگینی میں کچھ کمی واقع ہوئی اور ابتدائی طور پر کچھ مجرم اپنے جنگی اسلحہ سمیت گرفتار بھی ہوئے۔ تاہم اس وقت کے انچارج تھانہ واہنڈو نے حق نمک ادا کیا اور مخبری کا فریضہ انجام دیتے ہوئے مجرموں کی روپوشی میں مدد دیتا رہا۔

ایک مختصر دورانیہ کے جزوی تعطل کے بعد مکمل لاقانونیت اور دہشت و آسیب زدگی کے فضا دوبارہ اپنے نقطہ عروج پر پہنچ چکی ہے۔ دراصل اسمبلیوں کی زینت بننے والے ہمارے عوامی نمائندوں نے ان جھتہ بند قاتلوں، ڈاکوؤں اور اغوا کاروں کی ہمہ گیر ضرورت و اہمیت تسلیم کر لی ہے۔ ویسے تو یہ حقیقت ہماری قومی اور مقامی سیاست کے ابواب میں ایک کھلے راز کی حیثیت رکھتی ہے لیکن اس علاقے میں اس کی اطلاق پذیری کی شرح صد فیصد ہے۔

کچھ لو اور دو کے زریں اصول پر عمل کرتے ہوئے ہمارے عوامی نمائندے ان عناصر کو تحفظ اور سرپرستی فراہم کرتے ہیں اور صلے میں سیاست بازی کے لیے درکار اشیاء پاتے ہیں۔ اسی حسن معاملت کی خوبی ہے کہ قتل اور لوٹ مار کی ہر سنگین واردات کے بعد

ان مجرموں کا "کھرا" ہمیشہ موجودہ اور گزشتہ ادوار حکومت میں برسراقتدار رہنے والوں کی کوٹھیوں اور حویلیوں تک جاتا ہے۔

تحفظ اور تعیش کے قلعوں میں بیٹھ کر قانون کی حکمرانی کا زبانی جمع خرچ کرنے والوں کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ علاقہ ایک مرتبہ پھر بھیانک جرائم کے مرتکب عناصر کی آماج گاہ بن چکا ہے۔ کوٹلی کے بارے میں خاں میں تیرہ افراد کے خون سے ہولی کھیلنے والے قاتل کچھ عرصہ پہلے گوجرانوالہ جیل سے فرار ہونے والے مجرم اور دیگر بہت سے اشتہاری موضع سکھانہ باجوا میں جمع ہو چکے ہیں اور خاندانی دشمنی کے نام پر محمد الٰہی گروپ اور غلام جیلانی گروپ کے بیسیوں جنگ باز ایک دوسرے کے مقابل مورچہ بند ہیں۔ جرائم پیشہ افراد کی بھاری موجودگی کے سبب علاقے میں سنگین وارداتوں کی شرح میں بہت اضافہ ہو چکا ہے۔ نارووال مریدے روڈ پر چلنے والی بسیں دھڑلے سے لوٹی جا رہی ہیں اور اغوا برائے تاوان کی وارداتیں بھی ہو رہی ہیں۔

ان سب وارداتوں کا ایک مقصد مخالفین کے قتل و غارت کا بازار گرم کرنے کے لیے مالی وسائل کی فراہمی بھی ہی۔ اس کے ساتھ ساتھ مجرموں کے ایک گروپ نے پسرور شہر میں دو نوجوان لڑکیوں کو اغوا کرنے کی کوشش بھی کی لیکن بر وقت لوگوں کی مداخلت پر وہ اندھا دھند فائرنگ کرتے ہوئے فرار ہو گئے۔

مریدکے نارووال روڈ جس پر ساری رات ٹریفک چلتی تھی اب سرشام سنسان ہو جاتی ہے اور لاہور' شکرگڑھ کے درمیان شام ہوتے ہی ٹریفک براستہ گوجرانوالہ' پسرور' نارووال چلنا شروع ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے اہل علاقہ کو شدید دشواری کا سامنا ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا ہمارے ارباب بست و کشاد کو اس خوف کی چبھن کبھی محسوس نہیں ہوئی کہ لاقانونیت کے اس جزیرے اور اس طرح کے دیگر "جرمستانوں" کے حدیں پھیل سکتی ہیں اور جدال و قتال کے آتش فشاں کے دہانے پر کھڑا ہمارا معاشرہ بھیانک تباہی سے دو چار ہو سکتا ہے۔

Marfat.com

گوردوارے کی ہزاروں ایکڑ اراضی سیاستدانوں کے نرغے میں

"مجھے ۱۹۲۵ء کے گوردوارہ ایکٹ کے تحت شرومنی پر بندھک کمیٹی امرتسر نے ۱۹۶۵ء میں گوردوارہ جنم استھان ننکانہ صاحب میں بطور گیانی (ہیڈ گرنتھی) مقرر کیا تھا۔ تقرری کے تقریباً دو سال بعد میرا ہندوستانی پاسپورٹ کہیں کھو گیا۔ بھارتی حکومت کو کئی درخواستیں ارسال کیں، لیکن نیا پاسپورٹ نہ بن سکا اور نہ ہی میرے اتنے وسائل ہیں کہ پاکستانی شہریت لے کر اپنا پاسپورٹ حاصل کر سکوں۔ اسی وجہ سے گزشتہ ستائیس سال سے میں اپنے خاندان کو نہیں مل سکا ہوں"۔

"گوردوارہ پر بندھک کمیٹی دو تین مہینے بعد تھوڑی سے رقم بطور خرچ بھیج دیتی ہے، جس سے میں دو وقت کی روٹی بھی نہیں کھا سکتا۔ جس دن گوردوارے میں لنگر پرشاد نہ ہو تو یہاں آباد ایک سکھ مجھے کھانا بھیج دیتا ہے"۔

ان باتوں کے دوران میں اس بیاسی سالہ بوڑھے گیانی پرتاپ سنگھ کی آنکھوں میں یہ کڑا سوال بار بار پڑھتا رہا کہ "متروکہ وقف املاک بورڈ کے زیر انتظام گوردوارہ جنم استھان کی انیس (۱۹) ہزار ایکڑ زرعی اراضی، جو اٹھائیس سو خاندانوں کو پال رہی ہے اور حکومتی خزانے میں بھی پتہ کی رقم کے طور پر ہر سال ۳۱ لاکھ ۳۵ ہزار روپیہ ڈال دیتی ہے۔ اس بے سہارا گیانی اور سیوا داروں کے غربت و افلاس کے مارے چار خاندانوں کو بہتر کھانا اور دوسری سہولیات زندگی کیوں نہیں مہیا کر سکتی؟"

اس بھیانک سوال کا جواب متروکہ وقف املاک بورڈ ننکانہ صاحب کے اسسٹنٹ ایڈمنسٹریٹر نے کچھ یوں دیا۔ "یہ ٹھیک ٹھاک ہیں جی۔ انہیں روٹی مل رہی ہے اور ان کے لئے یہی کافی ہے کہ انہیں یہاں کوئی کچھ کہتا نہیں"۔

Marfat.com

ننکانہ صاحب، سکھ مذہب کے بانی بابا گورونانک کا جنم استھان (جائے پیدائش) ہے۔
یہاں بابا گورونانک کی مذہبی و دنیاوی مصروفیات کی یادگار کے طور پر سات گوردوارے ہیں۔
(۱) گردوارہ جنم استھان (۲) گوردوارہ پٹی صاحب (۳) گوردوارہ تمبو صاحب (۴) گوردوارہ مال جی صاحب (۵) گوردوارہ کیارا صاحب (۶) گوردوارہ پنجی چھٹی پادشاہی صاحب (۷) گوردوارہ بال لیلا صاحب۔ جب کہ گورونانک کی زندگی کے ایک اہم موڑ کی یادگار کے طور پر ایک گوردوارہ شیخوپورہ میں "گوردوارہ سچا سودا" کے نام سے موجود ہے۔

گوردوارہ جنم استھان جو کہ تمام گوردواروں کا مرکز ہے، میں محکمہ اوقاف کی طرف سے سردار ہر دیال سنگھ کو سیوادار مقرر کیا گیا ہے۔ دوسرے گوردواروں کے لیے تین سیوادار ایشر سنگھ، کاہن سنگھ اور رویل سنگھ رکھے گئے ہیں۔

ہر سال ۱۸ نومبر کو گوردوارہ جنم استھان میں بابا گورونانک کا جنم دن بنایا جاتا ہے۔
اس موقع پر ہزاروں سکھ یاتری بیرونی ممالک خصوصاً بھارت سے یہاں آتے ہیں۔

ننکانہ شہر میں پچاس کے قریب سکھ گھرانے آباد ہیں جن کی آبادی تقریباً تین سو نفوس پر مشتمل ہے۔ زیادہ تر سکھ پشاور اور کوہاٹ سے نقل مکانی کر کے یہاں آباد ہوئے ہیں۔ لیکن اب حکومت نے ننکانہ صاحب میں سکھوں کی مزید آباد کاری پر پابندی عائد کر دی ہے۔

یہاں آباد سکھوں کی اکثریت معاشی طور پر بہت پسماندہ ہے، زیادہ تر دیہاڑی دار ہیں جو کسمپرسی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ جب کہ چند ایک متوسط سکھوں نے شہر میں کریانہ سٹور بھی کھول رکھے ہیں۔

روزمرہ خوردونوش کی اشیاء مثلاً پھل، سبزی وغیرہ کا کاروبار تو یہ کر نہیں سکتے۔
کیونکہ چند سکھ گھرانوں کے علاوہ کوئی دوسرا ان سے یہ اشیاء نہیں خریدے گا۔

جہاں تک سرکاری ملازمت کا تعلق ہے تو مجموعی بے روزگاری کے اس دور میں کسی سکھ کو ملازمت ملنا تقریباً ناممکن ہے۔ ننکانہ صاحب میں متروکہ وقف املاک بورڈ کے ساٹھ ملازمین ہیں جن میں سکھوں کی تعداد صرف چار ہے۔ سیوادار کی حیثیت سے ملازم یہی چاروں سکھ پندرہ سو سے دو ہزار روپے تک ماہوار تنخواہ پاتے ہیں۔

ان چاروں سیواداروں کی گوردوارہ پٹی صاحب میں سرکاری رہائش کے طور پر ایک ایک کمرہ دیا گیا ہے۔ میں جب گوردوارہ پٹی صاحب پہنچا تو مجھے اپنی رہائش گاہ دکھانے کے

Marfat.com

لیے سیوادار ہردیال سنگھ کو اپنا پورا خاندان کمرے سے باہر دھکیلنا پڑا۔ کمرہ کی حالت بہت خستہ تھی، جس میں گوردوارہ جنم استھان کا سیوادار ہردیال سنگھ انتہائی عسرت کے دن گزار رہا ہے۔ اسی طرح دوسرے تین سیواداروں رویل سنگھ، کاہن سنگھ اور ایشور سنگھ کے خاندان بھی گوردوارہ پٹی صاحب میں "حوالاتی" کی سی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ جب کہ گوردوارہ جنم استھان میں پانچ سو کے قریب کمرے سارا سال خالی پڑے رہتے ہیں۔ لیکن ان کمروں میں رہنے کی اجازت نہیں۔

سردار ہردیال سنگھ سیوادار گوردوارہ جنم استھان نے بتایا کہ وہ تقریباً بائیس سال سے ننکانہ صاحب میں رہائش پذیر ہے۔ حکومت سیوادار کی حیثیت سے تقریباً دو ہزار روپے ماہانہ تنخواہ دیتی ہے، جس سے میرے خاندان کا گزارہ بہت مشکل سے ہوتا ہے۔ سیوادار کی حیثیت سے میرے فرائض میں میلے کے دنوں میں یاتریوں کے مسائل حل کرنا، لنگر وغیرہ کی دیکھ بھال اور گوردوارے کے مرمت طلب حصوں کی محکمہ اوقاف کے افسروں کو نشاندہی کرنا ہے۔

میں نے دیکھا کہ گوردوارے کی حدود میں داخل ہوتے وقت سکھ، جنم استھان کی تعظیم کے طور پر دہلیز پر سجدہ کرتے ہیں اور اگر وہ جنم استھان کی دیوار کے ساتھ چل رہے ہوں تو گاہے بگاہے دیواروں کو چومتے چلے جاتے تھے۔ لیکن جنم استھان کی تقریباً پوری مغربی دیوار کے ساتھ لوگوں نے گوبر کے اوپلے تھاپ رکھے تھے۔

جب اس سلسلے میں گیانی پرتاپ سنگھ سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا "دیکھیں جی ہم جنم استھان کی خاک کا بھی احترام کرتے ہیں لیکن کچھ لوگوں نے اس کی پوتر دیواروں کے ساتھ جانوروں کا گند تھوپ رکھا ہے۔ کوئی سچا سکھ یہ سب کچھ کس طرح برداشت کر سکتا ہے۔ لیکن ہم اس کی مذمت بھی نہیں کر سکتے"۔

گیانی پرتاپ سنگھ نے بتایا کہ جہاں بھی ہمارا گوردوارہ ہوگا آپ دیکھیں گے کہ اس کے چار دروازے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ گوردوارہ چاروں مذاہب کے لیے ہر وقت کھلا ہے، ہر کوئی بلا روک ٹوک یہاں آ سکتا ہے، لیکن یہ لازمی ہے کہ آنے والے کے پاس کوئی نشہ آور چیز، تمباکو وغیرہ نہ ہو اور نہ ہی وہ ننگے سر ہو۔

ایک کریانہ سٹور کے مالک کرپا سنگھ نے بتایا کہ یہاں آباد سکھوں کے پاس چونکہ کوئی مستقل کاروبار نہیں اس لیے یہاں کے کچھ سکھوں نے پاکستان کے دوسرے شہروں سے سامان وغیرہ لاکر فروخت کرنا شروع کیا تھا۔ ۱۵ اپریل کو حسن ابدال سے یاتریوں کو لے

کر ننکانہ صاحب آنے والی ریل گاڑی پر چھاپہ مار کر تین سکھوں کو سامان سمیت گرفتار کر لیا گیا۔ ان پر الزام تھا کہ وہ پشاور سے سامان سمگل کر کے لا رہے ہیں۔ ان پر کسٹم ایکٹ کی دفعہ ۱۵۶ کے تحت مقدمہ چلایا گیا۔ حالانکہ اس سامان میں کوئی بھی چیز ایسی نہ تھی جس پر مندرجہ بالا دفعہ کا اطلاق ہو سکے۔ تھانہ سٹی ننکانہ صاحب سے رابطہ کیا گیا تو وہاں پر موجود سب انسپکٹر نے بتایا کہ ہمیں مخبری ہوئی تھی اس لیے ہم نے چھاپہ مار کر سامان قبضہ میں لے لیا اور ملزموں پر مقدمہ درج کر کے انہیں حوالات بھیج دیا گیا۔

پچھلے دنوں ملزمان نے اس مقبوضہ سامان کی رسیدیں پشاور سے منگوا دیں جو تصدیق کے بعد درست پائی گئیں۔ اور اب کسٹم سے بھی ملزمان کی ضمانتیں ہو چکی ہیں۔ میرے اس سوال پر کہ پٹھان روزانہ گلی محلوں میں لوگوں کے دروازوں پر باڑہ مارکیٹ لیے پھرتے ہیں آپ نے کبھی انہیں گرفتار کیا' تو سب انسپکٹر نے کہا "دیکھیں جی ہمیں مخبری ہوئی تھی اور پھر یہ سکھ ہیں کچھ بھی لا سکتے ہیں"۔

۱۵ اپریل کے دو عینی شاہدوں کے مطابق' چھاپے کے دوران پکڑی جانے والی اشیاء میں سے آدھی غائب کر دی گئیں ہیں۔ جب کہ پولیس کے گودام میں اب صرف چند استریاں اور کچھ تھان کپڑا رہ گیا ہے۔

سامان کی بابت پوچھے گئے سوال کا جواب دیتے ہوئے سب انسپکٹر نے کہا کہ جتنا مال چھاپے میں برآمد ہوا تھا اتنا ہی موجود ہے لیکن ہم کسی کو دکھا نہیں سکتے۔

گوردوارہ جنم استھان کے صدر دروازے کے بالکل سامنے متروکہ وقف املاک بورڈ کے دفاتر ہیں۔ یہاں اس وقت محکمہ اوقاف کے ساٹھ ملازمین ہیں۔ ان میں دو چوکیدار اور پندرہ صفائی کرنے والے ہیں جبکہ باقی ملازمین گوردوارے کی زرعی اراضی کے امور سے متعلق ہیں۔ متروکہ وقف املاک بورڈ ننکانہ صاحب کے اسسٹنٹ ایڈمنسٹریٹر حاجی قادر بخش کھیڑا نے بتایا کہ گوردوارے کی تقریباً ۷ سو ۶۰ مربع اراضی بورڈ نے ۲۸ سو مزارعین کو سالانہ پٹہ پر دے رکھی ہے۔

بورڈ مزارعین سے ۱۶۵ فی ایکڑ کے حساب سے سالانہ پٹہ وصول کرتا ہے۔ پٹہ کی صورت میں یہ وصول شدہ رقم اوقاف کے خزانے میں جمع ہوتی ہے جس سے تقریباً تین لاکھ روپیہ (بمعہ لنگر کا خرچ) سالانہ گوردوارے پر خرچ ہوتا ہے۔

گوردوارہ جنم استھان میں یاتریوں کی رہائش کے لیے مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ۱۷۸ سال قبل ۴۷۵ کمرے بنوائے تھے' جن کی حالت بہت خستہ ہو چکی ہے۔ اور سال بہ سال

Marfat.com

یاتریوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے لیے یہ کمرے ناکافی ہو چکے ہیں۔ اس طرح ہر سال ہزاروں یاتریوں کو کھلے آسمان اور برآمدوں میں سونا پڑتا ہے۔

دنیا کا کوئی بھی قانون کسی مذہب کی عبادت گاہ کی بے حرمتی کی اجازت نہیں دیتا۔ لیکن ننکانہ صاحب میں سکھوں کی سب سے مقدس عبادت گاہ کی دیواروں کے ساتھ لوگوں نے گوبر کے اوپلے تھاپ رکھے ہیں۔ حکومت کو اس زیادتی کا فوراً نوٹس لینا چاہئے اور اس کے ساتھ ساتھ پاکستان میں واقع سکھ مذہب کی سب سے بڑی عبادت گاہ میں تعینات مذہبی رہنما کی کفالت کی ذمہ داری بھی حکوت پر عائد ہوتی ہے۔ اتنی بڑی منافع بخش جائیداد، جو لاکھوں روپیہ حکومتی خزانوں کو بھیجتی ہے، کے مالک گوردوارے کا متولی ایک تاریک اور بوسیدہ کمرے میں رہ رہا ہے۔ اور ستم کی بات یہ ہے کہ گیانی پرتاپ سنگھ جہاں غسل اور پیشاب کرتا ہے وہی کمرہ اس کا باورچی خانہ بھی ہے۔

ملک کے دوسرے شہروں میں سے روزمرہ استعمال کا سامان خرید کر لانا اور لے جانا خلاف قانون نہیں، مگر ان غریب سکھ تاجروں کو یہ کاروبار کرنے کی پاداش میں کئی دنوں تک جیل کی ہوا کھانا پڑی اور پھر قبضے میں لیا گیا سامان بھی گنوا بیٹھے۔

جنم استھان کی ۷ سو ۶۰ مربع اراضی میں سے ۲ سو مربع اراضی پر شیخوپورہ کے طاقتور سیاستدانوں نے قبضہ کر رکھا ہے اور وہ ۱۶۵ روپے سالانہ پٹہ بھی ادا نہیں کرتے جبکہ ۵۰ مربع اراضی پر ننکانہ صاحب میں رہائشی کالونیاں بن گئی ہیں۔ محکمہ متروکہ وقف املاک بورڈ نہ تو سیاستدانوں سے گوردوارے کی ملکیتی زمین چھڑا سکتا ہے اور نہ ہی ان سے پٹہ کی بہت معمولی رقم لے سکتا ہے۔

Marfat.com

منظور وٹو اور کروڑوں روپے کی کرپشن

پنجاب کے سابق وزیر اعلیٰ میاں منظور وٹو کی کرپشن اور بدعنوانیوں کے بارے میں سب سے پہلا ثبوت ہائی کورٹ کے جسٹس ٹوانہ کے اس دلیرانہ فیصلہ سے ملتا ہے' جس میں فاضل جج نے وٹو اور ان کے ساتھی ارکان اسمبلی کے بارے میں صوبائی حکومت کو ہدایت کی تھی کہ وہ ان کے خلاف فوجداری مقدمات قائم کرے۔ اگرچہ بعد میں اپیلنٹ بنچ نے اس فیصلہ اور حکم کو معطل کرنے کا فیصلہ دے دیا لیکن میاں منظور وٹو کی بدعنوانیوں کے بارے میں ایک طرح سے "مکمل اعتراف" کیا گیا تھا۔

میاں منظور وٹو کے ذہن میں اقتدار کا قدیم دیہی تصور قائم تھا اور وہ یہ تھا کہ "تھانہ کچہری" کے افسران کو اپنے معتبر ساتھیوں میں شامل کیا جائے اور وسیع بدعنوانیوں کے ذریعے اتنا پیسہ بنا لیا جائے کہ مستقبل کی ممکنہ شکست کا افسوس نہ ہو۔ میاں منظور وٹو کے لیے مثالی نمونہ میاں نواز شریف اور ان کا ذاتی ہدایات کے ذریعے حکمرانی کرنے کا انداز تھا۔ جب میاں منظور وٹو سپیکر پنجاب اسمبلی تھے تو انہوں نے اسمبلی سیکرٹریٹ کو وزیر اعلیٰ آفس سے علیحدہ کر دیا اور پھر اس میں اوکاڑہ سے تعلق رکھنے والے اپنے رشتہ دار اور دوست بھرتی کر دیئے اور ایسے لوگوں کو بلاجواز ترقیاں دیں جن کے بارے میں انہیں خیال تھا کہ وہ ان کے لیے کام کریں گے۔ اس کی واضح مثال مسٹر حبیب اللہ تھے' جنہیں وٹو نے تمام قوانین کو رد کرتے ہوئے پنجاب اسمبلی میں سیکرٹری بنایا اور جس نے بعد میں نواز شریف کی خاطر وٹو کو دھوکہ دیا۔ میاں منظور وٹو پوری طرح نواز شریف کے نقش قدم پر چلے اور انہوں نے نواز شریف کی طرح وزیر اعلیٰ "شاہی فرامین" کے ذریعے صوبے کے انتظامی ڈھانچہ کو تباہ کر دیا۔

ایک شہری پس منظر کے حامل میاں نواز شریف کی بدولت اگر پنجاب ۱۸۵۷ء سے

Marfat.com

پہلے کی طرز حکومت کی طرف مراجعت کر گیا تھا' تو میاں منظور وٹو کی مراجعت ان کی دیہی ذہنیت کے سبب بہت زیادہ غیر مہذب تھی۔ وٹو کا اپنے خاندان میں بھڑکیلی شادیاں کرنے پر اصرار بدترین مشرقی آمریت کی طرف واپسی تھی۔

میاں منظور وٹو پنجابی سیاست کی مخصوص حکمت عمل کے ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ قسمت کے دھنی اور اپنے عزیز و اقارب کی حد تک ہاتھ کے بے حد غنی واقع ہوئے۔ ویسے تو میاں نواز شریف نے بھی سیاست کے ذریعے "خودنوازی" کی ایک انوکھی تاریخ قائم کی تھی اور ان سے پیشتر بھی یہ سلسلہ مملکت خداداد میں کسی نہ کسی شکل میں چلتا ہی رہا ہے' لیکن سابقہ وزیراعلیٰ میاں منظور وٹو نے اپنی گھریلو تقریبات کے شایان شان انعقاد کے لیے ریاستی وسائل کے بھرپور استعمال کے ذریعے شاہانہ عیش کوشی کی کتاب میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔

۱۹۹۴ء میں سرانجام پانے والی "دختر اعلیٰ" کی شادی کی تقریبات اپنی چکاچوند اور ان پر اٹھنے والے اخراجات اپنے حجم کے اعتبار سے ہوش ربا تھے ہی لیکن ۱۹۹۵ء میں منعقد ہونے والی منظور وٹو کے صاحبزادے معظم وٹو کی شادی ان حوالوں سے اور بھی زیادہ "تاریخ ساز" واقع ہوئی۔

میاں منظور وٹو کے فرزند ارجمند معظم وٹو کی شادی خانہ آبادی لاہور ترقیاتی ادارہ کے وائس چیئرمین جاوید عمر خان کی صاحبزادی سے انجام پائی۔ دلہن کے والد جاوید عمر صدر مملکت فاروق احمد لغاری کے قریبی عزیز ہیں۔ اس لحاظ سے یہ شادی ہمارے حکمرانوں کے آپس میں گندھے ہوئے شجرۂ نصب کے مزید باہمی قرب کا باعث بنی۔ مغلیہ شان و شوکت کی یاد تازہ کرنے والی بارات کے بعد "پسر اعلیٰ" کے دو عدد ولیموں کا بندوبست تھا۔ پہلا ولیمہ سلطنت کے صدر مقام لاہور کے ظاہر پرست رئیسوں کو رشک میں مبتلا کر دینے والا رنگ و نور میں نہلایا ہوا' شہری ولیمہ اور دوسرا آبائی حلقے کے ناشکرے ووٹروں کی ہٹ دھرمی پگھلا دینے والا دیہاتی ولیمہ۔

۸ر مارچ ۱۹۹۵ء کی شب وسیع و عریض ماڈل ٹاؤن گراؤنڈ بقعہ نور بنی ہوئی تھی۔ دبیز غالیچوں پر اعلیٰ ساخت کا فرنیچر سجا کر دس ہزار افراد کی نشست کا انتظام کیا گیا تھا۔ ۱۰ر مارچ کو "وساوے والا" میں منعقد ہونے والی ولیمہ کی تقریب اپنے حجم میں لاہور میں ہونے والی تقریب ولیمہ سے تین گنا بڑی تھی' کیونکہ اس میں اندازاً ۳۵ ہزار افراد کی خاطر تواضع کا بندوبست کیا گیا تھا۔

Marfat.com

مہمانوں کی آمدورفت اور دیگر لوازمات کے لیے سرکاری اداروں کی گاڑیوں اور ہیلی کاپٹروں کا بے دریغ استعمال کیا گیا اور قومی دولت کے بے رحمانہ اصراف کے ذریعے ایک نجی تقریب کو ریاستی تہوار بنا دیا گیا تھا۔ ان دونوں تقاریب کا سب سے زیادہ ناقابل جواز پہلو یہ رہا کہ دونوں مواقع پر صوبے کی ساری انتظامیہ کو اس کے تمام اسباب و آلات سمیت اس کے اصل فرائض سے ہٹا کر نجی خدمتگاری پر مامور کر دیا گیا۔ وزیراعلیٰ صوابدیدی فنڈز کے دروازے کھول دیئے گئے اور سارے اخراجات اور انتظامات کروڑوں روپے کے اس صوابدیدی فنڈ سے پورے کیے گئے۔

میاں منظور وٹو کی کرپشن کی اکثر داستانیں اگرچہ اخبارات کی زینت بن چکی ہیں لیکن پھر بھی کچھ داستانیں ایسی بھی تھیں جو منظرعام پر نہ آ سکیں۔ وٹو کی کرپشن کی ان "پوشیدہ داستانوں" میں وہ "روزگار پیکج" بھی شامل تھا جس کے تحت صوبہ میں مجموعی طور پر ۵ ارب روپے کی رشوت وصول کی گئی لیکن رشوت دینے والے کامیاب بھی نہ ہوسکے۔

۱۱ اپریل کی صبح اچانک اس وقت کے وزیر اعلیٰ پنجاب میاں منظور احمد وٹو نے صوبائی وزیر تعلیم ریاض فتیانہ، وزیر بہبود آبادی و جیل خانہ جات خوش اختر سبحانی، مسلم لیگ (ج) کے مقامی رہنما میاں محمد آصف اور صوبہ میں اپنی حلیف جماعت پیپلز پارٹی کے ملک مشتاق اعوان، ناظم حسین شاہ اور افضل چن کو وزیر اعلیٰ ہاؤس طلب کر لیا۔

پریس اور دیگر سرکاری ذرائع کو مطلع کیے بغیر بلایا جانے والا یہ پراسرار اجلاس کچھ ہی دیر بعد اس وقت ختم ہو گیا جب ناظم حسین شاہ (جو ان دنوں شیر پنجاب کا لقب اختیار کیے ہوئے تھے) وزیر اعلیٰ کو باآواز بلند للکارتے ہوئے وزیر اعلیٰ ہاؤس سے باہر آ گئے۔ چند لمحوں کے بعد ملک مشتاق اعوان اور افضل چن بھی اجلاس سے واک آوٹ کر کے ناظم حسین شاہ سے آن ملے۔

وزیر اعلیٰ وٹو کی طرف سے ہنگامی اور خفیہ اجلاس طلب کرنے کی وجہ پنجاب میں حکمران اتحاد پی ڈی ایف میں پھوٹ پڑنے والی "بدگمانی" کو دور کرنا تھا۔ چونکہ پیپلز پارٹی پنجاب کے ایک سرکردہ رہنما مخدوم الطاف صوبے میں رائج سیاست کی عمومی ڈگر سے ہٹ کر اور "نوکریوں کی دوڑ" سے علیحدہ ہو کر سیاسی معاملات چلانے کے حامی تھے۔ اس لیے ان کو اس "اہم" اجلاس میں نہ بلایا گیا۔ میاں منظور احمد وٹو نے مخدوم الطاف کو علیحدہ کر کے مذکورہ بالا اراکین اسمبلی کو وزیر اعلیٰ ہاؤس میں طلب کیا اور پنجاب میں اعلان کردہ اساتذہ کی ۴۲ ہزار آسامیوں کی آپسی "بانٹ" طے کرنا چاہی۔ عین اسی وقت مشتاق اعوان

Marfat.com

نے پیپلز پارٹی کے مرکزی رہنما فیصل صالح حیات کی تیار کردہ ایک فہرست وٹو صاحب کے سامنے رکھ دی' جس میں صوبہ بھر کے اہم عہدوں پر پیپلز پارٹی کے افراد کا تقرر کیا جانا درج تھا اور وٹو سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ گورنر راجہ سروپ کے رولز آف بزنس کے مطابق عمل کرتے ہوئے گریڈ اٹھارہ اور اس کے اوپر کے افسروں کے تقرر و تبادلے کے اختیارات گورنر کو دیں' وفاقی حکومت کو اپنا چیف سیکرٹری مقرر کرنے دیں اور مخدوم الطاف کے اپنے اختیارات کا بھرپور استعمال کرنے میں مانع نہ ہوں۔

وٹو نے مشتاق اعوان کی فہرست اپنی واسکٹ کی جیب میں رکھتے ہوئے اعلان کر دیا کہ ان کی جماعت مسلم لیگ (ج) پنجاب میں ۴۲ ہزار اساتذہ کی تقرری کے منصوبے میں سے ۳۰ ہزار آسامیاں خود پر کرے گی اور ۱۲ ہزار آسامیاں پی ڈی ایف کی اتحادی جماعتیں اپنے "تناسب" سے پر کریں گی۔ وزیر اعلیٰ وٹو کے اس اعلان سے ناظم حسین شاہ آگ بگولا ہو گئے اور اجلاس سے واک آوٹ کر گئے۔

۴۲ ہزار اساتذہ کی مذکورہ آسامیاں ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف کی کڑی شرائط اور پی ڈی ایف میں شدید اختلافات کے باعث سرخانے کی نذر ہوگئیں تو جولائی کے شروع میں وزیر اعلیٰ وٹو نے ان آسامیوں کی بانٹ سے پیدا ہونے والی تلخی کو دور کرنے کے لیے اپوزیشن اور ذرائع کے علم میں لائے بغیر بھرتیوں کے ایک بڑے پراجیکٹ "روزگار پیکج" کو پنجاب کی اعلیٰ بیوروکریسی سے مل کر آخری شکل دی۔

ریکروٹمنٹ پلان نام کے اس روزگار پیکج کے تحت صوبہ میں حکمران پی ڈی ایف کے ہر رکن صوبائی اسمبلی کو پندرہ آسامیوں پر مشتمل ایک پروگرام دیا گیا۔ جولائی کے آخری ہفتہ میں وزیر اعلیٰ وٹو نے صوبے کے اعلیٰ سرکاری عہدیدروں کے مشورہ سے ہر رکن اسمبلی کو پیش کی جانے والی پندرہ آسامیوں کا حتمی تعین کر لیا۔ جونیئر کلرک سے لے کر لیکچرار تک کی یہ آسامیاں کچھ اس طرح تھیں۔

دو جونیئر کلرک' دو جیل وارڈر' ایک آفس اسسٹنٹ' ایک سٹینو گرافر' دو فوڈ گرین سپروائزر' ایک لیبارٹری ٹیکنیشن' ایک ڈویژنل سپورٹس کوچ' ایک تحصیل سپورٹس آفیسر' ایک اسسٹنٹ سب انسپکٹر پولیس' ایک سب انجینئر' ایک سبجیکٹ سپیشلسٹ اور ایک عدد لیکچرار۔ ان آسامیوں پر پی ڈی ایف پنجاب کے ہر رکن صوبائی اسمبلی نے اپنی صوابدید پر بھرتیوں کی سفارش کرنا تھی۔

خالصتاً وزیر اعلیٰ وٹو کے تخلیق کردہ اس بھرتی پلان کی بھنک پی ڈی ایف سے تعلق

Marfat.com

رکھنے والے اراکین قومی اسمبلی کے کانوں میں پڑی تو انہوں نے وفاقی حکومت کے بعض اعلیٰ عہدیداروں سے سفارش کی کہ وہ وزیر اعلیٰ وٹو کو اس بات پر راضی کریں کہ پنجاب سے تعلق رکھنے والے پی ڈی ایف اراکین قومی اسمبلی کو بھی "روزگار پیکج" سے استفادہ کا موقع دیا جائے۔ اگرچہ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ وزیر اعظم بے نظیر بھٹو یا کسی دوسرے وفاقی عہدیدار نے وٹو کو اس سلسلے میں کوئی ہدایت کی تھی لیکن تقریباً ایک ہفتہ بعد وزیر اعلیٰ وٹو نے پنجاب سے تعلق رکھنے والے مسلم لیگ (ج) کے اراکین قومی اسمبلی سے ملاقات کر کے یہ فیصلہ کر لیا کہ پنجاب سے تعلق رکھنے والے پی ڈی ایف کے تمام اراکین قومی اسمبلی کو بھی اس "روزگار پیکج" میں شامل کر لیا جائے۔ لہٰذا ان اراکین قومی اسمبلی کو بھی فی کس پندرہ آسامیوں سے مستفید ہونے کی اجازت دے دی گئی۔

اس کے علاوہ وزیر اعلیٰ وٹو نے فیصلہ کیا کہ وہ خود اس "بھرتی پروگرام" سے عام رکن صوبائی اسمبلی کی طرح مستفید نہیں ہوں گے بلکہ وہ وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے اور "بھرتی پروگرام" کے خالق ہونے کے ناطے پی ڈی ایف پنجاب کے اراکین قومی و صوبائی اسمبلی کو دی جانے والی تمام آسامیوں کا دس فیصد اضافی حصہ لیں گے۔

پنجاب پیپلز پارٹی کے ۱۰۳ ممبران صوبائی اسمبلی میں سے تین اراکین صوبائی اسمبلی نے اس روزگار پیکج سے کوئی استفادہ حاصل نہ کیا جب کہ باقی ۱۰۰ اراکین صوبائی اسمبلی نے ۱۵۰۰ آسامیاں حاصل کیں۔ مسلم لیگ (ج) پنجاب سے تعلق رکھنے والے ۳۳ اراکین صوبائی اسمبلی میں سے ۳۲ اراکین نے ۴۸۰ آسامیاں حاصل کیں جب کہ وزیر اعلیٰ نے ممبر صوبائی اسمبلی کی حیثیت سے کوئی آسامی نہ حاصل کی۔ اس کے علاوہ پی ڈی ایف کے دیگر اتحادی ممبران صوبائی اسمبلی میں سے ۶ اراکین نے ۹۰ آسامیاں وصول کیں۔ اس طرح کل ۱۴۰ اراکین صوبائی اسمبلی نے ۲۱۰۰ آسامیاں حاصل کر لیں۔

پنجاب سے تعلق رکھنے والے پیپلز پارٹی کے ۵۳ اراکین قومی اسمبلی میں سے بھی صرف ایک ممبر قومی اسمبلی نے کوئی آسامی حاصل نہ کی جب کہ باقی ۵۲ ارکان نے ۷۸۰ آسامیاں حاصل کر لیں۔ پنجاب سے تعلق رکھنے والے مسلم لیگ (ج) کے ۶ اراکین قومی اسمبلی نے بھی ۹۰ آسامیاں حاصل کر لیں جب کہ پنجاب میں سے پی ڈی ایف کے اتحادی ۴ ممبران قومی اسمبلی نے "روزگار پیکج" سے ۶۰ آسامیاں حاصل کیں۔ اس طرح ممبران قومی اسمبلی کے حصہ میں ۹۳۰ آسامیاں آئیں۔

آخر میں وزیر اعلیٰ پنجاب میاں منظور وٹو نے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے "روزگار

Marfat.com

پیکج" کے تحت پنجاب کے پی ڈی ایف ممبران قومی و صوبائی اسمبلی کو تفویض کی جانے والی کل ۳۰۰۰۰ آسامیوں کا دس فیصد اضافی کوٹہ یعنی ۳۰۰۰ آسامیاں خود حاصل کر لیں۔ وزیر اعلیٰ کو ملنے والی ۳۰۰۰ آسامیوں میں سے نچلے درجے کی تمام آسامیاں ختم کر کے ان کی جگہ گریڈ اے کی آسامیاں شامل کی گئیں۔

"روزگار پیکج" نام کے اس خفیہ بھرتی منصوبے کے تحت ان آسامیوں کی نامزدگی کے حوالے سے بنیادی شرط یہ تھی کہ متعلقہ آسامی کے لیے مطلوبہ تعلیمی قابلیت کے زمرے میں امیدوار کا سیکنڈ ڈویژن ہونا لازمی تھا لیکن چونکہ اس بھرتی پروگرام کا اصل مقصد پی ڈی ایف کے "ڈانواں ڈول" ممبران اسمبلی کو سیاسی رشوت پیش کرنا تھا' اس لیے شرائط کی پابندی برائے نام تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ بعض ممبران اسمبلی نے ایسے افراد کے نام بھی اپنی مرتب کردہ بھرتی فہرستوں میں شامل کر لیے' جو مطلوبہ تعلیمی ڈگری بھی نہیں رکھتے تھے اور ان کی عمریں بھی ڈھل چکی تھیں۔

پی ڈی ایف سے تعلق رکھنے والے قومی و صوبائی اسمبلی کے معزز ارکان نے مذکورہ بالا آسامیوں میں سے ہر آسامی کے لیے اس کی اہمیت کے تناسب سے مختلف نرخ مقرر کر دیے جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

اے ایس آئی پولیس کی آسامی کے لیے تین سے چار لاکھ روپیہ' لیکچرار اور سبجیکٹ سپیشلسٹ کی آسامیوں کے لیے فی آسامی ۲ سے ۳ لاکھ روپے' سب انجینئر کے لیے عمومی ریٹ ایک سے دو لاکھ تک رہا۔ ڈویژن سپورٹس کوچ اور تحصیل سپورٹس آفیسر کی آسامیوں کے لیے فی آسامی ایک سے ڈیڑھ لاکھ روپیہ ادا کر کے لوگوں نے بھرتی لسٹ میں اپنے نام شامل کروائے۔ فوڈ گرین سپروائزر فی آسامی کا ایک لاکھ روپے سے ڈیڑھ لاکھ روپے تک ریٹ مقرر ہوا' جب کہ سٹینو گرافر' آفس اسسٹنٹ' جیل وارڈر' اور جونیئر کلرک کی آسامیاں ۵۰ ہزار روپے سے ایک لاکھ روپے فی آسامی تک فروخت ہوتی رہی۔

بعض معزز اراکین اسمبلی نے پر کشش آسامیوں کو دو سے چار مرتبہ فروخت کیا۔ خصوصاً اسسٹنٹ سب انسپکٹر پولیس کی آسامی جس کا ریٹ تین سے چار لاکھ روپے تک مقرر تھا اور لوگوں کی بڑی تعداد کی خواہش تھی کہ وہ یہی آسامی حاصل کریں' تقریباً ہر چوتھے ممبر اسمبلی نے مختلف امیدواروں کے ہاتھوں کئی بار فروخت کی۔ اسی طرح وزیر اعلیٰ سیکرٹریٹ میں اعلیٰ افسران ایک آسامی پر کئی کئی لوگوں کو مطمئن کرتے رہے۔ اس کے علاوہ وزیر اعلیٰ سیکرٹریٹ کے کئی افسران نے رقم ادا کردہ امیدواروں کی تشفی کے طور پر ان کا

Marfat.com

نام بھرتی فہرست میں دکھانے کے عوض پانچ سو سے ہزار روپے فی امیدوار کے حساب سی وصول کیے۔ اے ایس آئی پولیس کی آسامی کے علاوہ سبجیکٹ سپیشلسٹ اور لیکچرار کی آسامیاں بھی بڑی تعداد میں متعدد بار "فروخت" ہوئیں اور بعض اوقات وزیر اعلیٰ سیکرٹریٹ میں ایک ہی آسامی پر رکن اسمبلی کی طرف سے منتخب کردہ ایک سے زیادہ امیدوار آپس میں جھگڑا شروع کر دیتے اور دوسرے کو اپنے حق پر ڈاکہ زن قرار دیتے۔ اراکین اسمبلی کی طرف سے پندرہ آسامیوں کی فروخت سے حاصل کردہ رشوت کی شرح عمومی طور پر ۱۵ لاکھ روپے فی ممبر رہی' جب کہ منظور وٹو سے خصوصی قرب رکھنے والے ممبران اسمبلی نے نسبتاً کم اہمیت کی حامل اسامیوں کے بدلے میں پیداوری لحاظ سے بہتر آسامیاں حاصل کرلیں اور اس طرح پچیس سے تیس لاکھ روپے تک بٹورنے میں کامیاب رہے۔

وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے تمام آسامیوں کا دس فیصد کوٹہ یعنی ۳۰۰ آسامیاں جو منظور وٹو کے حصے میں آئی تھیں' انہیں پر کرنے کے لیے انہوں نے اپنے فرزند میاں معظم وٹو کا انتخاب کیا۔ یہاں بھی کچھ اراکین اسمبلی نے وزیر اعلیٰ سے اپنے خصوصی قرب کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وزیر اعلیٰ کے لیے مختص کردہ کوٹے میں سے براہ راست اپنا "حصہ" وصول کر لیا۔ ان حصہ وصول کرنے والوں میں وزیر اعلیٰ کے پولیٹیکل سیکرٹری رانا گل ناصر اور سعید احمد مینس شامل تھے' جب کہ وٹو کے قریبی ساتھی صوبائی وزیر قانون چوہدری فاروق نے وزیر اعلیٰ کے کوٹے میں شراکت تو نہ کی البتہ اپنے حصے کی پندرہ آسامیوں میں سے نچلے درجے کی آسامیاں اعلیٰ درجے کی آسامیوں سے بدل لیں۔ اس طرح معظم وٹو کو ملنے والی ۳۰۰ آسامیوں میں سے ۵۰ آسامیاں چہیتے ممبران کے پاس چلی گئیں۔

خصوصاً اے ایس آئی اور لیکچرار کی آسامیوں کے حوالے سے ایسی کئی مثالیں موجود ہیں کہ زیادہ قیمت ملنے پر معزز اراکان نے اپنی پچھلی نامزدگیاں واپس لے کر نئے امیدواروں کے کیس پیش کر دیے۔ اس نوع کی تبدیلیوں کے عوض وزیر اعلیٰ سیکرٹریٹ کے متعلقہ افسران نے بھی نامزد ہونے والے امیدوراروں سے اپنا "حصہ" وصول کیا۔ ایک آسامی پر ایک سے زائد آدمیوں کو نامزد کرنے والوں میں ایک اہم رکن اسمبلی بھی شامل تھے جن کا شمار وٹو کے شدید ترین ناقدوں میں بھی ہوتا تھا۔

میاں منظور وٹو کے سپوت معظم وٹو نے وزیر اعلیٰ کے کوٹے کی بیشتر آسامیوں کے لیے بھاری رقوم وصول کیں انہوں نے ہر آسامی کے لیے عمومی شرح سے زیادہ رقم وصول کی کیونکہ اپنے والد کے عہدے کی معرفت ان کا اعتبار زیادہ جما ہوا تھا اور نہیں رقوم ادا

کرنے والے لوگوں کو ملازمت ملنے کا سو فیصد یقین تھا۔

گوجرانوالہ ڈویژن سے پی ڈی ایف کے ممبران قومی و صوبائی اسمبلی نے اگست ۹۵ء کے تیسرے ہفتہ تک اپنے اپنے "امیدواروں" کی بھرتی فہرستیں مکمل کر کے وزیر اعلیٰ سیکرٹریٹ کو پہنچا دیں۔ گوجرانوالہ ڈویژن کے ممبران کے حصے میں ۵۱۰ آسامیاں آئیں جن میں سے تقریباً تین فیصد آسامیاں پر نہ کی جا سکیں جب کہ اراکین اسمبلی نے وزیر اعلیٰ کے دس فیصد اضافی کوٹے سی بھی اسامیاں وصول کیں۔

اس ڈویژن سے تعلق رکھنے والے امیدواروں کی اکثریت صوبائی دارالحکومت میں مختلف سرکاری مقامات پر دھکے کھاتی رہی۔ امیدواروں کی ایک بڑی تعداد روزانہ وزیر اعلیٰ سیکرٹریٹ، سینئر وزیر مشتاق اعوان کے دفتر اور لاہور میں مقیم اپنے اپنے حلقوں کے ممبران قومی و صوبائی اسمبلی کی رہائش گاہوں کے چکر کاٹتی رہتی۔ اکثریت کا خیال تھا کہ اگر وزیر اعلیٰ وٹو نہیں رہے تو ان کے ایم۔ این اے اور ایم۔ پی۔ اے تو موجود ہیں اور شاید وزیر اعلیٰ نگئی میاں منظور وٹو کے "روزگار پیکج" کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے احکامات جاری کر دیں۔

فیصل آباد ڈویژن سے تعلق رکھنے والے پی ڈی ایف کے اراکین قومی و صوبائی اسمبلی نے ۵۱۰ آسامیاں حاصل کیں اور مجموعی طور پر ۲ فیصد آسامیاں بیچ دیں، جو "مناسب" امیدوار مہیا نہ ہونے کی صورت میں پر نہ ہو سکیں۔ اس کے علاوہ فیصل آباد ڈویژن کے بعض اراکین صوبائی اسمبلی نے وزیراعلیٰ وٹو کے مخصوص کوٹے سے بھی آسامیاں حاصل کیں اور اپنے حصے کی کم تر آسامیوں کو منافع بخش آسامیوں سے تبدیل کرایا۔ مجموعی طور پر فیصل آباد ڈویژن کے امیدواروں نے تمام آسامیوں کے ریٹ سب سے بلند رکھے۔ فیصل آباد کے ایک امیدوار (جو کسی بھی صورت میں اپنا نام شائع نہیں کرانا چاہتے تھے) نے بتایا کہ انہوں نے اے ایس آئی کی آسامی کے لیے اپنے ممبر اسمبلی کو تین لاکھ روپیہ ادا کیا لیکن انہوں نے شروع میں میرا نام فہرست میں شامل نہ کیا۔ بعد میں میرے احتجاج کے بعد انہوں نے میرا نام شامل کر لیا، لیکن جب میں مزید تسلی کے لیے وزیراعلیٰ سیکرٹریٹ پہنچا تو معلوم ہوا کہ میرے علاوہ بھی مذکورہ رکن اسمبلی نے کئی لوگوں سے اے ایس آئی کی آسامی کے لیے پیسے پکڑے تھے۔ اس طرح لاہور ڈویژن سے تعلق رکھنے والے پی ڈی ایف کے اراکین قومی و صوبائی اسمبلی کے حصے میں ۴۲۰ آسامیاں آئیں جن میں سے تقریباً تمام آسامیاں "پُر" کر دی گئیں۔ لاہور ڈویژن میں بھی تمام آسامیوں کے

Marfat.com

ریٹ بہت اونچے رہے اور لوگوں کی بڑی تعداد نے اپنے نام بھرتی فہرستوں میں درج کرائے۔ صوبائی سیکرٹریٹ' وزیراعلیٰ سیکرٹریٹ اور سینئر وزیر ملک مشتاق اعوان کے دفاتر کے باہر سب سے زیادہ رش ان جیالوں اور مسلم لیگ (ج) سے تعلق رکھنے والے امیدواروں کا ہوتا' جنہوں نے بھرتی ہونے کے لیے بھاری رقوم اراکین اسمبلی کو دیں لیکن وٹو حکومت جانے کے بعد وہ یا تو ان رقوم کی واپسی کے مطالبے کے ساتھ روزانہ ان دفاتر میں آتے' یا پھر کسی مناسب متبادل کی تلاش میں ان کے شب و روز بسر ہونے لگے۔

راولپنڈی ڈویژن سے ۱۲۰ امیدواروں کے نام بھرتی فہرست میں شامل کر کے وزیر اعلیٰ سیکرٹریٹ کو روانہ کیے گئے اور ان میں بعض ایسے امیدوار بھی تھے' جنہوں نے رقم تو ادا کر دی تھیں لیکن ان کا نام فہرست میں شامل نہیں تھا۔ اسی طرح دیگر کئی ڈویژنوں سے لاتعداد ایسے لوگ آئے جنہوں نے پیسے تو ادا کر دیئے لیکن ان کا نام فہرست میں شامل نہ ہوسکا تھا۔ اس طرح مجموعی طور پر پنجاب بھر سے ۳۳۰۰ آسامیوں کے لیے محتاط اندازے کے مطابق تقریباً ۵ ارب روپے کی خطیر رقم ہزاروں امیدواروں نے وزیراعلیٰ وٹو کے اس "روزگار پیکج" کے لیے ارکان اسمبلی کو دی۔

اس کے بعد میاں منظور وٹو ایل ڈی اے کی جانب متوجہ ہوئے' جہاں پہلے ہی میاں نواز شریف ۳۰۰۰ پلاٹ الاٹ کر چکے تھے۔ میاں منظور وٹو نے اسی شخص کو اس ادارے کا ڈائریکٹر جنرل مقرر کیا جس نے اس ادارے کی لوٹ مار میں میاں نواز شریف کی مدد کی تھی۔ اس کے بعد میاں منظور وٹو نے اپنے سمدھی جاوید عمر کو ایل ڈی اے کا وائس چیئرمین بنا دیا اور مغل حکمرانوں کی طرز پر مال غنیمت بٹورنے کا یہ نظام نشوونما پاتا رہا' جسے مسلم لیگ کا طبقہ اشرافیہ پہلے ہی مقبول عام کر چکا تھا۔ ایک بار پھر شہری جائیداد ہدف بنی۔ میاں نواز شریف جنہوں نے اپنے عہد اقتدار میں ۱۵۰ کروڑ بنائے تھے' ان کے مقابلے میں میاں منظور وٹو نے ۶۰ کروڑ بنائے اور مرحوم چوہدری الطاف (گورنر) صرف ۳ کروڑ بنا سکے۔

میاں منظور وٹو کی حکومت کا دارومدار بلیک میلنگ پر رہا۔ وٹو مسلم لیگ (ج) کے وزیروں کو لگام نہ ڈال سکے کیونکہ وہ پیسہ بنانے کی "آزادی" کا چارہ ڈال کر مزید لوگوں کو اپنی طرف کھینچنا چاہتے تھے۔ اس دوران محکمہ تعلیم کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا گیا۔ اساتذہ کو تبادلوں کے لیے اور تبادلے رکوانے کے لیے بھاری رشوت دینا پڑی۔ کتابوں کی اشاعت کے لیے دیئے گئے فنڈز خردبرد کر لیے گئے۔ قانون پر عمل کرنے والے اساتذہ اور

Marfat.com

طلبہ کو چپ کرانے کے لیے ایم ایس ایف (ج) کو تسلیم کیا جانے لگا۔

پی پی پی پنجاب کے وزیروں نے بھی وٹو کے ہمراہ مال بٹورنے کا عمل شروع کر دیا جس سے وہ ایک عرصہ سے محروم تھے۔ وٹو نے مالکانہ حقوق جاری کر کے غیر قانونی خریداریوں کے تمام راستے کھول رکھے تھے۔ مثال کے طور پر ایک وزیر صحت کہتا کہ وہ فلاں قسم کی کار خریدنا چاہتا ہے۔ جو صرف ایک کار ڈیلر کے پاس ہے۔ وزیراعلیٰ وٹو اس عمل میں مداخلت کیے بغیر سرٹیفکیٹ جاری کر دیتے تھے۔

جب میاں منظور وٹو سپیکر تھے تو ناراض ایم پی اے حضرات اور خوفزدہ سرکاری افسروں میں گاہے بگاہے "مصالحت" کرا دیتے تھے۔ جس سے ان کی حمایت میں اضافہ ہوتا تھا۔ اگر ایوان میں وزیروں پر دباؤ ہوتا تو وہ ان کو مصیبت میں سے نجات دلوا کر ان کی حمایت کرتے تھے اور ساتھ ہی اپنے کاموں کی لسٹ ان کو تھما دیتے۔ اور جب وٹو وزیراعلیٰ بنے تو پی پی پی اور مسلم لیگ کے درمیان ان کی حیثیت اس قدر غیر مستحکم تھی کہ ہر کسی کو مراعات دینا پڑیں اور ہر کوئی منظور وٹو کو بلیک میل کر سکتا تھا۔ وٹو حکومت کے خاتمے کے بعد مسلم لیگ (ن) کے اراکین پنجاب اسمبلی کا کہنا تھا کہ وٹو نے کبھی ان کی کسی تجویز سے انکار نہیں کیا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ان "تجاویز" نے نظم و ضبط تباہ کر دیا اور عام آدمی کو عوامی منصوبوں کے فائدوں سے محروم کر دیا۔

Marfat.com

سیاستدان سیلاب فنڈ بھی کھا گئے

رواں سال کے دوران شدید بارشوں اور زبردست سیلابوں کے باعث تباہ و برباد ہونے والے پنجاب کے ۳ ہزار ۷ سو ۶۹ دیہات کے لیے بین الاقوامی رفاعی اداروں' بیت المال' وفاقی حکومت اور صوبائی حکومتوں کی طرف سے دی جانے والی تقریباً ۸۰ کروڑ روپے کی امدادی رقم متاثرین کو تقسیم کرنے کی بجائے اراکین قومی اسمبلی کھا گئے۔ جب کہ پنجاب کے ریلیف ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے ہنگامی بنیادوں پر مہیا کی جانے والی ۵ کروڑ روپے کی خطیر رقم متاثرہ اضلاع کے ڈپٹی کمشنروں اور دیگر اعلیٰ حکام نے ہڑپ کر لی۔ مذکورہ بالا فوری امداد کے علاوہ وفاقی اور صوبائی حکومت کے باہمی اشتراک سے متاثرین سیلاب کے نقصان کا ازالہ کرنے کے لیے ۲۸ کروڑ روپے کے چیک جاری کیے گئے۔ گزشتہ چار ماہ میں بے یارومددگار پڑے فاقوں مرتے پنجاب کے ۱۱ لاکھ ۶۰ ہزار ۶ سو ۸۲ افراد کو ۲۸ کروڑ روپے کے جو امدادی چیک جاری کیے گئے وہ ابھی کیش نہیں ہوسکے تھے کہ صدر لغاری کی طرف سے حکومت توڑ دی گئی۔ اس کے علاوہ نگران وفاقی حکومت نے ایک فوری فیصلے کے تحت جاری شدہ چیکوں کی رقم مبلغ ۲۸ کروڑ روپے کے فنڈز کو منجمد کر دیا۔ چیک کیش نہ ہونے کے باعث تقریباً ۱۳ لاکھ افراد میں سے ۹۰ فیصد کے پاس سر چھپانے کو جگہ نہیں۔ یہ بڑی تعداد روزانہ چیکوں کو کیش کرنے کے لیے صوبائی دارالحکومت کا رخ کرتی ہے لیکن انہیں دو ٹوک جواب ملتا ہے "خزانے میں ایک دمڑی بھی نہیں"۔

اس سال پنجاب میں ہونے والی شدید ترین بارشوں اور دریاؤں میں آ جانے والی زبردست طغیانی کے باعث صوبہ بھر میں مجموعی نقصان کا جو اندازہ لگایا گیا اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ لیکن ایسی کئی مثالیں موجود ہیں کہ سیلاب سے متاثر ہونے والے افراد کو حکومتوں کی طرف سے جو امداد دی گئی' وہ ان تک پہنچی جبکہ اس بار ایسا نہیں ہوا۔ حالیہ

Marfat.com

بارشوں اور سیلاب کے باعث ضلع لاہور کے ۳۱۸ دیہات کو شدید ترین نقصان کا سامنا کرنا پڑا جس سے ان دیہات کے ۴۰ ہزار ۷ سو ۷ افراد بے گھر ہوئے۔

۳ ہزار ۲ سو ۶۳ مکان تباہ ہوئے جب کہ اس دوران ۴۰ قیمتی جانیں ضائع ہوئیں۔ دوسرا بڑا نقصان یہ ہوا کہ ۴۱ ہزار ۴ سو ۳ ایکڑ اراضی پر کھڑی کروڑوں روپے مالیت کی فصلیں بالکل تباہ ہو گئیں اور ۱۰۰ سے زائد مویشی ہلاک ہو گئے۔ اس دوران ضلع لاہور میں ۸ امدادی کیمپ لگائے گئے جن کے لیے صوبائی حکومت کی طرف سے ۳ کروڑ روپے کی رقم مہیا کی گئی۔ ۳ کروڑ روپے کی یہ رقم وزیر اعلیٰ پنجاب سردار عارف نکئی، سینئر وزیر ملک مشتاق اعوان اور لاہور کے واحد ایم۔ این۔ اے خالد جاوید گھرکی نے استعمال کر لی، جب کہ ان سیاسی رہنماؤں کے علاوہ لاہور کے ڈپٹی کمشنر کو بھی معقول حصہ ملا، جنہوں نے وزیر اعلیٰ کے ایماء پر بے بنیاد دعویٰ کر دیا کہ وہ متاثرین سیلاب کو روزانہ ۱۲ سو دیگیں پکا کر کھلا رہے ہیں۔ جب کہ ان امدادی کیمپوں میں کھانا اور ضروریات زندگی کی دوسری اشیاء جماعت اسلامی اور صوبے کی دوسری فلاحی تنظیمیں پہنچاتی رہیں۔ اسی طرح سیلاب اور بارشوں سے ضلع قصور کے ۱۳۳ دیہات تباہ ہوئے جن میں کھڑی فصلیں تباہ ہو گئیں۔ ایک ہزار ایک سو دو مکانات تباہ ہوئے، نو افراد ہلاک ہوئے جب کہ ۴ مویشی بھی ہلاک ہوئے۔ ضلع قصور میں پندرہ امدادی کیمپ لگائے گئے، جب کہ حکومت نے دو کروڑ روپے کی فوری امداد مہیا کی۔

امدادی کیمپوں میں مقیم بے آسرا لوگوں کے لیے خوراک اور دوسری سہولتیں مقامی لوگ بہم پہنچاتے رہے۔ جبکہ حکومت کی طرف سے صرف ایک ہفتہ تک ادویات سپلائی کی جاتی رہیں۔ تقریباً ڈیڑھ کروڑ روپے کی رقم قصور کے ممبران قومی و صوبائی اسمبلی کے حصے میں آئی، جس میں سب سے بڑا حصہ ضلع قصور سوشل ایکشن بورڈ کے چیئرمین سردار طالب حسن نکئی کا تھا۔ ضلع اوکاڑہ کے ۵۳ دیہات کو سیلاب کا سامنا کرنا پڑا، ۲ ہزار ۹ سو ۵۷ لوگ بے گھر ہوئے، ۱۳ ہزار ۱۱ لاکھ ایکڑ پر کھڑی فصلیں تباہ ہوئیں اور ایک سو ۹۵ مکانات تباہ ہوئے۔ حکومت کی طرف سے لگائے گئے پانچ کیمپوں کو اسی لاکھ روپے کی امداد مہیا کی گئی، جسے مسلم لیگ (ج) کی طرف سے اوکاڑہ سے منتخب ہونے والے ارکان اسمبلی ہڑپ کر گئے۔ سیلاب کی وجہ سے بہت بڑا نقصان لاہور ڈویژن کے چوتھے ضلع شیخوپورہ کو ہوا۔ شیخوپورہ ضلع میں کل ۴ سو ۵۵ دیہات کو شدید نقصان پہنچا، جہاں ۵۹ ہزار ایک سو ۵۹ افراد بے گھر ہوئے اور ۳۵ مویشی بہہ گئے۔ حکومت نے ۲۴ امدادی کیمپ قائم کیے۔ مجموعی طور

Marfat.com

پر حکومت کی طرف سے ضلع شیخوپورہ کو ۵ کروڑ روپے کی امداد فراہم کی گئی۔ ذرائع کے مطابق ۵ کروڑ روپے کی اس امداد میں سے تقریباً ایک کروڑ روپیہ سینئر صوبائی وزیر مشتاق اعوان کے حصہ میں آیا جب کہ باقی رقم میں سے ۲۰ فیصد متاثرین پر تقسیم ہوئی اور باقی ماندہ خطیر رقم کو دیگر صوبائی وزرا اور اراکین اسمبلی اور ضلعی انتظامیہ ہڑپ کر گئی۔

گوجرانوالہ ڈویژن میں ضلع نارووال سب سے زیادہ متاثر ہوا اور ضلع کے ۶۰۵ دیہات سیلاب سے تباہ ہوئے۔ ایک لاکھ ۳۱ ہزار ۳ سو ۹۰ افراد بے گھر ہوئے' ۳۵ ہزار ۳ سو ۷۶ ایکڑ پر کھڑی فصلیں تباہ ہوگئیں' ۲ ہزار ایک سو ۳ مکانات تباہ و برباد ہوگئے' ۳۴ افراد ہلاک ہوئے جبکہ ۱۴۳ مویشی بہہ گئے۔ حکومت کی طرف سے ۱۳ امدادی کیمپ لگائے گئے اور مجموعی طور پر ۸ کروڑ روپے کی رقم مہیا کی گئی۔ اس رقم میں سے نصف رقم پنجاب کے بااثر وزرا اور سوشل ایکشن بورڈ کے ممبران ہڑپ کر گئے' جبکہ متاثرین تک بہت کم امداد پہنچ سکی اور انہیں ازالہ نقصان کے چیک عنایت کر کے ساری انتظامیہ سرخرو ہوگئی۔

ضلع سیالکوٹ کے ۵ سو ۲۲ دیہات تباہ ہوئے' ۳ لاکھ ۵۰ ہزار افراد متاثر ہوئے۔ ۲ لاکھ ۵ ہزار ایکڑ اراضی پر کھڑی فصلیں تباہ ہوگئیں۔ ۱۷ ہزار ۷ سو ۲۵ مکانات تباہ ہوئے اور ضلع میں ۴۱ افراد ہلاک ہوگئے۔ ۳ سو ۳۰ مویشی ہلاک ہوئے اور ۱۲ امدادی کیمپ قائم کیے گئے۔ صنعتی لحاظ سے ترقی یافتہ علاقہ ہونے کے باعث مجموعی طور پر ۱۰ کروڑ روپے کی امداد مہیا کی گئی' لیکن یہ امداد مسلم لیگ (ج) اور پیپلز پارٹی کے سرکردہ سیاست دانوں کی بھینٹ چڑھ گئی۔ ذرائع کے مطابق تقریباً ۴ کروڑ روپے رکن قومی اسمبلی اور چیئرمین سوشل ایکشن بورڈ چوہدری اختر علی وریو کھا گئے جبکہ تقریباً ۳ کروڑ روپیہ محمد یوسف اور دیگر ارکان' جن میں ایک صوبائی وزیر بھی شامل تھا' کھا گئے۔

ضلع گوجرانوالہ کے ۱۶۹ دیہات سیلاب میں تباہ ہوئے۔ ۲ لاکھ ۵۰ ہزار ۴ سو افراد متاثر ہوئے۔ ۵۲ ہزار ایک سو ۶۰ ایکڑ اراضی پر کھڑی دھان کی فصل بالکل تباہ ہوگئی۔ ایک ہزار ۸ سو ۳۶ مکانات تباہ ہوگئے' ۸ افراد ہلاک ہوئے' ۱۴۷ مویشی بہہ گئے۔ ضلع میں ۷ امدادی کیمپ لگائے گئے اور مجموعی طور پر ضلع کو ۶ کروڑ روپیہ امداد کے طور پر ملا' جس میں سے مسلم لیگ (ج) کے صدر حامد ناصر چٹھہ پر بھی الزام لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے بھی تقریباً ایک کروڑ روپیہ حاصل کیا جبکہ سوشل ایکشن بورڈ کے چیئرمین اشرف وڑائچ (مرحوم) نے بھی لاکھوں روپیہ کمایا۔

حافظ آباد ضلع کے ۱۵۰ دیہات سیلاب کی نذر ہوئے' جن میں سے ایک لاکھ ۱۰ ہزار

افراد شدید متاثر ہوئے۔ ایک لاکھ ۵۰ ہزار ایکڑ اراضی پر کھڑی دھان کی فصل تباہ ہو گئی۔ ۷ سو ۶۲ مکانات تباہ ہوئے اور ۴ افراد ہلاک ہوئے۔ مجموعی امداد کی رقم ۳ کروڑ روپے وصول ہوئی، جس میں سے آدھی رقم بااثر ترین سیاست دان کھا گئے۔ پیپلز پارٹی کے ایک ایم۔ این۔ اے نے ۷۵ لاکھ روپے حاصل کیے۔

ضلع گجرات کے ۱۱۲ دیہات سیلاب کی زد میں آئے۔ ۵ ہزار ۳ سو ۱۶ افراد متاثر ہوئے۔ ۱۰ ہزار ۶ سو ۶۳ ایکڑ اراضی پر کھڑی فصل تباہ ہوئی، ۳ سو مکانات تباہ و برباد ہو گئے، ۱۱ افراد ہلاک ہوئے اور ۲۶۶ مویشی سیلاب میں بہہ گئے۔ ۲۴ امدادی کیمپ قائم کیے گئے اور ۳ کروڑ روپے کی فوری امداد مہیا کی گئی، لیکن امداد میں سے تقریباً ۲ کروڑ روپے پیپلز پارٹی کے اعلیٰ عہدیدار کھا گئے۔

منڈی بہاؤالدین ضلع میں ۷۶ دیہات تباہ ہوئے، ایک لاکھ ۶ ہزار ۳ سو ۳۲ افراد بے گھر ہوئے۔ ۱۰ ہزار ۶ سو ۶۵ ایکڑ اراضی پر کھڑی فصلیں تباہ ہو گئیں۔ ۳ سو گھر تباہ ہوئے، ۲ افراد ہلاک ہوئے، ۱۴ مویشی بہہ گئے۔ ۱۳ امدادی کیمپ حکومت کی طرف سے لگائے گئے۔ حکومت کی طرف سے ۲ کروڑ روپے کی امداد ملی، جس میں سے آدھی رقم سیاست دان اور دیگر اعلیٰ عہدیدار ہڑپ کر گئے۔

ضلع جھنگ میں ۳۹۰ دیہات متاثر ہوئے۔ ۵۳ ہزار ۳ سو ۴۰ افراد بے گھر ہوئے، ۶۴ ہزار ۳ سو ۶۷ ایکڑ اراضی پر کھڑی فصلیں تباہ ہو گئیں۔ ۳ ہزار ۷ مکان تباہ ہو گئے جبکہ ۱۲ افراد ہلاک ہوئے۔ ۲۹ امدادی کیمپ حکومت کی طرف سے قائم کیے گئے۔ حکومت نے ۸ کروڑ روپے کی امداد دی، جس میں سے ۵۰ فیصد رقم سیاسی اور انتظامی بدعنوانیوں کی نذر ہو گئی اور متاثرین کو چیک دے کر فارغ کر دیا گیا۔

ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ اور فیصل آباد میں ۸۱ دیہات سیلاب کا شکار ہوئے۔ دونوں اضلاع میں ۱۷ ہزار ۵ سو افراد متاثر ہوئے۔ دونوں اضلاع میں ۴۱ ہزار ۷ سو ۸۰ ایکڑ اراضی پر کھڑی فصلیں تباہ ہوئیں، ۲ ہزار مکانات تباہ ہوئے، ۴ افراد ہلاک ہوئے اور مجموعی طور پر دونوں اضلاع کو ۱۰ کروڑ روپے کی امداد مہیا کی گئی اور ۱۰ امدادی کیمپوں میں لوگوں کو سہولیات مہیا کی گئیں۔ ذرائع کے مطابق دونوں اضلاع میں تقریباً ۶ کروڑ روپیہ اعلیٰ سیاسی عہدیدار اور ضلعی انتظامیہ ہڑپ کر گئی اور لوگوں کو محض چیک دے دیے گئے۔

سرگودھا ڈویژن میں مجموعی طور پر ۳۷ دیہات متاثر ہوئے۔ ان دیہات کے ۲۳ ہزار ۵ سو ۶۹ افراد متاثر ہوئے جبکہ پورے ڈویژن میں ۲۵ ہزار ۵ سو ۹۹ ایکڑ اراضی پر کھڑی

فصلیں تباہ ہوئیں اور ۲۷۴۲ گھر تباہ ہوئے، ۲ افراد ہلاک ہوئے، ۴۰ مویشی ہلاک ہوئے اور ۵ امدادی کیمپ حکومت نے قائم کیے۔ مجموعی طور پر سرگودھا ڈویژن کو حکومت کی طرف سے ۸ کروڑ روپے کی امداد ملی جس میں سے ۳ کروڑ روپیہ خرچ نہ ہو سکا اور وہ اعلیٰ عہدیدار اور سیاسی رہنما کھا گئے۔

ڈیرہ غازی خان ڈویژن میں کل ۳۳۰ دیہات سیلاب کا شکار ہوئے، جن میں سے ۵۶ ہزار ۸ سو ۵ افراد متاثر ہوئے اور ۳۴ ہزار ایک سو ۱۷ ایکڑ اراضی پر کھڑی فصلیں تباہ ہوئیں۔ ۲۱۳ مکانات تباہ ہوئے، ۴ افراد ہلاک ہوئے اور حکومت کی طرف سے ۶۵ امدادی کیمپ لگائے گئے۔ حکومت نے مجموعی طور پر ۱۰ کروڑ روپے ڈیرہ غازی خان ڈویژن کو مہیا کیے، جن میں سے پی پی پی کے راہنماؤں نے ۶ کروڑ روپے اڑا دیئے اور متاثرین کو صرف امدادی رقوم کے چیک ہی دیئے گئے جو کیش نہ ہو سکے۔

ملتان ڈویژن میں مجموعی طور پر ۲۸۲ دیہات سیلاب سے متاثر ہوئے۔ ۴۷ ہزار ۴۳ افراد متاثر ہوئے اور ایک لاکھ ۳۵ ہزار ۵ سو ۲۴ ایکڑ اراضی پر کھڑی فصلیں تباہ ہو گئیں، ۸۸۵ مکانات تباہ ہو گئے، ۱۲ افراد ہلاک ہوئے، ۳ کروڑ روپے کی حکومتی امداد سیاسی رہنما اور سوشل ایکشن بورڈ کے چیئرمین ہضم کر گئے۔

بہاولپور میں ۲۰ دیہات متاثر ہوئے، ۲ ہزار ۶ سو ۹۷ افراد متاثر ہوئے، ۳۸۲ ایکڑ اراضی پر کھڑی فصلیں تباہ ہو گئیں، ۶۲۰ مکانات تباہ ہو گئے اور ۲۲ امدادی کیمپ لگائے گئے، اس کے ساتھ ہی حکومت نے ۲ کروڑ روپے کی امداد مہیا کی، جس میں سے ۵۰ لاکھ روپے بدعنوانیوں کی نذر ہو گئے۔

ان تمام فوری کارروائیوں کے بعد جب صوبہ پنجاب کے ریلیف ڈیپارٹمنٹ کا کام شروع ہوا تو ریلیف ڈیپارٹمنٹ نے حکومتی منظوری کے ساتھ ازالہ نقصان کے طور پر جو شرح مقرر کی، اس کے مطابق خاندان کے کفیل کی ہلاکت پر ۵۰ ہزار، جو کفیل نہ ہو اس کی ہلاکت پر ۳۰ ہزار روپے، گھر چاہے جس نوعیت کا بھی ہو، اس کی تباہی پر ۵ ہزار روپے اور مال مویشی بہہ جانے کی صورت میں فی مویشی ۲ ہزار روپے کی امدادی رقم مقرر کی۔ ریلیف ڈیپارٹمنٹ نے جب تخمینہ لگایا تو یہ رقم تقریباً ۲۸ کروڑ روپے تھی، جسے پنجاب کے متاثرین سیلاب کو "امدادی فنڈ" کے طور پر دیا جانا تھا۔ حکومت پنجاب نے اپنی طرف سے ۳ کروڑ روپیہ اس فنڈ میں شامل کیا جبکہ وفاقی حکومت نے فوری طور پر ۶ کروڑ ۵۰ ہزار روپے فراہم کیے اور باقی ۱۹ کروڑ روپے ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ پنجاب حکومت نے وفاقی

Marfat.com

حکومت کو ۱۹ کروڑ روپے کی فراہمی کی سمری بھیجی تو یہ رقم بھی منظور کر لی گئی اور صوبائی حکومت کو ہدایت کی گئی کہ وہ پنجاب کے متاثرین کو ۲۸ کروڑ روپے کی ادائیگیوں کے چیک تقسیم کر دے۔ ریلیف ڈیپارٹمنٹ کے ذریعے صوبائی حکومت نے چیک تقسیم کر دیئے لیکن اس دوران وفاقی حکومت ٹوٹ گئی اور نگران کابینہ نے تمام فنڈز منجمد کر دیئے جس سے تقریباً پنجاب کے ۱۳ لاکھ افراد سخت پریشانی کا شکار ہیں۔

Marfat.com

عورتوں کی حالت اور ہمارا سیاست دان

بے نوا طبقہ سے تعلق رکھنے والی عورت کی پامالی کی داستان ہمارے معاشرے کا ایک بہت بڑا المیہ ہے۔ مرد کے ہاتھوں بے آبرو ہو کر قتل ہونا عورت کی مظلومی کی انتہا ہے اور اس ہولناک ظلم کا محرک مرد کا جارحانہ احساس برتری ہے۔ اگرچہ اس نوعیت کی بربریت کسی ایک علاقے یا طرز معاشرت سے وابستہ نہیں تاہم واضح طبقاتی تفاوت اور قانون کا غیر مساویانہ اطلاق اس نوعیت کے جرائم کی شدت اور شرح میں اضافہ کا باعث بنتا ہے۔

انسانی حقوق کمیشن کے اعداد و شمار کے مطابق ہر سال ملک میں ۲ ہزار سے زائد عورتیں اغوا ہو جاتی ہیں' جن میں سے ۹۵ فیصد عورتیں زنا بالجبر کا نشانہ بنتی ہیں۔ ان عورتوں کی ایک معقول تعداد جنسی زیادتی کے بعد مختلف ہاتھوں میں بکتی رہتی ہے۔ ان اغوا شدگان میں سے دس فیصد عورتیں اس دوران قتل کر دی جاتی ہیں جب کہ بازیاب ہونے والی خواتین میں سے بھی دس فیصد سے زائد عورتیں بعد ازاں خاندان والوں کے ہاتھوں قتل ہو جاتی ہیں۔ واضح رہے کہ ظلم کا شکار ہونے والی ان خواتین میں ۹۸ فیصد غریب خاندانوں سے تعلق رکھتی ہیں جب کہ ملزمان کا تعلق با اثر اور امیر گھرانوں سے ہوتا ہے۔

ایک اندازے کے مطابق طاقتور کے ہاتھوں اغوا اور اس دوران جنسی تشدد اور قتل ہونے والی عورتوں میں سے ۷۰ فیصد دیہات سے تعلق رکھتی ہیں۔ ہماری دیہی معاشرت میں وڈیروں اور زمینداروں کے ہاں معمولی خدمات سرانجام دینے والی عورتوں کو آقاؤں کی خوشنودی کا ہر لحاظ سے دھیان رکھنا پڑتا ہے جس میں بعض اوقات ان کی اور ان کے کارندوں کی جنسی تسکین کا "فریضہ" بھی شامل ہوتا ہے۔

انسانی حقوق کمیشن پاکستان کی ایک رپورٹ کے مطابق ہر سال تقریباً اڑھائی سو

خواتین دیہات میں باہمی لڑائی جھگڑوں کے دوران مخالف کی تذلیل کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ ان عورتوں کو یا تو اغواء کر کے جنسی زیادتی کے بعد قتل کر دیا جاتا ہے یا زبردستی گھر سے اٹھا کر لوگوں کے سامنے برہنہ کر کے پھرایا جاتا ہے۔ اس دوران بھی ۲۰ فیصد عورتیں اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہیں۔ عورت کی تذلیل کا ایک اور طریقہ جو ہمارے دیہات خصوصاً باہم برسرپیکار جاگیرداروں کے علاقوں میں رائج ہے وہ یہ کہ اپنی یا اپنی ملازم عورتوں کو خود یا اپنے کارندوں سے جنسی تشدد کا نشانہ بنانے کے بعد قتل کرا دیا جاتا ہے اور اس کا مقدمہ اپنے مخالفین پر ڈال دیا جاتا ہے۔ اس طریقہ کو جاگیردارانہ حکمت عملی کا ایک آزمودہ اور مجرب نسخہ سمجھا جاتا ہے۔

عورت خصوصاً کمسن لڑکیاں عزت بے عزت اور معمولی لڑائی جھگڑوں کا بدلہ لینے کے لیے پسندیدہ شکار سمجھی جاتی ہیں۔ گزشتہ ماہ معمولی تلخ کلامی کا بدلہ لینے کے لیے گلشن راوی لاہور کے علاقہ جھگیاں شہاب دین میں چھ افراد نے ایک چودہ سالہ لڑکی فرحت بی بی کو اغوا کر لیا۔ ملزمان مغویہ کی ساتھ کئی روز زیادتی کرتے رہے۔ اس دوران ملزموں نے اسلحہ کے زور پر مغویہ سے جعلی نکاح نامہ پر دستخط کرا لیے۔ مغویہ کے والدین نے پولیس کو اغوا اور زنا کا مقدمہ درج کرنے کی درخواست دی لیکن مقامی پولیس نے مقدمہ درج کرنے سے انکار کر دیا۔ کہ ایس ایس پی لاہور کے حکم کے باوجود تھانہ نواں کوٹ پولیس نے مقدمہ درج نہ کیا تو عدالت عالیہ کے حکم پر ملزمان کے خلاف مقدمہ درج کیا گیا۔ لیکن ایف آئی آر لکھتے ہوئے جان بوجھ کر ایسا سقم رکھ دیا کہ ملزمان کو نقصان نہ پہنچے۔ پولیس نے مصری شاہ کے ایک گودام سے مغویہ کو برآمد کر لیا مگر تمام ملزموں کو تھانہ لا کر چھوڑ دیا۔ مغویہ کے لواحقین نے جب ملزمان کی رہائی کی شکایت ایس ایچ او سے کی تو اس نے ان کی بیٹی کو بھی گرفتار کرنے کی دھمکی دے دی۔

اسی طرح بے عزتی کا بدلہ لینے کا ایک اور واقعہ گزشتہ برس لاہور ہی کی نشتر کالونی پیش آیا۔ ایک شخص ولسن مسیح نے دو نوجوانوں کو لڑکیوں کو چھیڑنے سے منع کیا۔ ولسن کے بقول اس موقع پر دونوں نوجوانوں شہباز مسیح اور پطرس مسیح نے اسے دھمکی دی کہ وہ اسے بے عزتی کا مزہ چکھائیں گے۔ چند دن کے بعد انہوں نے ولسن مسیح کی ساتویں جماعت کی طالبہ بیٹی گلنار کو دن کے وقت گلی سے اغوا کر لیا۔ دونوں نوجوان اس کو ایک گھر میں لے گئے جہاں انہوں نے گلنار کی کنپٹی پر پستول رکھ کر اس کے ساتھ زبردستی زیادتی کی۔ دونوں کئی گھنٹے معصوم طالبہ کے ساتھ زیادتی کرتے رہے جب کہ ان کی بہنوں نے اونچی آواز میں

Marfat.com

ٹیپ ریکارڈر لگا دیا تاکہ بچی کا شور محلے دار نہ سن سکیں۔ پھر شام کے وقت ملزمان نے گلنار کو جسمانی تشدد کا نشانہ بنانا شروع کیا تو اس کا شور سن کر آس پاس کے گھروں کے لوگ اکٹھے ہوگئے تو ملزمان بے ہوش بچی کو چھوڑ کر فرار ہوگئے۔ ولسن کے مطابق وہ رپورٹ درج کرانے کے لیے مقامی پولیس اسٹیشن پہنچا تو پولیس اہلکاروں نے اسے دھکے دے کر تھانے سے باہر نکال دیا۔

کم عمر لڑکیوں سے جبری زیادتی کے بعد ان کے سفاکانہ قتل کا رجحان گزشتہ تین برسوں سے زور پکڑ گیا ہے۔ ایک سروے رپورٹ کے مطابق ۱۹۹۳ء میں اس قسم کے ۵۰ کے قریب واقعات ہوئے جب کہ ۱۹۹۴ء میں یہ تعداد بڑھ کر ۸۰ کے قریب ہوگئی اور مقتولین کے طبی معائنے کے بعد معلوم ہوا کہ ان کے ساتھ اجتماعی زیادتی کی گئی اور حالت غیر ہو جانے کے بعد انہیں بے دردی کے ساتھ قتل کر دیا گیا۔ اس نوعیت کی سنگین وارداتوں میں قتل ہونے والی معصوم لڑکیوں کی تعداد ۹۵ء میں سو سے زائد ہوگئی اور بعض مقامات پر ایسی لاشیں بھی ملیں جو قتل کے بعد جلا دی گئی تھیں۔ لاہور میں باٹا پور کے قریب ایک سولہ سالہ لڑکی کی لاش ملی جسے پوسٹ مارٹم اور فورنیزک رپورٹ کے مطابق اجتماعی زیادتی کے بعد قتل کیا گیا اور پھر اس کی لاش کو تیل چھڑک کر آگ لگا دی گئی۔ جب لاش مکمل طور پر جل گئی تو اسے کوڑے کے ڈھیروں پر پھینک دیا گیا جہاں کئی روز تک کتے اسے نوچتے رہے۔

نئے سال کے آغاز کے ساتھ اس نوعیت کی وارداتوں میں سفاکی کا عنصر بڑھتا گیا۔ سب سے بڑی واردات فیصل آباد شہر میں ہوئی جہاں ایک شخص نے مڈل سکول کی دو لڑکیوں کے ساتھ زنا بالجبر کیا اور جب لڑکیوں کی حالت غیر ہوگئی تو اس نے جرم چھپانے کے لیے دونوں لڑکیوں کو تیز دھار چھری کے ساتھ ذبح کر دیا۔ ملزم نے دونوں لاشیں بوری میں بند کیں اور گھر سے تھوڑی دور پھینک دیں۔

اسی طرح کی ایک اور لرزہ خیز واردات گزشتہ ماہ کے آخری ہفتہ سیالکوٹ کے علاقہ حاجی پورہ میں ہوئی۔ اس اندوہناک واردات میں سفاک قاتلوں نے ۱۴ سالہ اور ۷ سالہ دو نامعلوم بچیوں سے زیادتی کر کے انہیں بے دردی کے ساتھ قتل کیا۔ قتل کرنے کے بعد ملزمان نے مظلوم بچیوں کے جسم کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کیے اور انہیں سولہ عدد شاپنگ بیگز میں ڈال کر حاجی پورہ کے علاقہ میں مختلف مقامات پر گندگی کے ڈھیروں پر پھینک دیا۔ آوارہ کتوں نے لفافوں میں بند انسانی گوشت کے ان ٹکڑوں کو کھانا شروع کر

Marfat.com

دیا۔ سکول جاتے بچوں نے یہ منظر دیکھا تو مقامی لوگوں کو اطلاع دی۔ پولیس کے مطابق بچیوں کو زیادتی کے بعد قتل کیا گیا ہے، جب کہ کسی بھی شخص کو گرفتار نہ کیا جا سکا۔

"غیرت" کے نام پر عورتوں کے قتل کا رجحان اگرچہ بہت پرانا ہے۔ عموماً دیہات میں اس نوعیت کی زیادہ وارداتیں ہوا کرتی تھیں لیکن ان کی شرح تین چار فیصد سے آگے نہ بڑھتی۔ گزشتہ پانچ برسوں میں دیہات سمیت شہری علاقوں میں بھی غیرت کے نام پر قتل و غارت کا سلسلہ نہ صرف عورتوں تک محدود رہا ہے بلکہ اس میں مردوں کی ایک بڑی تعداد بھی قتل ہونے لگی ہے۔ انسانی حقوق کمیشن پاکستان، پاکستان میں کام کرنے والی عورتوں کی بہبود کے کئی ایک غیر سرکاری اداروں اور وزارت برائے ترقی خواتین کے اندازے کے مطابق پاکستان میں ہر سال قتل ہونے والی خواتین میں ۴۰ فیصد عورتیں غیرت کے نام پر قتل ہوتی ہیں۔ گزشتہ برس صرف پنجاب میں ڈیڑھ سو کے قریب عورتیں غیرت کی بھینٹ چڑھ گئیں جب کہ ان کے علاوہ تقریباً ۶۰ افراد بھی مارے گئے۔

تقریباً ایک ہفتہ پہلے گوجرانوالہ میں ایک ادویات فروش لال دین نے ناجائز تعلقات کے شبہ میں اپنی بیوی (چھ بچوں کی ماں) بہنوئی، ماموں زاد بھائی اور بہن کو قتل کر دیا۔ ملزم لال دین جو بسوں وغیرہ میں دوائیں بیچتا تھا اُسے شبہ تھا کہ اس کی بیوی نسرین اختر نے اس کے ماموں زاد بھائی الیاس سے ناجائز تعلقات استوار کر رکھے تھے۔ واردات کے روز مقتولہ اپنے عزیزوں کے ساتھ قریبی علاقے کھیالی گیٹ میں مجلس سننے گئی تھی کہ ملزم کو شبہ ہوا کہ وہ اپنے آشنا سے ملنے گئی تھی۔ ملزم گھر سے ۲۲۲ کی آٹومیٹک رائفل لی کر بسم اللہ چوک پہنچ گیا۔ اسی اثناء میں اس کی بیوی نسرین اختر اپنے عزیز و اقارب کے ساتھ کار میں سوار اس چوک میں پہنچی تو ملزم نے گاڑی پر فائر کھول دیا۔ ملزم کے اندازے کے برخلاف اس گاڑی میں عورت کا مبینہ آشنا محمد الیاس تو موجود نہیں تھا البتہ اس کا بھائی غلام عباس جو گاڑی چلا رہا تھا اس کے علاوہ ملزم کی بہن رافعیہ بہنوئی جاوید اقبال اور ملزم کی بیوی نسرین موجود تھی، فائرنگ سے یہ تمام لوگ موقع پر ہلاک ہوگئے۔

ایک اور واقعہ جو ۳۰ مئی ۹۶ء کو پیش آیا ریوارز گارڈن لاہور کے ایک شخص حسنین حیدر نے ناجائز تعلقات کے شبہ میں اپنی بیوی اور نو بیاہتا بیٹیوں ۱۸ سالہ سیدہ صباحت اور سولہ سالہ سیدہ سدرہ بتول کو اندھا دھند فائرنگ کر کے قتل کر دیا۔ کچھ عرصہ پہلے حسنین حیدر کی بیوی اور دونوں بیٹیاں گھر سے ناراض ہو کر چلی گئیں۔ ملزم نے ان کے اغوا کا مقدمہ درج کرا دیا پولیس نے عورتوں کو برآمد کیا تو انہوں نے عدالت میں ملزم کے

Marfat.com

خلاف بیان دیا کہ انہیں اغوا نہیں کیا گیا وہ اپنی مرضی سے گھر سے آئی ہیں۔ عدالت نے ان خواتین کو دارالامان بھجوا دیا۔ واردات کے روز ملزم نے اپنے ایک رشتہ دار کے ذریعے انہیں دارالامان سے نکلوایا اور گاڑی میں ہی فائرنگ کر کے ہلاک کر دیا۔

جنسی تشدد پسندی کو مردانگی کی شان سمجھنے والے جاگیرداروں اور اوباش امیرزادوں کی درندگی یا اپنے لواحقین کے ہاتھوں بھیانک موت سے دو چار ہونے کے علاوہ عورتوں کی ایک معقول تعداد پولیس ملازمین کی ہوس اور ظلم کا نشانہ بھی بنتی ہیں۔ مختلف نوعیت کے مقدمات میں زیر تفتیش عورتوں میں سے کئی آبرو ریزی کے ساتھ ساتھ تھانوں میں قتل بھی کر دی گئیں۔ اسی طرح کا ایک اندوہناک واقعہ گزشتہ دنوں لاہور کے نواحی تھانہ فیروز والہ میں پیش آیا جہاں ایک سترہ سالہ لڑکی کو مقامی پولیس گرفتار کر کے تھانے لے آئی۔ مقتولہ کے والدین کے بقول لڑکی کو دن کے وقت گھر سے گرفتار کیا گیا جب کہ پولیس کا موقف تھا کہ اس نے بدکاری کی اطلاع پر فوری ایکشن لیتے ہوئے آدھی رات کے وقت لڑکی کو گرفتار کیا اگلے دن اس لڑکی کی لاش تفتیشی افسر سب انسپکٹر کے کمرے میں پنکھے کے ساتھ لٹک رہی تھی۔ کمرے میں ایک بستر بچھا ہوا تھا' چوڑیاں ٹوٹی ہوئی تھیں اور ساتھ ہی ایک ٹیلی ویژن اور وی سی آر پڑا ہوا تھا۔ لڑکی کے لواحقین کے مطابق لڑکی کو جنسی زیادتی کے بعد پولیس ملازمین نے پھانسی دے دی جب کہ پولیس کے بقول لڑکی کو چونکہ رات کو گرفتار کیا گیا تھا اس لیے تھانہ میں بند کرنا پڑا۔ ایک تھانیدار نے اس کو اپنے کمرے میں بند کر دیا اور خود کمرے کے باہر چارپائی ڈال کر سو گیا۔ صبح جب کمرہ کھولا گیا تو لڑکی کی لاش پنکھے کے ساتھ جھول رہی تھی۔

ہمارے معاشرے میں زنا بالجبر کے رجحان کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ گزشتہ سال صرف پنجاب پولیس کو ۲۴۸۸ واقعات کی رپورٹیں درج کرائی گئیں جب کہ ۴۰ فیصد واقعات کی رپورٹ درج نہیں کرائی گئی اور اس کی بڑی وجوہات یہ تھیں کہ متاثرہ خواتین کے لواحقین نے بے عزتی کے ڈر سے پولیس سے رجوع نہ کیا یا پولیس کے ڈر کی وجہ سے ایسے معاملات کو دبا گئے یا پھر حدود آرڈیننس میں گواہوں کی غیر مناسب شرط کے تحت ایسا نہ کیا گیا کیونکہ اس میں متاثرہ عورت کا اپنا تحفظ بھی ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔

گزشتہ سالوں میں مٹی کے تیل کا چولہا عورتوں کے خلاف ایک موثر ترین ہتھیار رہا ہے۔ ایک جائزے کے مطابق گزشتہ سال ہر روز ایک عورت چولہا موت کا شکار ہوتی رہی اور ۹۰ فیصد سے زائد واقعات کی رپورٹ "خود کشی" یا حادثاتی موت کی ذیل میں درج

Marfat.com

ہوئی۔ وزارت ترقی خواتین کے اندازے کے مطابق ۸۰ فیصد خواتین اندرون خانہ تشدد کا شکار ہیں جن میں مرنے والیوں کی بڑی تعداد چولہے کے ذریعے مرتی ہے۔

لاہور میں گزشتہ برس کیے گئے ایک سروے کے مطابق ۴۰۰ سے زائد عورتیں چولہے سے جل گئیں یہ وہ واقعات تھے جن کی پولیس کو رپورٹ درج کرائی گئی۔ ۹۰ فیصد واقعات کی ایف آئی آر صرف اس عبارت پر مشتمل تھی کہ متوفیہ یا زخمی عورت چولہے پر کھانا پکا رہی تھی کہ اس کے ریشمی دوپٹے نے آگ پکڑ لی جس سے وہ جل مری یا شدید جھلس گئی۔ واضح رہے کہ چولہے کا شکار ہونے والی ان خواتین کی عمریں ۱۷ سے ۳۰ سال کے درمیان تھیں اور ان میں ۹۵ فیصد خواتین کی شادی کو چھ ماہ سے ۳۶ ماہ کا عرصہ ہوا تھا۔ مرنے والیوں کی اکثریت شادی کے وقت متاثر کن جہیز نہ لا سکی تھیں۔ ان میں ایسی خواتین کی بھی معقول تعداد شامل تھی جو شادی کے بعد اپنے والدین سے جائیداد میں سے حصہ وصول کرنے میں ناکام رہیں اور خاوند یا ساس اور نندوں کے ہاتھوں چولہے کی موت ماری گئیں۔

بڑے شہروں میں عورتوں کے جلائے جانے کی وارداتوں میں شدت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ گزشتہ برس صرف اسلام آباد اور راولپنڈی میں ۱۰۰ کے قریب خواتین کو انتہائی بے دردی سے جلا دیا گیا لیکن عورتوں کو زندہ جلانے کی وارداتوں میں ملوث افراد کی گرفتاریوں اور سزا پانے کی شرح ۱۰ فیصد سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ بعض وارداتوں کے بعد جب قانون نافذ کرنے والے اداروں کے افراد نے جائے واردات کا معائنہ کیا تو جس گھر میں کسی عورت کو مٹی کے تیل کے چولہے سے جلایا گیا تھا اس میں گزشتہ کئی برسوں سے گیس استعمال ہو رہی تھی اور جو چولہا استعمال کیا گیا تھا وہ بالکل نیا تھا اور اس کا پہلا استعمال ہی مظلوم عورت کے لیے جان لیوا ثابت ہوا تھا۔

گزشتہ سال دارالامان میں گھس کر یا دھوکے سے باہر بلوا کر عورتوں کو قتل کرنے کے علاوہ گزشتہ سال درجن کے قریب عورتوں کو عدالتوں اور کچہریوں کے احاطوں میں فائرنگ کر کے قتل کر دیا گیا۔ طلاق کے مقدمات کی شرح بہت بڑھ گئی اور اس دوران لڑائی جھگڑوں میں عورتوں کی ایک بڑی تعداد جان سے ہاتھ دھو بیٹھی، مثال کے طور پر صرف لاہور کی عدالتوں میں ۴ ہزار کے قریب طلاق کے مقدمات زیر سماعت تھے اور ان مقدمات میں شامل خواتین غیر یقینی صورت حال کا شکار تھیں۔

Marfat.com

سابقہ ایم پی اے کی "کارروائی"

"پنجاب کے ایک سابق ایم پی اے ارشد میتلا نے دو سال پہلے میری سات سالہ بچی کو جو اس کے گھر میں ملازم تھی' غائب کرا دیا۔ جس دن میری بچی غائب ہوئی' اسی صبح ارشد میتلا کا ایک پالتو ہرن مکان کی چھت سے گر کر زخمی ہوگیا۔ ارشد میتلا نے میرے پانچ سالہ بچے کو اس واقعہ کا ذمہ دار ٹھہرایا اور اس کے لیے سزا تجویز کی کہ جتنی بلندی اور جس چھت سے اس کا پیارا ہرن گرا ہے' وہیں سے اس "ملزم" بچے کو بھی گرایا جائے۔ بچہ جو صبح سے ارشد میتلا کی حویلی میں قید تھا' اس کو شام کے وقت چھت پر لے جا کر بے دردی کے ساتھ نیچے گرا دیا گیا۔ بچے کی ٹانگ اور بازو ٹوٹ گیا۔ اسی حالت میں میرے معصوم بچے کو ارشد میتلا کے ملازم میرے سامنے صحن میں پھینک گئے۔ رات گزرنے لگی لیکن میری بچی گھر واپس نہ پہنچی تو مجھے فکر لاحق ہوئی۔ میں ارشد میتلا کی حویلی گئی تو مجھے بتایا گیا کہ بچی تو آج آئی ہی نہیں۔ اگلے روز میرے شوہر کے خلاف ایک جھوٹا مقدمہ درج کرایا گیا اور ارشد میتلا کے آدمیوں نے ہمیں گاؤں سے نکال دیا۔ وہ دن اور آج کا دن ہے ہمیں ہماری معصوم بچی نہیں ملی۔ مجھے مکمل یقین ہے کہ اسے زیادتی کے بعد قتل کر دیا گیا ہے"۔

یہ ہولناک انکشاف رواں سال پی ٹی وی کے ایک پروگرام "حوا کے نام" میں اس معصوم لڑکی کی والدہ نے کیا۔ واضح رہے کہ ارشد میتلا کئی بار اعلیٰ عدالتوں میں یہ وعدہ کر چکا ہے کہ اس کو اگر کچھ مہلت دی جائے تو وہ لڑکی کو واپس کر دے گا لیکن یہ وعدہ کبھی پورا نہیں ہو سکا۔ کوئی بھی عدالت اور پولیس اس سے لڑکی کو برآمد نہیں کر سکی۔ وجہ یہ ہے کہ ارشد میتلا ایک بااثر سیاست دان اور بہت بڑا زمیندار ہے اور ماضی کے واقعات کو دیکھتے ہوئے یہ آسانی کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اس کے اثر و رسوخ کے سامنے عدالتیں اور دیگر انتظامی ادارے بے بس ہیں۔

Marfat.com

زرداری کی پنجاب میں "کارروائی" اور گھپلے

محترمہ بے نظیر بھٹو کے خاوند آصف علی زرداری کی پنجاب میں مداخلت اور کرپشن کے بارے میں اگرچہ ابھی تک نگران حکومت کچھ بھی منظر عام پر نہیں لا سکی اور نہ ہی اس کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ حکومت ایسا کیوں کر رہی ہے۔ البتہ جو اعداد و شمار اور انکشافات پنجاب کے حوالے سے میرے سامنے آئے ہیں میں انہیں بلا کم و کاست یہاں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ محترم آصف علی زاداری جو پورے تین سال اپوزیشن اور ملکی اخبارات کے مطابق کرپشن کے بے تاج بادشاہ رہے اور جو بے نظیر کی گزشتہ حکومت میں مسٹر ۱۰ پرسنٹ تھے اور ۹۳ء میں بننے والی حکومت میں مسٹر ۳۰ پرسنٹ بن گئے۔ پنجاب میں ان کا خطرناک ترین کام جو فاروق احمد خان لغاری جیسی شخصیت کو بھی ناراض کرنے کا موجب بنا وہ صدر مملکت فاروق احمد لغاری کے صاحبزادے اویس لغاری کی فائل تھی۔ جناب آصف علی زرداری نے جو اپنے مخالفین کو زک پہنچانے کے لیے ہر نوعیت کا حربہ اختیار کرنے کے ماہر مشہور تھے انہوں نے معتدل مزاج اور کسی حد تک صبر کا مظاہرہ کرنے والے صدر فاروق احمد لغاری کو "بلیک میل" کرنے کے لیے پنجاب کے سینئر وزیر ملک مشتاق اعوان، محترمہ بے نظیر بھٹو کی پولیٹکل سیکرٹری مس ناہید خان اور آئی بی کے ڈائریکٹر جنرل مسعود شریف سے مل کر لاہور میں رہائش پذیر فاروق لغاری کے بیٹے اویس لغاری کے بارے میں آئی بی میں یہ فائل کھلوائی کہ اویس لغاری مکران کے ساحل اور سرحد کے علاقہ غیر سے سمگل ہوئی اور ملک کے دور دراز حصوں سے چھینی گئی پیجیرو، لینڈ کروزر اور نسان پٹرول گاڑیوں کو پنجاب لا کر دباؤ کے تحت رجسٹرڈ کراتے اور پھر بھاری معاوضے وصول کر کے بیچ دیتے۔ مسعود شریف کی براہ راست نگرانی میں تیار ہونے والی اس فائل میں جو اندراج کیا گیا انتہائی باخبر ذرائع کے مطابق اس میں اویس لغاری کے بارے میں تحریر تھا

Marfat.com

کہ وہ ہر ماہ پندرہ سے اٹھارہ قیمتی گاڑیاں پنجاب میں لاتے اور رجسٹرڈ کرانے کے بعد بیچ دیتے۔ کسی نہ کسی طرح اس فائل کی بھنک صدر فاروق احمد خاں لغاری کے کانوں میں بھی پڑ گئی۔

پنجاب حکومت کے تعینات کردہ ایک اعلیٰ بیوروکریٹ نے ایک رات مجھے فون کر کے پوچھا کہ تم اپنے اخبار میں ایک خبر لگا سکتے ہو' لیکن چند لمحوں کے بعد انہوں نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا کہ یہ "فون محفوظ" نہیں۔ اگلی صبح میں اس آفیسر کے دفتر پہنچا تو اس نے یہ کہانی سنا دی اور آئی بی کی تیار کردہ فائل کے سیریل نمبرز تک لکھوا دیے۔ میں نے دفتر لوٹ کر اپنے ایڈیٹر خالد احمد سے اس سٹوری کے بارے میں بات کی تو انہوں نے مجھے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ اخبار کا مالک اس سٹوری کو نہیں چھاپ سکتا۔ بلکہ پنجاب میں کوئی بھی ایڈیٹر اس کہانی کو ان نازک حالات میں نہیں چھاپے گا خواہ تم فائل ہی کیوں نہ اس کے سامنے رکھ دو۔ میں حیدر آباد سے شائع ہونے والے ایک سندھی اخبار "روزنامہ سندھ" میں پنجاب کی سیاسی ڈائری لکھتا تھا چنانچہ میں نے پنجاب کی بگڑتی ہوئی سیاسی صورت حال' صدر اور پیپلز پارٹی کے تعلقات کے تناظر میں اس کہانی کا ذکر کر دیا۔ اگلے روز "روزنامہ سندھ" نے جلی سرخیوں میں یہ خبر لگائی لیکن اس کی کوئی تردید سامنے نہ آ سکی۔ بعد میں یہ ثابت ہو گیا کہ اویس لغاری خود تو یہ کام نہیں کرتے تھے لیکن ان کے دوستوں میں شامل بعض لوگ اس نوعیت کے کاروبار میں ملوث تھے۔ لیکن آصف علی زرداری نے مسعود شریف اور مشتاق اعوان سے مل کر اویس لغاری کی فائل تیار کر لی تاکہ صدر فاروق لغاری کو "بوقت ضرورت" پیش کی جا سکے۔

آصف علی زرداری کی طرف سے پنجاب میں مداخلت اور پنجاب پر اپنا ہر نوعیت کا تسلط قائم رکھنے کی خواہش کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ۱۹۹۳ء میں پیپلز پارٹی کی حکومت قائم ہونے کے بعد جہاں مس ناہید خان کے ذریعے پنجاب کے معاملات میں داخل ہونا شروع کیا وہاں صوبائی دارالحکومت سے ۱۲ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ایک قصبہ برج اٹاری کے نواح میں حکومت پنجاب کے ایک وسیع و عریض جنگل نورے والا جنگل پر قبضہ کرنے کے لیے اپنے پولیٹیکل سیکرٹری اور ذاتی دوست طاہر خان نیازی کو کھلی چھٹی دے دی۔ آصف علی زرداری کے دوست طاہر خان نیازی نے آئی بی کے ڈائریکٹر جنرل مسعود شریف' سینئر وزیر ملک مشتاق اعوان' ڈی آئی جی سپیشل برانچ طارق لودھی اور وفاقی وزیر غلام مصطفیٰ کھر کی مدد سے نورے والا جنگل پر قبضہ کر لیا اور پہلے پہل اپنے عزیز فضل

Marfat.com

الرحمٰن نیازی کی تین مربع اراضی پر قبضہ کیا اور بعد میں مقامی لوگوں کی زمینوں کی طرف رجوع کر لیا۔ طاہر خان نیازی نے جنگل کے عین وسط میں ایک ہیلی پیڈ تعمیر کرایا اور تقریباً تین ایکڑ پر اگا گھنا جنگل کاٹ کر آصف علی زرداری کے گھوڑوں کے لیے شیڈ کی تعمیر شروع کرا دی۔ طاہر خان نیازی جن کے پاس سینکڑوں مسلح افراد کی جماعت تھی انہوں نے مقامی دیہات نورے والا' پنڈ نورے والا ٹبہ اور بنسی نگر کے لوگوں کو اکٹھا کیا اور ان کو ۱۹۷۱ء میں بھٹو کی زرعی اصلاحات کے دوران کی الاٹ کردہ زمینوں کے جعلی ملکیتی کاغذات پر دستخط کرنے کا حکم دیا۔ غریب لوگوں کی بڑی تعداد نے اس موقع پر طاہر خان نیازی کے تیار کردہ کاغذات پر دستخط کر دیے لیکن چند افراد نے اس موقع پر احتجاج کرنے کی جسارت کی۔ احتجاج کرنے والوں میں شامل ایک نوجوان شوکت ولد نواب دین کو طاہر خان نیازی کے مسلح آدمیوں نے گولیاں مار دیں اور درجن کے قریب افراد کو اٹھا کر جنگل میں لے گئے۔ ان افراد کو ایک ہفتہ تک جنگل میں باندھ کر رکھا گیا اور شدید تشدد کا نشانہ بنایا جاتا رہا۔

۱۹۹۴ء میں آصف علی زرداری نے ملک مشتاق اعوان اور ناہید خان کے ہمراہ نورے والا جنگل کا دورہ کیا۔ آصف علی زرداری ہیلی کاپٹر کے ذریعے نورے والا جنگل پہنچے تھے۔ آصف علی زرداری کی آمد کے فوری بعد آئی بی کے سربراہ ڈائریکٹر جنرل مسعود شریف' ڈی آئی جی سپیشل برانچ طارق لودھی اور ایس ایس پی شیخوپورہ بھی نورے والا جنگل میں پہنچ گئے۔ تقریباً دو گھنٹے بعد چالیس بڑی گاڑیوں کا ایک قافلہ سڑک کے ذریعے برج اٹاری سے ہوتا ہوا نورے والا جنگل پہنچا۔ گاڑیوں میں سوار افراد جدید ترین خودکار ہتھیاروں سے مسلح تھے اور انہوں نے اپنے چہرے چھپا رکھے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ افراد بلوچستان کے نواب اکبر بگٹی کے مفرور دشمن قربان بگٹی کے ساتھی اور کلپر قبیلے سے تعلق رکھنے والے بلوچ تھے۔ واضح رہے کہ ان بلوچوں نے ملتان میں معمولی تکرار کے بعد اندھا دھند فائرنگ کر کے پانچ مقامی افراد کو قتل کر دیا تھا۔ نواب اکبر بگٹی کے بیٹے اور پوتوں کے قاتل یہ افراد جو بگٹی اور کلپر قبیلوں سے تعلق رکھتے تھے پناہ کی غرض سے آصف علی زرداری کی وساطت سے نورے والا پہنچے تھے۔ شام کو آصف علی زرداری' مشتاق اعوان اور ناہید خان ہیلی کاپٹر کے ذریعے اسلام آباد واپس چلے گئے جبکہ بلوچ "مہمانوں" نے مستقل طور پر نورے والا جنگل میں ڈیرے ڈال دیے۔

اس کے فوری بعد آصف علی زرداری نے گورنر ہاؤس لاہور میں گورنر راجہ سروپ کی موجودگی میں لاہور کے ایس ایس پی کو حکم دیا کہ وہ ان "بلوچ مہمانوں" کا خاص

خیال رکھیں۔ ساتھ ہی آصف علی زرداری نے وزیر اعلیٰ سردار عارف نکئی کو ہدایت کی کہ وہ ہر ماہ حکومت پنجاب کی طرف سے ڈیڑھ کروڑ روپیہ ان بلوچ مہمانوں کی بہبود کے لیے دیا کریں۔ واضح رہے کہ ذرائع کے مطابق پنجاب حکومت نے تقریباً ۲۰ کروڑ روپیہ ان بلوچوں کی بہبود کے لیے آصف علی زرداری کی ہدایت پر ادا کیا۔ جب کہ بلوچ مہمان طاہر خان نیازی کے نورے والا جنگل میں پناہ گزین رہے۔ جہاں یہ لوگ مقامی غریب دیہاتیوں کے مویشی پکڑ کر ذبح کر لیتے۔

اس دوران سب سے المناک واقعہ یہ ہوا کہ ان بلوچ مہمانوں نے مقامی دیہات کی چار لڑکیوں کو ان کے گھروں سے اٹھا لیا اور کئی دن تک زیادتی کرنے کے بعد چھوڑا۔ بلوچ سرداروں کے ہاتھوں رسوا ہونے والی ان لڑکیوں میں نورے والا پنڈ اور بنی نگر کے غلام نبی ڈوگر کی بیٹی اللہ رکھی' شبیر ڈوگر کی بیٹی کوثر' غفور ڈوگر کی بیٹی غفوراں اور بلو ڈوگر کی بہن بخشی وغیرہ شامل تھیں۔ جب بلوچ سرداروں نے ان خواتین کو ان کے گھروں سے اٹھایا اور جنگل میں لے گئے تو ان کے لواحقین مقامی پولیس تھانہ فیکٹری ایریا میں گئے لیکن تھانہ میں تعینات اے ایس آئی اکرم نے انہیں حوالات میں بند کر دیا اور خود نورے والا جنگل چلا آیا۔

مقامی لوگوں کے مطابق گزشتہ سال جنوری میں ایک دن ہیلی کاپٹر کے ذریعے ۱۰ کے قریب افراد کو آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر نورے والا جنگل لایا گیا جہاں تقریباً ایک ہفتہ تک ان افراد پر تشدد ہوتا رہا۔ مقامی لوگوں کے مطابق اغوا ہو کر آنے والوں کا تعلق اندرون سندھ سے تھا اور ان کو آصف علی زرداری کے حکم پر یہاں لایا گیا تھا۔

بلوچوں اور طاہر خان نیازی نے محکمہ جنگلات کا ملکیتی جنگل کاٹ لیا اور اس کی تمام لکڑی لاہور اور دوسرے شہروں میں بیچ دی۔ اس وقت بھی لاہور کی نواحی بستی کوٹ عبدالمالک میں شریف کھوجی نامی ایک آرے والے کے پاس نورے والا جنگل سے کاٹی گئی لکڑی کی ایک بہت بڑی مقدار پڑی ہے۔ اس کے بعد طاہر خان نیازی اور آصف علی زرداری نے نورے والا جنگل میں بیس کے قریب کوئلہ تیار کرنے والی بھٹیاں تعمیر کرا دیں جن کے ذریعے کوئلے کی ایک بھاری مقدار تیار ہو کر دوسرے شہروں کو بھیجی جانے لگی۔ ذرائع کے مطابق آصف علی زرداری اور طاہر خان نیازی نورے والا جنگل میں ہندوستان سمگل کی جانے والی قیمتی اشیاء کا ذخیرہ کرتے اور پھر یہیں سے ان کے ملازمین نارنگ منڈی کی سرحد سے انتہائی قیمتی مال کی بھاری مقدار ہندوستان کو سمگل کرتے۔ اس کے علاوہ ہیلی

Marfat.com

کاپٹر کے ذریعے نورے والا جنگل میں ہیروئن اور دیگر اشیاء کی کھیپ پہنچی رہتی۔

گزشتہ تین برسوں میں زرداری گروپ کے ممبران' وفاقی کابینہ کے اکثر ممبران سے زیادہ با اثر اور طاقتور تصور کیے جاتے تھے۔ معزول وزیراعظم بے نظیر بھٹو نے دوسری مرتبہ وزارت عظمیٰ کا حلف اٹھاتے ہوئے اعلیٰ عہدوں پر فائز بیوروکریٹس کو یہ حکم صادر فرمایا تھا کہ ان کے شوہر نامدار آصف علی زرداری اور بدین سے منتخب ہونے والے رکن قومی اسمبلی ذوالفقار اے مرزا کی جانب سے جاری ہونے والے "زبانی احکامات" کو ہی کافی جانا جائے اور انہیں بغیر کسی تاخیر کے پایہ تکمیل تک پہنچایا جائے۔

عبوری حکومت کے ہاتھ لگنے والی دستاویزات سے پتہ چلا ہے کہ وزارت فنانس نے بینکوں اور ترقیاتی مالیاتی اداروں میں اعلیٰ عہدوں پر تعیناتیوں کے ضمن میں ایک خاموش تماشائی سے بڑھ کر اور کوئی کردار ادا نہ کیا۔ سابق وزیر مملکت برائے فنانس مخدوم شہاب الدین نے نجی محفلوں میں اس امر کی تصدیق کی انہیں یونس ڈالیا کی تعیناتی بطور صدر حبیب بینک لمیٹڈ' ایم بی عباسی کی تعیناتی بطور صدر نیشنل بینک آف پاکستان' اسد اللہ شیخ کی نامزدگی بطور چیئرمین این آئی ٹی' منور چوہدری کا چناؤ بطور چیئرمین این ڈی ایف سی' خالد اقبال کی تعیناتی بطور سربراہ بی ای ایل اور بعد ازاں چیئرمین این ڈی ایف سی سے متعلق پہلے سے مطلع کرنا ضروری نہ سمجھا گیا تھا۔

مخدوم شہاب الدین اور سابق مشیر برائے وزیراعظم وی اے جعفری نے علیحدہ علیحدہ اس امر کی تصدیق کی کہ درج بالا افراد آصف زرداری کی ذاتی پسند تھے اور ان کی تقرریاں سیکرٹری اسٹیبلشمنٹ نے آصف زرداری کے "زبانی احکامات" کے تابع کی تھیں۔

جناب زرداری کے متعلق یہ بھی تصور کیا جاتا ہے کہ انہوں نے عثمان فاروقی کی تعیناتی بطور چیئرمین پاکستان اسٹیل' ایڈمرل (ر) اکبر ایچ خان کی تعیناتی بطور چیئرمین کراچی پورٹ ٹرسٹ' منیر باری کی بطور سربراہ ٹیکسٹائل کوٹہ مینجمنٹ ڈویلپمنٹ اور ظہیر خان کی تعیناتی بطور چیئرمین سٹیٹ لائف کے احکامات بھی پاس کیے تھے۔

معزول وزیراعظم کے شوہر نامدار کا ڈائریکٹر جنرل انٹیلی جنس بیورو مسعود شریف کی تقرری کے پیچھے بھی ہاتھ تھا۔ اس فیصلے نے ایوان صدر اور دوسرے طاقتور حلقوں میں تشویش کی لہر دوڑا دی تھی کیونکہ مسعود شریف براہ راست آصف زرداری کو رپورٹ پیش کرتا تھا۔

ان اداروں میں کہ جہاں زرداری کے چہیتوں نے چارج سنبھالے' بہت جلد ناقص

نظم و ضبط اور بے مہار کرپشن کے قصے زبان زدعام ہوگئے۔ پاکستان سٹیل، کے پی ٹی، آر ای سی پی، بینکوں اور ڈی ایف آئی جیسے اداروں میں کرپشن کے بڑھتے ہوئے رجحانات کے تحت لاکھوں کروڑوں روپے کے جعلی سودے دنوں میں ہوتے ہوئے دکھائی دیے گئے۔ لیکن یہ بدنصیب ادارے وزیراعظم ہاؤس کی جانب آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرات نہ کر سکتے تھے۔

بدین سے منتخب ہونے والا رکن قومی اسمبلی ذوالفقار مرزا، آصف زرداری کے بعد حکومتی معاملات میں سب سے زیادہ موثر اور طاقتور تصور ہوتے تھے۔ یہ موصوف بنکریو اور مرزا شوگر ملز کے معاملات کی جانچ پڑتال پر متعین تھے جہاں ان کے اپنے خاندانی حصص تو کم تعداد میں تھے لیکن زیادہ تر حصص ان کے آقا اور دوست آصف زرداری کے تھے۔ آر ای سی پی اور ٹی سی پی میں بعض سرکاری ذرائع کے مطابق روزمرہ کی استعمال کی اشیاء کی خرید و فروخت کے ضمن میں ذوالفقار مرزا کا کہا حرف آخر تصور کیا جاتا تھا۔ وزیر تجارت احمد مختار کا حکم ذوالفقار مرزا کے کہے کے سامنے بے معنی تصور کیا جاتا تھا۔ اس امر کے شواہد بھی موجود ہیں کہ اس نے آر ای سی پی اور ٹی سی پی کے سودوں کے ضمن میں غیر ملکی پارٹیوں سے مذاکرات بھی کیے۔ مرزا کو کے پی ٹی کے معاملات میں خصوصاً زمین کے لین دین کے سودوں میں انتہائی موثر خیال کیا جاتا تھا۔ یہ حضرت آئل اینڈ گیس ڈویلپمنٹ کارپوریشن کے معاملات میں بھی خصوصی دلچسپی کا مظاہرہ کرتے رہے۔

جب کراچی میں دو اسٹیٹ ڈویلپرز کو مجبور کیا گیا کہ وہ اپنی کمرشل لینڈ، جس کی کل مالیت کم و بیش ساٹھ کروڑ کے لگ بھگ بنتی تھی سولہ کروڑ میں فروخت کر دیں تو اس دوران کراچی کے ایک اور کامیاب اسٹیٹ ڈیلر اقبال میمن کا نام منظر عام پر آیا۔ ان دو مجبور فروخت کنندگان کے بارے میں بتایا گیا کہ انہوں نے اعلیٰ حکام کو اس امر سے بھی آگاہ کیا کہ کس طرح اسلام آباد کی ایک وی آئی پی شخصیت نے جو اقبال میمن کو اپنے فرنٹ مین کے طور پر استعمال کر رہی تھی، انہیں زمین فروخت کرنے پر مجبور کیا۔ اقبال میمن کا نام اسلام آباد میں بھی بہت سے ترقیاتی منصوبوں کے سودوں کے پس منظر میں سامنے آیا جہاں سی ڈی اے کے اعلیٰ حکام، اقبال میمن کی "پہنچ" سے خوب اچھی طرح آگاہ تھے۔

بے نظیر بھٹو کی کابینہ میں وزیر مواصلات کی عدم موجودگی کے سبب جاوید پاشا، آصف زرداری کا دوست، اس وزارت میں واحد کرتا دھرتا تھا۔ پی پی پی کے پورے دور اقتدار میں وزارت مواصلات کا اسلام آباد میں واقع وی آئی پی گیسٹ ہاؤس جاوید پاشا کی

Marfat.com

نا جگاہ بنا رہا۔ وزارت مواصلات جس نے بے نظیر کے سابقہ دور حکومت میں اسے پیجر سروس کا اجازت نامہ فراہم کر رکھا تھا' اس بار ایم ڈی ایس سروس کا لائسنس "تحفتا" پیش کیا۔ اس سروس کے تحت اے ایف ایم ریڈیو اسٹیشن' ایک پرائیویٹ کیبل ٹی وی چینل اور سیلولر فون سروس کے لائسنس جاری کیے گئے۔

ستار کیریو' جو نواب شاہ کے قریب سکرنڈ شوگر ملز کے معاملات کا نگران تھا' اندرون سندھ میں غیر کاشت شدہ زمین کے کئی حصے اپنے نام الاٹ کروا چکا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ غنی انصار کی انصر شوگر ملز کے مالیاتی معاملات میں بھی ملوث تھا۔ مختلف بینکوں اور نج کاری کمیشن نے تفصیل سے بیان کیا ہے کہ کس طرح ستار کیریو ان کے معاملات میں دخل اندازی کرتا تھا۔ کرپٹ افسران کی اعلیٰ عہدوں پر تعیناتی کے حوالے سے بھی ستار کیریو کا نام بہت اثر و رسوخ کا حامل جانا جاتا تھا۔

زرداری گروپ میں کراچی کی آغا سپر مارکیٹ کا فرید ویرنی بھی شامل تھا جس نے سول ایوی ایشن اتھارٹی اور سندھ پولیس کی طرف سے آرمز پرسانل گاڑیوں کی خرید و فروخت کے معاملے میں غیر ضروری حد تک دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ اس کے علاوہ نوید ملک بھی ایوی ایشن کے معاملات میں دلچسپی رکھتا تھا۔ اس کے بارے میں باور کیا جاتا ہے کہ پی آئی اے کی جانب سے سنگاپور ایئر لائن سے پرانے بوئنگ طیاروں کے خریداری کی خواہش کے پیچھے اسی کا ہاتھ تھا۔ نوید ملک لاہور ایئرپورٹ پر ایک ٹرمینل کی تعمیر میں بھی دلچسپی رکھتا تھا۔

شون گروپ کا ناصر حسین بھی آصف زرداری کے ذاتی دوستوں میں سے تھا۔ برسراقتدار آتے ہی بے نظیر حکومت نے شون گروپ کو ایک بینک کے قیام کی اجازت دی۔ اس کے علاوہ شون گروپ نے دوسرے ایکسپورٹروں کے مقابلہ میں گارمنٹس کی فروخت پر بھی ایک محفوظ گرفت قائم کر لی تھی۔

ایم سی بی کا صدر حسین لوائی بھی ان دونوں میاں بیوی کا ایک اہم مشیر رہا۔ جب دوبئی میں مقیم اس کے ایک پاکستانی دوست عبدالرزاق کو پاکستان میں سونا درآمد کرنے کی اجازت دی گئی تو بہت کم لوگوں کو اعتراض کا موقع مل سکا۔ میاں محمد منشاء جو ایم سی بی کے مفاد کو نقصان پہنچاتا رہا۔ متضاد سودے بازیوں کے سبب' برلن کی ایک تنظیم ٹرانسپرنسی انٹرنیشنل نے بے نظیر انتظامیہ کے دوسرے تین سالہ اقتدار کے دوران پاکستان کو دنیا بھر میں دوسرے نمبر پر کرپٹ ملک گردانا۔ اس برس ستمبر میں ورلڈ بینک سے ملحق واشنگٹن میں

Marfat.com

ایک تنظیم نے پاکستان کو کرپشن کے اعتبار سے تیسرے نمبر پر قرار دیا۔

کراچی میں ایک شوگر مل کا فنانس مینجر مختلف کارپوریشنوں اور تنظیموں جو کہ حکومت کے تحت سرگرم عمل تھیں' سے آصف علی زرداری کے لیے ہر ماہ لاکھوں روپے اکٹھے کرتا تھا۔ اسی طرح پاکستان سٹیل مل کے دو افسران نے خفیہ طور پر جو گفتگو ریکارڈ کی اس کے مطابق جعلی سودوں کی آڑ میں مرد اول کے نام پر عثمان فاروقی کروڑوں اکٹھے کر کے دوبئی کے ایک بنک میں منتقل کرنے میں مشغول تھے۔ ۴ جولائی کو سابق وزیر اعلیٰ سندھ سید عبداللہ شاہ نے ایک صفحے پر مشتمل ایک درخواست کو قبول کرتے ہوئے کراچی کی ایک خاتون گلنار بانو کو ۱۶ لاکھ ۳۶ ہزار مربع گز زمین ڈیفنس سوسائٹی کراچی میں ایک کروڑ ۷۰ لاکھ کے عوض منتقل کر دی جب کہ کھلی مارکیٹ میں اس کی قیمت ۸۰ کروڑ کے لگ بھگ تھی۔ سابق وزیر اعلیٰ سندھ کے ایک ذاتی دوست نے بتایا کہ "شاہ صاحب کو اس الاٹمنٹ کے احکامات براہ راست آصف علی زرداری سے موصول ہوئے تھے"۔

۲۱ اپریل ۱۹۹۴ء بروز جمعرات کو احمد خان اور پانچ دیگر حضرات کو سیکرٹری لینڈ یوٹیلائیزیشن حکومت سندھ' رمیش ایم پریش کا ایک حکم نامہ وصول ہوا جس کے تحت انہیں ڈسٹرکٹ ملیر میں ۱۰ لاکھ گز زمین ایک کروڑ روپے کے عوض الاٹ کی جا رہی تھی۔ جب کہ اس کی اصل قیمت ۶۵ کروڑ کے لگ بھگ تھی۔ اسی قسم کی ایک اور الاٹمنٹ میں چار لاکھ مربع گز پر مشتمل کورنگی کے صنعتی علاقے میں واقع زمین محض ۴۰۰۰۰ روپے کے عوض الاٹ کی گئی حالانکہ کھلی نیلامی میں یہی زمین ۴۰ کروڑ روپے سے زائد کی کل مالیت میں نکل سکتی تھی۔ مولانا فضل الرحمٰن کی سفارش پر صائمہ بلڈرز کو آئی آئی چندریگر روڈ پر ۱۸ منزلہ ایک کمرشل ٹاور کی تعمیر کی اجازت ملنا بھی معجزہ تصور کیا جاتا ہے۔ شہر کے پائے کے سٹیٹ بروکرز کے مطابق اس پراجیکٹ کی تعمیر کے لیے کم از کم ۱۱۰ کروڑ روپے کا خرچ ضروری تھا۔ اسی قسم کی چھوٹ گلیکسی بلڈرز اور چند دیگر کنسٹرکشن کمپنیوں کی بھی عنایت کی گئی تھی۔ جن دنوں سابق وزیراعظم بے نظیر بھٹو ملک سے کلاشنکوف کلچر کے خاتمے کا زور و شور سے ڈھنڈورا پیٹ رہیں تھیں' ان کے شوہر آصف زرداری نے ۴۰ مہلک ہتھیاروں کے لائسنس حاصل کر کے ایک ریکارڈ قائم کیا۔ اپریل ۱۹۹۴ء میں وزیر داخلہ نصیر اللہ بابر کی جانب سے ایک ہی وقت میں آتشیں اسلحہ کے جاری ہونے والے لائسنسوں میں جی تھری رائفل بھی موجود تھی جو افواج پاکستان میں سٹینڈرڈ ہتھیار کے طور پر استعمال ہوتی ہے اور اس کے علاوہ ایم پی فائیو آٹو میٹک رائفل' سولہ اے ٹو اور پی پی رائفلز وغیرہ بھی شامل

Marfat.com

تھیں۔

ادھر آصف زرداری درجنوں میں اسلحہ کے لائسنس اپنے نام پر حاصل کرنے میں مشغول تھے تو ادھر ان کی اہلیہ نے حکم نامہ جاری فرمایا کہ ایک عدد ڈیوٹی فری مرسڈیز 600-1 فوری طور پر درآمد کی جائے۔ اگرچہ اس میں ڈیوٹی فری گاڑی پر بھی محترمہ کم از کم ۲ فیصد سیلز ٹیکس اور ایک فیصد فلڈ ریلیف سرچارج ادا کرنے کی پھر بھی پابند تھی مگر سی بی آر کو احکامات صادر کیے گئے کہ ان چارجز کو بھی ختم کر دیا جائے۔ یہ ڈیوٹی فری مرسڈیز محترمہ کو ۱۰۰۰۰۰ امریکی ڈالر میں پڑتی تھی جو کہ ایک برس میں صرف ۳۲۶۸۰ روپے انکم ٹیکس ادا کرتی ہیں۔

محترمہ کے پاس مرسڈیز کی خریداری کے لیے مطلوبہ رقم تو ضرور ہوگی لیکن اس برس فروری میں عمرہ کے اخراجات کی ادائیگی کے لیے البتہ ان کے پاس رقم موجود نہ تھی اور اس موقع پر چارٹرڈ طیارے کی پرواز کے علاوہ ریاست پاکستان کو ۶۹۵۰۰۰ روپے ادا کرنے پڑے اور ڈرائیوروں اور ویٹروں کی بخشش مبلغ ۱۷۵۰۰ اس کے علاوہ تھی اور سرکاری دستاویزات کے مطابق خاتون اول نے اپنے ۲۷ عزیزوں اور دوستوں کی رفاقت میں یہ مذہبی فریضہ ادا کیا۔ کرپشن کے ریکارڈ گزشتہ برس اس وقت ایک مرتبہ پھر انتہا کو پہنچ گئے جب بے نظیر نے ایک فرانسیسی کمپنی سے مبلغ ۹۵۰ ملین ڈالر کے عوض تین آگوسٹا نائن بی آبدوزیں خریدیں۔ عوام اور اپوزیشن کے پرزور مطالبے کے باوجود محترمہ بے نظیر بھٹو نے اس معاملے کو پارلیمنٹ میں بحث کے لیے پیش نہ کیا۔ ان تین آبدوزوں کے لیے پاکستان کو جو دنیا بھر میں غریب ممالک کی فہرست میں ایک سو اٹھائیسویں نمبر پر ہے، چھ ارب روپے فرانسیسی کمپنی کو ادا کرنے پڑے۔ اس سمجھوتے پر دستخط کرنے کی جلدی میں بے نظیر بھٹو نے ممتاز ماہرین اقتصادیات کی اس تجویز کو بھی پس پشت ڈال دیا جس کے مطابق اس مجموعی رقم سے حکومت پاکستان ایک برس میں ۱۲۰۰۰ سکول تعمیر کر سکتی تھی۔ ۲۰۰۰۰۰ اساتذہ کو روزگار مہیا کیا جا سکتا تھا اور ۴ ملین بچوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا جا سکتا تھا اور اگر حکومت پاکستان اسی رقم کو صحت کے شعبے میں خرچ کرتی تو ۱۰۰۰۰ بستروں پر مشتمل ۱۰۰ ہسپتالوں تعمیر کیے جا سکتے تھے، جو تمام ضروری سامان سے لیس ہوتے اور جہاں لاکھوں غریب انسانوں کو مفت تعلیمی سہولیات مہیا کی جا سکتی تھی۔ ان تین آبدوزوں کی خریداری کے ضمن میں پاکستان اور فرنچ حکام میں معاہدے پر دستخط کے بعد ہی اندرون اور بیرون ملک اخبارات میں پاکستان کے شاہی جوڑے کی جانب سے فرانس میں

Marfat.com

جائیداد کی خریداری سے متعلق خبریں شائع ہوئی تھی۔ کمیشن کی وصولی نے اس وقت ایک بار پھر سر اٹھایا جب جلدی سے تبدیل کی جانے والی سنٹرل بورڈ آف ریونیو کی ایک ٹیم نے اپنے سے پہلے تعینات افراد کے مدلل اعتراضات کو رد کرتے ہوئے سوئٹزرلینڈ سے تعلق رکھنے والی ایس جی سی اور کوٹیکنا نامی کمپنیوں کو پری شپ منٹ انسپکشن کے حقوق تفویض کر دیے۔ ان حقوق کے تفویض کیے جانے کے دو سال کے اندر انتہائی مشکوک حالات میں حکومت پاکستان نے ان کمپنیوں کو ان کی خدمات کے عوض ۳۵۰ کروڑ روپے ادا کیے' حالانکہ ان کی تمام تر کارکردگی کے باوجود پاکستان کے ریونیو میں کوئی خاطر خواہ اضافہ نہ ہوا۔ ایک اعلیٰ کسٹم آفیسر نے بتایا کہ ان کمپنیوں کو حقوق تفویض کیے جانے کے ضمن میں اجلاس وزیراعظم ہاؤس میں منعقدہ ہوا جس کی صدارت آصف زرداری نے کی۔

گزشتہ برس اکتوبر میں ایک غیر شفاف سودے نے کرپشن کے الزامات کو مزید تقویت بخشی جب مملکت کے تحت چلنے والی رائس ایکسپورٹ کارپوریشن آف پاکستان نے ۵۰۰۰۰۰ ٹن چاول جو کل ملکی پیداوار کا نصف بنتا ہے' کراچی سے تعلق رکھنے والے ایک تاجر ریاض لالہ جی کے ذریعے فروخت کرنے کا پروگرام بنایا جو اس سے قبل اسی کارپوریشن کی جانب سے بلیک لسٹ قرار دیا جا چکا تھا۔ آر ای سی پی نے نہ تو کوئی ٹینڈر طلب کیا اور نہ ہی آدھا ملین ٹن چاولوں کی فروخت کی عوام کو ہوا تک لگنے دی۔ گفت و شنید کے نتیجے میں آر ای سی پی ۲۱۸ امریکی ڈالر فی ٹن کے عوض فروخت پر راضی ہوگئی جب کہ عالمی منڈی میں یہ قیمت فی ٹن ۲۶۵ امریکی ڈالر تھی۔ آر ای سی پی کے ایک ذمہ دار افسر کے مطابق اس تمام تر منصوبے کا کرتا دھرتا حکومت کی جانب سے ایک طویل مدت سے ریٹائرڈ شخص' چیئرمین آر ای سی پی تھا۔ اگرچہ پی پی پی گورنمنٹ نے دعویٰ کیا تھا کہ اس کا مہران بینک لمیٹڈ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ لیکن اس بینک کے اہم عہدوں پر فائز افراد کو پی پی پی حکومت کی بھرپور حمایت حاصل تھی۔ صفدر عباس زیدی جو حبیب بینک لمیٹڈ میں یونس طیب کا سرپرست تھا اور اس کے ساتھ گہرے کاروباری مراسم رکھے ہوئے تھا' کو ایک وزیر کے برابر مقام دیتے ہوئے انوسٹمنٹ بورڈ کا سربراہ مقرر کیا۔ آصف جمشید شاہ' حبیب بینک اور مہران بینک دونوں میں یونس کا قریبی دوست تھا' کو بینک آف پنجاب کا صدر مقرر کر دیا گیا۔ چودھری احسان' مہران بینک میں یونس حبیب کے مشیر کو پاکستان بینکنگ کونسل کا چیئرمین مقرر کیا گیا۔ حکومت نے مختلف رپورٹوں کے باوجود کہ اسد اللہ شیخ این آئی ٹی میں کئی قابل اعتراض معاملات میں ملوث تھے' سے صرف نظر کیا۔ تاہم اخباری اطلاعات پر کہ

Marfat.com

کے ای ایس سی کے چھ ملین سے زائد حصص کو ان کی بریک اپ ویلیو سے بھی ایک تہائی کم قیمت پر فروخت کیا اور سوئی ساؤدرن گیس کے ۲۵ لاکھ کے حصص کو بھی انتہائی کم قیمت پر فروخت کیا تو اکنامک کوآرڈی نیشن کمیٹی نے تحقیقات کا حکم دیا مگر بعد ازاں اسے بھی دبا لیا گیا۔

عین اس وقت کہ جب معزول وزیر اعظم بے نظیر بھٹو بینکوں کے نادہندگان کے خلاف سخت کارروائی کا ڈھنڈورا پیٹ رہی تھیں، ایف آئی اے کو خصوصی طور پر ہدایات جاری کی گئی تھیں کہ وہ کراچی کے توکل گروپ کے خلاف ایف آئی آر درج نہ کرے حالانکہ یہ گروپ مبینہ طور پر ملک کے بڑے بینکوں سے ۲۵۰ کروڑ روپے کا فراڈ کر چکا تھا۔ توکل گروپ نے جاوید پاشا (آصف زرداری کا خاص دوست) کے ذریعے اس امر کو یقینی بنایا تھا کہ ایف آئی اے اس کے خلاف نیشنل بینک آف پاکستان اور فیڈرل اینٹی کرپشن کی جانب سے موصول ہونے والی شکایات پر کسی قسم کی کارروائی عمل میں نہ لائے گی لیکن اس کے باوجود اگر قومی اسمبلی میں اپوزیشن کے بھرپور دباؤ پر تمبر میں توکلوں کو گرفتار کرنا ہی پڑا تو بھی اسلام آباد کی ایک وی آئی پی شخصیت نے ہوم سیکرٹری پنجاب کو ہدایات جاری کیں کہ انہیں جیل میں "اے" کلاس کی سہولیات فراہم کی جائیں۔

کنٹریکٹ کی بنیاد پر انٹیلی جینس بیورو اور سپیشل برانچ کے سربراہان کے طور پر تعینات میجر (ر) مسعود شریف اور ونگ کمانڈر طارق لودھی نے سال ۹۶-۱۹۹۵ء کے دوران انتہائی اہم مشنوں کی تکمیل کے لیے ایک بلین روپے کی خطیر رقم خرچ کر ڈالی۔ مسعود شریف آصف زرداری کا ایک پرانا دوست ہے جب کہ طارق لودھی کے لیے سابق چیف آئی ایس آئی لیفٹیننٹ جنرل (ر) اسد درانی نے بے نظیر بھٹو سے بھرپور سفارش کی تھی۔ ان دونوں افراد کو پاکستان کے شاہی جوڑے کا بھرپور اعتماد حاصل تھا اور ملکی و سیاسی معاملات کے حوالے سے ہر قسم کی معلومات شاہی جوڑے کو فراہم کیا کرتے تھے تاآنکہ ۵ نومبر ۹۶ء کو بے نظیر حکومت برطرف کر دی گئی۔

کراچی، لاہور اور اسلام آباد میں واقع انٹیلی جینس بیورو کے دفاتر سے ہاتھ لگنے والے تکنیکی اور دستاویزی مواد کے مطابق چیف جسٹس آف پاکستان، مسٹر جسٹس سید سجاد علی شاہ، سپریم کورٹ کے جج صاحبان ناصر اسلم زاہد، چیف جسٹس پنجاب ہائی کورٹ جسٹس خلیل الرحمان، جسٹس ملک عبدالقیوم اور جسٹس منیر اے شیخ مسلسل آئی بی کی نگرانی میں رہے اور ان کے ٹیلی فون بھی ٹیپ کیے جاتے رہے۔ اگرچہ اس ضمن میں ابھی کوئی شہادت

Marfat.com

سامنے نہیں آئی لیکن اندیشہ ہے کہ آئی بی نے فوج کے حاضر سروس افراد کے ٹیلی فون بھی ٹیپ کیے۔ تاہم اس امر کی واضح شہادتیں موجود ہیں کہ آئی بی میں ایسی رپورٹیں مسلسل فائل ہوتی رہیں جن میں مختلف کور کمانڈرز' آئی ایس آئی اور ایم آئی کے فیلڈ آفیسرز اور ان کے سربراہان کی سرگرمیوں کا تفصیلی ذکر ہوتا تھا۔ آئی بی نے صدر لغاری کے بیٹوں اور چچا زاد بھائی جعفر لغاری کے فون بھی ٹیپ کیے۔ بیگم لغاری کے نہ صرف ٹیلی فون ٹیپ کیے گئے' بلکہ طبی وجوہات کی بناء پر ان کے دورۂ امریکہ سے متعلق "ٹاپ سیکرٹ رپورٹ بھی مرتب کی۔ صدر کے پرسنل سٹاف کے ممبران بشمول پرنسپل سیکرٹری شمشیر خان اور پریس کنسلٹنٹ خواجہ اعجاز سرور کے فون بھی ٹیپ ہوئے اور ان کی حرکات و سکنات پر بھی آئی بی نے کڑی نگاہ رکھی۔ ان کے علاوہ امریکی سفارت کاروں کی گفتگو بھی ٹیپ کی جاتی رہی۔ ماہ نومبر میں بے نظیر حکومت نے "پانچ بڑے" بشمول سابق ایم۔ این اے نواز کھوکھر' صدر نیشنل بینک آف پاکستان مولا بخش عباسی' صدر الائیڈ بینک لمیٹڈ شوکت کاظمی' سابق او جی ڈی سی چیئرمین رفعت عسکری' سابق ڈی جی اے پی پی اظہر سہیل' سابق پرنسپل سیکرٹری بے نظیر بھٹو احمد صادق' آصف زرداری پرسنل سیکرٹری رائے سکندر' سابق چیئرمین سی ڈی اے شفیع سہوانی' بے نظیر بھٹو کی پولٹیکل سیکرٹری ناہید خان' صدر حبیب بینک لمیٹڈ محمد یونس ڈالیا کو گرفتار کیا گیا۔ جب کہ Z-۷۷ کے عنوان سے ایسے بیورو کریٹس کی چھان پھٹک شروع کر دی گئی جو کسی نہ کسی طریقے سے کرپشن کے معاملات میں آصف زرداری کے معاون تھے اور جن کی گرفتاری کسی بھی وقت متوقع ہے۔ ان میں زرداری کے قریبی معاونوں کے نام درج ذیل ہیں:

فرید ویرانی' فوزی علی کاظمی' جاوید پاشا' اقبال میمن' ستار کیریو' مسلم لاکھانی' ناصر وسیم' ذاکر بادشاہ' منیر عطاءاللہ شیزی نقوی' علی جعفری' باری میاں' شیریں رحمان' تصویر جمانی' ٹاپی زرداری' سلیم عمر (فرزند بلو اور علی محمود) عامر لودھی' کرنل محمود / کرنل ظفر (جنرل بابر کے دوست بابر تجمل (اقبال حیدر کا بہنوئی) عباس سرفراز' سلمان تاثیر' مصطفیٰ محفوظ خان' طارق اسلام' حسین لوائی' ظاہر خان نیازی' نوید حبیب ملک' ماجد بشیر' انور مجید طفیل شیخ اور حاجی عبدالرزاق شامل ہیں جب کہ Z-۷۷ میں شامل سرکاری ملازمین میں احمد صادق' سلمان فاروقی' شیر خان' اے آر صدیقی' بریگیڈیئر اسلم قریشی' مقصود شیخ' جاوید طلعت' نذیر قدوائی' جنرل خالد (سافرون)' علی محمد شیخ' کیپٹن نصیر' مجیب اللہ شاہ' محمد احسان' ایم بی عباسی' ڈاکٹر وقار مسعود' خالد اقبال' شوکت علی کاظمی' اسداللہ شیخ' منور' یونس ڈالیا

سعید اے قاضی، عزیز اللہ میمن، چودھری سجاد علی، ظہیر خان قاضی، عارف خان قاضی، ایڈمرل اکبر (کے پی ٹی) مبین احسان، رفعت عسکری، ظفر اقبال، شفیع سہوانی، صادق علی خان، سلیمان خان (سی بی آر) اقبال فرید (سی بی آر) جہانگیر خان (سی بی آر) خالد خان (سول ایوی ایشن) فیاض الہی (پاور بورڈ) میاں اظہر (ریلویز) ضیاء اللہ (ریلویز) جموٹ (پی آئی اے) اور سراج شمس الدین کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

Marfat.com

ادارہ ثقافتِ اسلامیہ میں لوٹ مار

لاہور میں شاہراہ قائداعظم پر باغ جناح (لارنس گارڈن) سے کچھ آگے ہوٹل پرل کانٹی نینٹل سے ملا ہوا ایک پارک ہے' جس کا ایک دروازہ کلب روڈ پر کھلتا ہے۔ اس دروازے سے متصل ایک کچا راستہ آپ کو قدیم طرز تعمیر کی عمارت تک لے جاتا ہے۔ اس قدیم عمارت کے بالکل سامنے شمال کی جانب ایک سابق وزیراعلیٰ غلام حیدر وائیں کی خالصتاً ذاتی اختراع "نظریہ پاکستان ٹرسٹ" کی نوتعمیر شدہ عمارت ہے جو مبینہ طور پر تین علمی و ادبی اداروں کی اٹھارہ کنال زمین میں سے ۴ کنال پر تعمیر کی گئی ہے اور متعلقہ اداروں کو ابھی تک کوئی معاوضہ نہیں دیا گیا۔ اس نظریہ پاکستان ٹرسٹ بلڈنگ کے بالمقابل واقع مذکورہ بلڈنگ کا نام ہے' "ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور"۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ اپنے قیام ۱۹۵۰ء سے ۱۹۹۵ء جون تک اڑھائی سو موضوعات پر مشتمل لاکھوں کتب شائع کر چکا ہے۔ ادارہ ہذا کو معروف صنعت کار سید واجد علی شاہ کی صورت میں تاحیات چیئرمین میسر ہے جو ادارے کے بیشتر مالی معاملات میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ میں ۱۹۵۰ء سے مئی ۱۹۹۲ء تک بانی ڈائریکٹر ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم سے لے کر بالترتیب میاں ایم ایم شریف' ڈاکٹر شیخ اکرام' جناب شیخ محمد سعید' جناب سراج منیر اور جناب سہیل عمر کی صورت میں چھ ڈائریکٹر تعینات رہے جبکہ جون ۹۲ء سے تادم تحریر معروف دانشور ڈاکٹر رشید جالندھری ڈائریکٹر ادارہ ثقافت اسلامیہ کے طور پر کام کر رہے ہیں۔

یہاں یہ بات واضح رہے کہ پاکستان سوسائٹیز ایکٹ کے تحت وجود میں آنے والا یہ ادارہ اپنے قیام سے لے کر آج تک وفاقی و صوبائی حکومتوں کی سالانہ امداد' بعض وفاقی و صوبائی محکموں کی وقتاً" فوقتاً" امداد' بی سی سی آئی کے ایک فلاحی ادارے "انفاق" کی امداد اور چیئرمین و وائس چیئرمین سید واجد علی شاہ اور سید شاہد علی شاہ کی مالی و انتظامی معاونت

Marfat.com

سے چل رہا ہے۔

ادارہ ثقافت اسلامیہ کے دائرہ کار میں علمی و تحقیقی کام اور تراجم اور تالیفات شامل ہیں۔ ادارے کی اشاعتی سرگرمیوں کا دائرہ کار قرآن و حدیث سے فقہ و تفسیر، تعلیم و تدریس، تاریخ و سوانح، تہذیب و تمدن، اخلاق و تصوف اور ادبیات تک پھیلا ہوا ہے اور ادارے کی شائع کردہ متعدد کتب کالج اور یونیورسٹی کی سطح پر طالب علموں کی مددگار کتب کی حیثیت سے شامل نصاب ہیں۔

اشاعت کتب کے علاوہ ادارہ ثقافت اسلامیہ "المعارف" کے نام سے ایک علمی و تحقیقی مجلہ بھی شائع کرتا ہے جو پہلے ماہنامے کے طور پر شائع ہوتا رہا، لیکن اب کچھ عرصہ سے سہ ماہی مجلہ کی صورت میں شائع ہو رہا ہے۔

ادارہ ثقافت اسلامیہ کے بورڈ آف ڈائریکٹرز میں ملک کے نامور قلم کار اور دانشور حضرات شامل رہے۔ اس کے علاوہ مستقل قلمی معاونین میں بھی علمی و ادبی دنیا کی اہم شخصیات ادارے سے منسلک رہیں اور تاحال ہیں۔

ادارہ ثقافت اسلامیہ جو اپنے قیام سے لے کر تقریباً تیس سال تک خالصتاً علمی و ادبی حوالے سے ایک منفرد پہچان کا حامل تھا، اس میں ۸۰ کے عشرے سے ایک نئی تبدیلی آنا شروع ہوئی۔ اداروں میں بدعنوانی کا جو عمل ضیاء الحق کی آمد سے کچھ عرصہ بعد شروع ہوا، اس کے اثرات کی زد میں ادارہ ثقافت اسلامیہ بھی آیا۔ ۱۲ مئی ۱۹۸۴ء کو شیخ محمد سعید کے بعد معروف دانشور، ادیب اور صحافی جناب سراج منیر کو ادارہ ثقافت اسلامیہ کا ڈائریکٹر مقرر کر دیا گیا۔ ادارہ سراج منیر صاحب (مرحوم) کی سربراہی میں پہلے سے زیادہ تعداد میں کتب شائع کرنے لگا، سیمینار منعقد ہونا شروع ہوئے، وفاقی و صوبائی اداروں کی امداد میں اضافہ ہوا۔ سراج منیر نے ادارہ میں کئی شعبے قائم کیے، کئی لوگ بھرتی کیے گئے، اگرچہ بعض لوگ ان بھرتیوں پر بھی معترض ہیں۔ سو یہ سلسلہ جو ۵۰ میں چلا تھا، ۸۴ سے ۸۷ تک تقریباً تین سال بہت تیزی اور خالصتاً علمی و ادبی نقطہ نظر سے رواں رہا اور ادارہ نے بعض شعبوں میں سراج منیر مرحوم کی کوششوں سے بہت ترقی کی۔

۸۸ء عملی طور پر گیارہ سالہ طویل ضیاء دور کے خاتمہ کا سال تھا، اس سال الیکشن ہونا تھے۔ ادارہ کے سربراہ سراج منیر مسلم لیگ سے متصل ہو چکے تھے۔ گو ان کا یہ لگاؤ ۸۸ء سے پہلے ہی ایک صوبائی اعلیٰ سیاسی عہدیدار سے ہو چکا تھا۔ واضح رہے کہ ۸۸ء تک ادارہ ثقافت اسلامیہ نے جو برق رفتار ترقی کی اس کی بدولت ادارے کو ملنے والے فنڈز میں

اضافہ ہوا۔ ادارے کی شائع کردہ کتب کی فروخت میں بہت زیادہ اضافہ ہوا۔

یہیں پر ادارہ اور اس کے عہدیداران ایک نئی شناخت کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ ۸۸ء کے عام انتخابات میں مسلم لیگ کے قائدین نے پیپلز پارٹی کے قائدین بلکہ قائد خواتین کو الیکشن میں چت کرنے کے لیے ادارہ ثقافت اسلامیہ کی عمارت کو اس وقت کے ڈائریکٹر جناب سراج منیر کے ساتھ مل کر کردار کش انتخابی مہم کا صدر دفتر بنا لیا اور یہیں پیپلز پارٹی کی دو خواتین رہنماؤں کی قابل اعتراض تصاویر کی اشاعت کا پروگرام بنا جو بعد میں شائع بھی ہوئیں اور ادارہ ثقافت اسلامیہ اپنے ڈائریکٹر سمیت علمی و ادبی اشاعتی پروگرام چھوڑ کر خالصتاً سیاسی سرگرمیوں میں ملوث ہوگیا۔

۸۸ء میں اور اس کے بعد ادارہ ثقافت اسلامیہ کے دفتر میں جناب سراج منیر کے علاوہ ایک مقامی ڈائجسٹ اور ایک اردو ہفت روزہ کے ایڈیٹر' دو دیگر صحافی' مسلم لیگ کے ایک بڑے رہنما کے بھائی' ایک سابقہ صوبائی وزیر' پولیس کے ایک آئی جی اور ایک معروف اخبار نویس صبح و شام یہاں اکٹھے ہوتے اور مسلم لیگ کی کامیابی کی مختلف النوع تدابیر تیار کرتے۔ واضح رہے کہ ادارہ ثقافت اسلامیہ کے ڈائریکٹر کے کمرے میں نصب ایئرکنڈیشنر انہی دنوں مذکورہ تدابیر کنندگان کی سہولت کے لیے سپیشل برانچ کے ایک اعلیٰ آفیسر نے لگوایا تھا جو تاحال موجود ہے۔ واضح رہے کہ سراج منیر کے سیاسی روابط کا آغاز ۸۷ء میں سیرت پاک نامی اشاعتی منصوبے کے افتتاح پر صدر ضیاء کی ادارہ میں آمد سے ہوا تھا۔

سراج منیر کی ادارہ میں بطور ڈائریکٹر تقرری کے سال ۸۴-۸۳ میں ادارہ کو صوبائی حکومت کی طرف سے ۲ لاکھ ۱۶ ہزار روپے اور وفاقی حکومت کی طرف سے ایک لاکھ ۴۷ ہزار روپے کی سالانہ گرانٹ ملی۔ ایک لاکھ ۵۷ ہزار ۲۷۲ روپے کی کتابیں فروخت ہوئیں۔ اس کے علاوہ ۲۵ ہزار ۵۸۶ روپے آمدنی ہوئی۔ کل ۵ لاکھ ۴۵ ہزار ۸۵۸ روپے میں سے ۲ لاکھ ۸۴ ہزار ۷۵۷ روپے تنخواہوں میں چلے گئے' جبکہ کتابوں کی اشاعت پر ۸۸ ہزار ۳۸۹ روپے خرچ ہوئے۔ اس دوران ادارہ ثقافت اسلامیہ میں ۱۷ ملازمین تھے۔

۸۵-۱۹۸۴ء میں صوبائی حکومت نے ۲ لاکھ روپیہ اور وفاقی حکومت نے ۱ لاکھ روپیہ دیا' ۳ لاکھ ۲۴ ہزار اور ۸۳ روپے کی کتابیں فروخت ہوئیں اور ۲۲ ہزار ۵ سو ۴۹ روپے کی آمدنی ہوئی۔ کل ۶ لاکھ ۴۶ ہزار ۵ سو ۸۷ روپے میں سے ۴ لاکھ ۴۳ ہزار ۶ سو ۵۴ روپے تنخواہوں میں چلے گئے جبکہ کتابوں کی اشاعت پر ۲ لاکھ ۵۷ ہزار ۱ سو ۸۸ روپے خرچ ہوئے

Marfat.com

اور ملازمین کی تعداد ۱۸ ہو گئی۔

اسی طرح سراج منیر صاحب کی وفات تک (۹۱-۱۹۹۰ء) ادارہ ثقافت اسلامیہ کو ملنے والے فنڈز میں بہت زیادہ اضافہ ہو چکا تھا اور ۹۱-۹۰ء میں صوبائی حکومت نے ادارہ کو ۱۴ لاکھ ۲۵ ہزار روپے دیئے۔ وفاقی حکومت نے ۱۲ لاکھ روپیہ دیا' ۳ لاکھ ۳۰ ہزار ۹ سو ۷ روپے مختلف اداروں اور تنظیموں کی طرف سے عطیہ ملا۔ ۲۹ ہزار ۳ سو ۶۸ روپے آمدن ہوئی اور کتابوں کی فروخت سے ادارہ کو ۵ لاکھ ۳۸ ہزار ۴ سو ۷۶ روپے حاصل ہوئے۔ اس طرح کل ۳۲ لاکھ ۲۳ ہزار ۷ سو ۵۱ روپے میں سے ۱۴ لاکھ پچیس ہزار ۱۶۵ روپے تنخواہوں میں چلے گئے۔ ۹ لاکھ ۶۱ ہزار ۶۵۶ روپے کتابوں کی اشاعت پر خرچ ہوئے اور اس دوران ادارے کی تاریخ میں سب سے زیادہ ملازمین نے تنخواہیں وصول کیں جن کی تعداد ۵۲ تھی۔ واضح رہے کہ سراج منیر کے دور میں ملازمین کی تعداد ۱۷ سے ۵۲ تک پہنچ گئی۔ ۸۴-۱۹۸۳ء میں (۱۷)' ۸۵-۱۹۸۴ء میں (۱۸)' ۸۶-۱۹۸۵ء میں (۲۱)' ۸۷-۱۹۸۶ء میں (۲۴)' ۸۸-۱۹۸۷ء میں (۲۶) اور پھر ایک دم ۸۹-۱۹۸۸ء میں ادارہ کے ملازمین کی تعداد (۴۲) ہو گئی۔ ۹۰-۱۹۸۹ء میں ملازمین کی تعداد بڑھ کر (۴۶) ہو گئی اور سراج منیر صاحب کے آخری سال ۹۱-۱۹۹۰ء میں ادارہ ثقافت اسلامیہ کے ملازمین کی تعداد (۵۲) تھی۔ ان ملازمین میں کچھ ایسے افراد بھی ہیں جنہوں نے پورا سال جو کام بالکل نہیں کیا' اس کی بھی تنخواہ وصول کی۔ مثلاً سراج منیر صاحب ادارہ ثقافت اسلامیہ سے ایک پرچہ "جمال" نکالنا چاہتے تھے' اس مجوزہ پرچے کی آخری دم تک ایک بھی کاپی بلکہ ڈمی بھی شائع نہ ہوئی لیکن اس کے لیے ایک آدمی ذوالفقار احمد جو ادارہ میں ۱۹ ویں گریڈ میں ملازم ہونے کے باوجود فروری ۹۱ء سے جون ۹۲ء تک "جمال" کے محض کاغذی نگران ہونے کی وجہ سے ۸۰۰ روپیہ ماہوار حاصل کرتے رہے۔ مجموعی طور پر انہوں نے ۱۲'۸۰۰ روپے حاصل کیے۔ اس کے علاوہ سراج منیر صاحب نے آڈیو سیکشن بنایا اور اس کے لیے یونس منصور نامی شخص کو ادارہ میں ۱۷ ویں گریڈ کی ملازمت فراہم کی حالانکہ یونس منصور کی کلام اقبال وغیرہ کی ریکارڈنگ کے لیے ضرورت تھی جو تھوڑے عرصہ کا کام تھا' لیکن یونس منصور یکم اپریل سے یکم اکتوبر ۱۹۸۷ء تک ۱۷ ویں گریڈ کی مراعات حاصل کرتے رہے جبکہ بعد میں ۲ اکتوبر ۸۷ء سے ان کی تنخواہ ۴۲۰۰ روپیہ مقرر کر دی گئی اور وہ دسمبر ۱۹۹۱ء تک ادارہ ثقافت اسلامیہ میں رہے جبکہ اس کے علاوہ بھی ایک ادارے کے باقاعدہ ملازم تھے۔ یونس منصور نے ادارہ ثقافت اسلامیہ سے ۲ لاکھ ۱۰ ہزار روپے حاصل کیے۔

Marfat.com

اس کے علاوہ سراج منیر صاحب نے گریڈ ۱۶ کے ایک سکرپٹ ایڈیٹر عزیز ابن الحسن کو ادارے کی حدود میں واقع سرکاری کوارٹرز میں رہائش پذیر ہونے کے باوجود تنخواہ کے علاوہ کرایہ مکان ۲۹۷ روپے اور خرچ آمدورفت ۱۳۰ روپے ماہانہ دو سال تک دیا اور اس طرح عزیز ابن الحسن نے مجموعی طور پر ۲۰۶۱۶ روپے حاصل کیے۔

سراج منیر کے دور کی بڑی ۸ کتابوں کے تراجم اور تالیف وغیرہ کے بعد کتابت تک بھی مکمل ہو چکی ہے' ان ۸ کتب پر ادارہ ثقافت اسلامیہ ۲ لاکھ ۴۷ ہزار ۷۳۳ روپے خرچ کر چکا ہے۔ اس کے علاوہ تقریباً ۲۰ کتابیں ایسی ہیں جن کے تراجم مکمل ہو چکے ہیں جن پر ادارہ ثقافت اسلامیہ نے ۵ لاکھ ۶۶ ہزار ۴۲۷ روپے خرچ کیے۔ اس کے علاوہ سات کتابیں ایسی ہیں جن کے تراجم بھی مکمل ہو چکے ہیں لیکن ان پر خرچ ہونے والی رقم معلوم نہیں ہو سکی۔

ادارہ ثقافت اسلامیہ کے موجودہ ڈائریکٹر ڈاکٹر رشید جالندھری کے بقول سراج منیر نے اگست ۹۰ء میں معروف ادیب اور شاعر شہزاد احمد سے ایک کتاب "ہسٹری آف مسلم فلاسفی" مصنف ایم ایم شریف کے اردو ترجمہ کے لیے معاہدہ کیا' جس میں درج باقی شرائط کو تو تبدیل نہ کیا لیکن پانچویں شرط جو فی صفحہ ترجمہ کے معاوضے سے متعلق تھی' اس کو مکمل طور پر کاٹ کر ۳۰ روپے فی معیاری صفحہ سے ۱۵۰ روپے فی معیاری صفحہ کر دیا اور اپنے دستخط کر دیئے۔ واضح رہے کہ ایم ایم شریف کی مذکورہ کتاب شہزاد احمد نے تقریباً ترجمہ کر دی ہے اور وہ اس کے عوض اب تک ایک لاکھ ۱۵ ہزار ۶۵۵ روپے سراج منیر کے بعد آنے والے ڈائریکٹر سہیل عمر سے حاصل کر چکے ہیں۔ ڈائریکٹر ادارہ ثقافت اسلامیہ رشید جالندھری کہتے ہیں کہ یہ تراجم ناقص ہیں اور سراج منیر نے بہت زیادہ معاوضے کے عوض ایک ایسی کتاب ترجمہ کروائی جو شہزاد احمد صاحب صحیح طور پر نہ کر سکے اور اب مختلف دانشوروں اور نظرثانی کنندگان کی رائے ان کے ترجمہ کے خلاف آ رہی ہے اور ہر ماہر فلسفہ نے یہ رائے دی ہے کہ اس ترجمہ کی صحت اس قدر کمزور ہے کہ اگر اس کو ٹھیک کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ تقریباً ناممکن ہوگا اور اس صورت میں دوبارہ ترجمہ کرانا مناسب ہے۔ ایسی ہی کچھ صورتحال شہزاد احمد صاحب کی ترجمہ کردہ ایک اور کتاب ماجد فخری کی کتاب اسلامک فلاسفی کی ہے اور اس کتاب کا بھی شہزاد احمد ۴۱ ہزار روپیہ ادارہ سے وصول کر چکے ہیں۔

اس سلسلے میں جب شہزاد احمد سے رابطہ کیا گیا تو انہوں نے بتایا کہ انہیں سراج

Marfat.com

منیر صاحب نے یہ کام دیا تھا اور معاوضہ بھی انہوں نے مقرر کیا تھا اور اگر ان تراجم کے بارے میں ماہرین کی آراء ادارہ کو موصول ہوئی ہیں تو ادارہ کے ڈائریکٹر کا فرض تھا کہ وہ مجھے آگاہ کرتے جبکہ ایسا نہیں کیا گیا۔

اس کے بعد جب ۹۰ء میں اسمبلیاں توڑ کر صدر اسحاق نے غلام مصطفیٰ جتوئی کو نگران وزیراعظم مقرر کیا تو انہوں نے سراج منیر کو اپنا مشیر مقرر کر لیا' اس کے کچھ عرصہ بعد سراج منیر انتقال کر گئے۔ سراج منیر کے دور میں ادارہ ثقافت اسلامیہ کی سرگرمیوں میں اضافہ ہوا اور کتب کی اشاعت میں بھی اضافہ ہوا اور کتابوں کی فروخت بھی بڑھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ ادارہ کو ملنے والے فنڈز بھی بڑھے اور جس رفتار سے فنڈز بڑھے' کتابوں کی اشاعت کی رفتار اور دوسری سرگرمیاں بہرطور پیچھے رہیں اور اس کے علاوہ رشید جالندھری کے بقول سراج منیر نے بے شمار ایسی کتابوں کا ترجمہ کروا لیا' جو یا تو فقہی اعتبار سے متنازعہ تھیں یا پھر ان کے تراجم میں کئی نقائص ہیں۔

یکم مارچ ۹۱ء میں اقبال اکیڈمی کے ڈپٹی ڈائریکٹر جناب سہیل عمر کو ادارہ ثقافت اسلامیہ کا ڈائریکٹر مقرر کر دیا گیا۔ سہیل عمر کے عہدہ سنبھالتے ہی ادارہ ثقافت اسلامیہ میں اتنی بدعنوانیاں ہوئیں کہ ادارہ کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ وزارت اطلاعات و ثقافت کے ایک ڈپٹی سیکرٹری نے سہیل عمر کی انکوائری کے بعد ایک بڑی رپورٹ مرتب کی اور بالاخر بدعنوانیوں کے باعث ۱۸ ماہ کے بعد سہیل عمر کو اس عہدے سے الگ کر دیا گیا۔

ستمبر ۱۹۹۰ء میں سراج منیر کی اچانک وفات کے بعد ادارہ ثقافت اسلامیہ کے بورڈ آف ڈائریکٹرز نے مرحوم کے بہنوئی اور اقبال اکادمی کے ڈپٹی ڈائریکٹر محمد سہیل عمر کو ادارے کا ڈائریکٹر مقرر کیا۔ انہیں گریڈ ۲۰ کی تنخواہ اور دیگر سہولتیں دینے کی پیش کش کی گئی۔ بورڈ نے انہیں یہ ہدایت بھی کی کہ وہ اقبال اکادمی سے کسی دوسری جگہ ملازمت کرنے کی اجازت حاصل کریں۔ یاد رہے کہ سہیل عمر نے ۱۰ اکتوبر ۹۰ء سے ہی ادارے کی طرف سے فراہم کردہ سہولتوں سے فائدہ اٹھانا شروع کر دیا تھا جس میں گھر میں ٹیلی فون' ٹرانسپورٹ اور گھریلو خادمہ شامل تھی۔ ۲ مارچ ۹۱ء سے انہوں نے ۵۸۰۰ روپے ماہوار ہاؤس رینٹ بھی وصول کرنا شروع کر دیا تھا۔ سہیل عمر نے اس وقت تک نہ تو ادارہ ثقافت اسلامیہ کو اقبال اکادمی کا اجازت نامہ فراہم کیا اور نہ ہی اقبال اکادمی کو اپنی دوسری ملازمت کے بارے میں مطلع کیا۔ چھ ماہ گزرنے کے بعد جولائی ۹۱ء کو سہیل عمر نے اقبال اکادمی کی اتھارٹیز کو ایک نوٹ کے ذریعے مطلع کیا کہ ادارہ ثقافت اسلامیہ نے انہیں اپنی

Marfat.com

نجی حیثیت میں ادارے کی دیکھ بھال کرنے کی درخواست کی ہے' جسے انہوں نے کسی فیس کے بغیر قبول کر لیا ہے اور اب بورڈ ان سے یہ درخواست کر رہا ہے کہ میں ادارے کے ناظم اعلیٰ کی حیثیت سے کام کروں۔ چنانچہ مجھے ادارے کے ناظم کی حیثیت سے کام کرنے اور اس کام کی فیس وصول کرنے کی اجازت دی جائے۔ انہوں نے ۱۸ جون ۱۹۹۱ء کو ادارے کے ناظم اعلیٰ کا باقاعدہ چارج سنبھال کر گریڈ ۲۰ کی تنخواہ اور تمام سہولتیں حاصل کرنا شروع کر دیں۔ انہوں نے ۱۸ جون کو وہ تین رکنی انتظامی کمیٹی بھی توڑ دی جو سراج منیر کی وفات کے بعد بنائی گئی تھی۔ سہیل عمر ۲۹ فروری ۱۹۹۲ء تک ادارہ ثقافت اسلامیہ کے ڈائریکٹر کی تمام سہولتیں اور اقبال اکادمی کے ڈپٹی ڈائریکٹر (گریڈ ۱۹) کی مکمل تنخواہ اور تمام سہولتیں بیک وقت وصول کرتے رہے۔ اس پورے عرصے میں سہیل عمر نے دونوں اداروں کی اتھارٹیز کو نہ صرف دھوکا دیا بلکہ وہ غلط بیانی کر کے دونوں اداروں سے بھاری رقوم وصول کرتے رہے۔ انہوں نے یکم مارچ ۹۲ء سے ۳۱ مئی ۹۲ء تک صرف تین ماہ کے لیے اقبال اکادمی سے ادارہ ثقافت اسلامیہ میں کام کرنے کی تحریری اجازت حاصل کی اور ان تین مہینوں کی تنخواہ انہوں نے اقبال اکادمی سے وصول نہیں کی بلکہ ادارہ ثقافت اسلامیہ سے گریڈ ۲۰ کی تنخواہ اور دیگر سہولیات حاصل کرتے رہے۔ انہوں نے اس طرح ادارے سے مبلغ ۲ لاکھ ۲۰ ہزار اور ۲۴۵ روپے ناجائز طور پر وصول کیے۔ ۹۱ء کے آخر میں ادارے کا آڈٹ کیا گیا جس کے نتیجے میں سہیل عمر' ان کے ایک قریبی رشتہ دار اور ادارے کے ایڈمن افیسر فریدالدین پر بدعنوانیوں کے سنگین الزامات کی نشاندہی کی گئی جو بعدازاں بالکل سچ ثابت ہوئے۔ چنانچہ ادارے کے بورڈ آف ڈائریکٹر نے سہیل عمر کو ۳۱ مئی ۹۲ء کو فارغ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ازاں بعد فریدالدین کی انکوائری کرائی گئی۔ ان پر عائد کیے گئے الزامات درست ثابت ہوئے اور انہیں ملازمت سے سبکدوش کر دیا گیا۔

آڈٹ رپورٹ اور ادارے کے چیئرمین کی طرف سے مقرر کردہ ایک سینئر وکیل کی مرتب کردہ رپورٹ کے مطابق سہیل عمر نے ادارہ ثقافت اسلامیہ میں اپنے مختصر ملازمت کے دوران جو بدعنوانیاں کیں' وہ مختصراً یہ ہیں۔

سہیل عمر نے ادارے کے ایڈمن آفیسر فریدالدین کے ساتھ مل کر غیرقانونی طور پر اور ضابطے کی کارروائیوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ادارے کی حدود سے بڑے سائز کے ۲۲ درخت بہت ہی معمولی قیمت کے عوض کٹوا دیئے۔ آڈٹ رپورٹ اور ماہرین کی رائے کے مطابق اس طرح ادارے کو لاکھوں روپے کا نقصان پہنچایا گیا۔

Marfat.com

حکیم الامت علامہ اقبال کے شہرہ آفاق لیکچرز Reconstruction of Religious Thought in Islam ادارہ ثقافت اسلامیہ کی مطبوعات میں شامل ہیں۔ اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کرنے کے لیے مرحوم سراج منیر کے زمانے میں فیصلہ ہوا کہ اس کتاب کی پانچ ہزار کاپیاں ادارہ ثقافت اسلامیہ اور اقبال اکادمی (سہیل عمر جس کے ڈپٹی ڈائریکٹر تھے) مل کر شائع کرے۔ طے یہ پایا کہ ادارہ کتاب کے متن کی پرنٹنگ کے اخراجات ادا کرے گا جبکہ باقی تمام اخراجات اقبال اکادمی برداشت کرے گی اور کتابیں نصف نصف تقسیم کرلی جائیں گی۔ جب کتاب شائع کرائی گئی تو اس وقت سہیل عمر صاحب ادارے کے ناظم کی حیثیت سے چارج سنبھال چکے تھے۔ انہوں نے پرنٹر کے ساتھ ملی بھگت کر کے کتاب کے متن کی پرنٹنگ کی قیمت مبلغ ۴۳ ہزار روپے ادا کیے جو اس وقت بازار کے زیادہ سے زیادہ نرخوں سے بھی چار گنا زیادہ تھے۔ بعد میں پتہ چلا کہ انہوں نے اقبال اکادمی کے حصے کے اخراجات بھی اسی تناسب سے ادا کروائے۔

ادارے کے ایڈمن آفیسر فریدالدین سہیل عمر کے قریبی رشتہ دار تھے۔ انہوں نے اپنے بھائی سیف الدین سے رائٹرز کمیونیکیشن سانٹسٹ کے نام سے انگریزی کتب کمپوز کرنے کی ایک کمپیوٹر فرم قائم کر رکھی تھی' یہ فرم مرحوم سراج منیر کے زمانے سے ادارے کی کتابوں کی کمپوزنگ کرتی تھی۔ اس وقت انہیں بازار کے مطابق نرخ دیا جاتا تھا۔ البتہ سہیل عمر کے آنے کے بعد اس فرم کو بازار کے نرخوں سے کہیں زیادہ نرخوں پر کام فراہم کیا جانے لگا۔ آڈٹ رپورٹ کے مطابق سہیل عمر نے اس فرم کو اقرباپروری کے تحت زیادہ نرخ دے کر ادارے کو ایک لاکھ ۸۵ ہزار ۷۷۵ روپے ۸۲ پیسے کا نقصان پہنچایا۔

سہیل عمر کے ڈائریکٹر بننے سے پہلے ادارے کے پاس تین کمپیوٹر سیٹ تھے' جنہیں سہیل عمر صاحب نے ناکارہ قرار دے دیا۔ حالانکہ ان کی معمولی مرمت کروا کے انہیں کارآمد بنایا جا سکتا تھا۔ سہیل عمر نے راولپنڈی کے ایک کمپیوٹر ایکسپرٹ مسٹر اسد کے عباسی کی خدمات حاصل کیں' انہوں نے سہیل عمر کی خواہش کے مطابق اپنی سفارش میں لکھا کہ ادارے میں انہی خطوط پر کمپیوٹر نصب کیے جائیں جن خطوط پر اقبال اکادمی میں کمپیوٹر لگائے گئے ہیں۔ یاد رہے کہ اقبال اکادمی میں کمپیوٹر سکینڈل پر اخبارات میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور غالباً وہاں اس مسئلے پر سہیل عمر کے خلاف انکوائری بھی ہو رہی ہے۔ آڈٹ رپورٹ کے مطابق اس طریقے سے ادارہ ثقافت اسلامیہ کو ۶۷ ہزار روپے کا نقصان پہنچایا گیا۔

Marfat.com

سہیل عمر ادارہ ثقافت اسلامیہ کی سٹاف کار نمبر ایل ایچ ایکس ۳۲۶۶ ناجائز مصرف میں لائے۔ انہوں نے ۱۶۲۶۰ کلومیٹر سفر نجی استعمال کے لیے کیا' لیکن اس کی مقررہ قیمت ادارے کو ادا نہیں کی۔ اس طرح انہوں نے ادارے کو مبلغ ۹۹ ہزار ۴۹۶ روپے کا نقصان پہنچایا۔ سراج منیر مرحوم کے زمانے میں ادارے میں شعبہ عکس و آواز قائم کیا گیا تھا اور اس سیل کو چلانے کے لیے پاکستان ٹیلی ویژن کے سابق سکرپٹ ایڈیٹر مسٹر یونس منصور کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ چنانچہ سراج منیر کے دور میں "سیرت پاک" کے موضوع پر دس کیسٹوں کا ایک سیٹ مرحوم کی آواز میں ریکارڈ کیا۔ اس کے علاوہ خواجہ حسن بصری' داتا گنج بخش' عبدالقادر جیلانی کی زندگیوں اور تعلیمات پر بھی ریکارڈنگ ہوئی۔ سراج منیر کے انتقال کے بعد سہیل عمر کے زمانے میں کلام اقبال (اردو) کو معروف صداکاروں کی آواز میں ریکارڈ کرنے کے لیے ادارہ ثقافت اسلامیہ اور اقبال اکادمی کے اشتراک سے منصوبے کا آغاز کیا گیا۔ سہیل عمر نے یونس منصور کی موجودگی کے باوجود ایک مہمان پروڈیوسر رضی ترمذی کی خدمات حاصل کیں اور تھوڑے عرصے کے دوران انہیں ۱۸ ہزار ۳۹۳ روپے معاوضہ ادا کر دیا۔ کلام اقبال کی ریکارڈنگ پر (۲۳ کیسٹوں کا سیٹ) ۵ لاکھ ۴۰ ہزار ۹۵۰ روپے خرچ آئے۔ آڈٹ رپورٹ کے مطابق سہیل عمر نے ادارے اور اکادمی کا لاکھوں روپے کا نقصان کیا جو آسانی سے بچائے جا سکتے تھے۔

شیخ محمود احمد مرحوم ادارہ ثقافت اسلامیہ کے بانی ارکان میں شامل تھے۔ ادارہ ان کی متعدد کتب بھی شائع کر چکا ہے۔ ان کی زندگی کا ایک بڑا کام Man and Money تھا' جسے وہ بیرون ملک اور بعدازاں ملک کے اندر ادارے سے شائع کرانا چاہتے تھے۔ مین اینڈ منی پر سراج منیر مرحوم کی زندگی میں کام شروع کر دیا گیا تھا۔ دریں اثناء ۲۲ مئی ۱۹۹۰ء کو شیخ محمود احمد وفات پا گئے اور اس کے چند ماہ بعد ستمبر ۹۰ء میں سراج منیر بھی اللہ کو پیارے ہوگئے اور یہ کام سہیل عمر کی نگرانی میں ہونے لگا۔ سہیل عمر نے شیخ محمود احمد صاحب کی بیوہ یا ان کے صاحبزادوں سے اجازت حاصل کیے بغیر اور کوئی معاہدہ کیے بغیر کتاب کی اشاعت پر کام جاری رکھا' حتیٰ کہ یہ کتاب چھپ گئی اور اس کی ۶۰۰ کاپیوں کی سلائی بھی ہوگئی۔ اس مرحلے پر مرحوم شیخ محمود احمد کے صاحبزادوں نے قانونی چارہ جوئی کی جس کے نتیجے میں کتاب کی سلائی شدہ تمام کاپیاں اور تمام دیگر میٹریل ان کی سپرداری میں دے دیا گیا۔ سہیل عمر کی غفلت اور قانونی تقاضے پورے نہ کرنے کے باعث ادارے کو ۲ لاکھ ایک ہزار ۱۳۶ روپے کے نقصان کے علاوہ اس کی ساکھ کو بھی زبردست دھچکا پہنچا۔

Marfat.com

سہیل عمر کی ڈائریکٹرشپ کے زمانے میں امریکہ میں مقیم مسٹر فاروق خان نامی ایک صاحب ادارہ ثقافت اسلامیہ میں آئے اور انہوں نے ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی انگریزی کتاب اسلامک آئیڈیالوجی (Islamic Ideology) کی ایک ہزار کاپیاں خریدنے کی خواہش کی۔ اس وقت ادارے کے سٹاک میں یہ کتاب ختم تھی۔ سہیل عمر نے خفیہ طور پر فاروق خان سے وقت وغیرہ کا معاملہ طے کیا اور ذاتی حیثیت سے یہ کتاب شائع کر کے فاروق خان کو فراہم کر دی۔ بعدازاں پتہ چلا کہ وہ فاروق خان کے ساتھ ادارے کے پیڈ پر خط و کتابت کرتے رہے اور کتاب کی قیمت اپنے نام پر وصول کرتے رہے۔ ادارے کے ریکارڈ پر اس کتاب کی اشاعت کا کوئی ذکر نہیں ملتا اور نہ ہی اس کی قیمت ادارے کو ملی۔ اس کام سے سہیل عمر نے اپنی حیثیت سے سراسر ناجائز فائدہ اٹھایا۔ بددیانتی کی اور مصنف اور ادارے کے حقوق کو پامال کیا۔

رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ سہیل عمر نے ادارے کی مختصر ملازمت کے دوران ان سنگین بدعنوانیوں کے علاوہ بھی متعدد دیگر بدعنوانیاں کیں۔ جونہی ان کی تفصیلات سامنے آئیں گی، انہیں بھی وفاقی وزارت تعلیم کو بھیج دیا جائے گا۔

☆ کمپوزنگ کے کام کے لیے جعلی معاہدہ کر کے ۱۱ ہزار ۵۱۵ روپے کمائے گئے۔

☆ کتابوں کی کمی کو بہانہ بنا کر ۱ لاکھ ۱۶ ہزار ۲۵ روپے کا گھپلہ کیا گیا۔

☆ ادارے کی دیوار کی تعمیر کے لیے ٹینڈر طلب کیے بغیر اپنی پسندیدہ فرم کو ٹھیکہ دے دیا۔

☆ ۱۱ لاکھ ۸۳ ہزار ۹۰۳ روپے سٹیشنری کی خریدوفروخت میں گھپلہ۔

☆ ۴۰ ہزار روپے کے فوٹو کاپیر کے باوجود ۱۱ ہزار ۳۷۶ روپے فوٹو کاپی مشین کا کرایہ ادا کیا گیا۔

☆ غیرقانونی تقرریاں: پرویز اختر، علی اکبر عباس، مجتبیٰ جعفری اور احمد مختار کی غیرقانونی تقرریاں کی گئیں اور ان کو غیرقانونی طور پر پیسے دیئے گئے جبکہ ان کی نوکریاں برخواست کی جا چکی تھیں۔ ذوالفقار احمد ڈپٹی ڈائریکٹر، سید فریدالدین ایڈمن آفیسر، اشفاق انور سکرپٹ ایڈیٹر، محمد آفتاب، ریسرچ اسسٹنٹ وغیرہ کی نوکریاں بورڈ نے ختم کر دی تھیں، لیکن اس کے باوجود ان کو رقوم مہیا ہوتی رہیں۔ ذوالفقار احمد ڈپٹی ڈائریکٹر، محمد شفیع چپڑاسی اور رضا لودھی سیلز آفیسر کی برطرفی کے باوجود انہیں تنخواہوں اور الاؤنسز کی ادائیگی۔

☆ ادارے کے احاطہ میں موجود رہائش گاہ کے علاوہ رینٹ الاؤنس، کونینس الاؤنس

Marfat.com

اور یوٹیلٹی چارجز کی وصولی ۷۵ ہزار ۸۴۹ روپے کی گئی جو غیر قانونی ہے۔

☆ ۲۵ ہزار ۶۸۷ روپے بغیر رسیدوں کے خرچہ۔

☆ ایک لاکھ ۱۸ ہزار ۳۹۳ روپے کی غیر قانونی (Guest Production) کی خرید و فروخت اور آڈیو ویڈیو سیل کے اندر گھپلہ۔

☆ ۳ لاکھ ۵۹ ہزار ۶۵۷ روپے مختلف پارٹیوں سے لینا ہیں جو سہیل عمر نے دیئے لیکن واپس نہ لیے۔

☆ "جمال" الاؤنس ڈپٹی ڈائریکٹر کو دیا گیا' ۸۰۰ روپے ماہوار اور اس کے لیے ایک لاکھ ۵۸ ہزار ۳۹۴ روپے خرچ ہو چکے ہیں جبکہ ابھی تک پرچہ شائع نہیں ہوا۔

☆ انکم ٹیکس آرڈیننس ۱۹۷۹ء کی دفعہ ۵۰/۴ کے تحت ایڈوانس ٹیکس نہیں لیا گیا جس سے ۳۲ ہزار ۵۷۸ روپے کا نقصان ہو سکتا ہے۔

☆ کتابوں کی اعزازی تقسیم سے ۱۵ ہزار ۵۰۷ روپے کا صرف ایک کتاب پر نقصان ہوا۔

☆ مترجموں کو غیر قانونی طور پر ایڈوانس رقوم دی گئیں جو ایک لاکھ ۳ ہزار ۸۰۳ روپے بنتی ہیں۔

☆ سروس بک اور سروس ریکارڈ میں شعوری غلطیاں کی گئیں۔

☆ معاہدے کے برخلاف رائیلٹی کی ادائیگیاں۔

☆ ۶ ہزار روپے کی کتابوں کی غیر قانونی خرید۔

☆ ۳۳ ہزار ۳۱۶ روپے کے غیر قانونی طور پر شاف کو قرضے دیئے گئے۔

سہیل عمر بھی ڈاکٹر محمد افضل--- کے توسط سے ادارہ ثقافت اسلامیہ میں آئے تھے' سو جون ۹۲ء میں ڈاکٹر افضل کے توسط سے رشید احمد جالندھری اور ثقافت اسلامیہ کے ڈائریکٹر کے طور پر تعینات کر دیئے گئے۔ رشید جالندھری نے آتے ہی اخراجات کو کنٹرول کرنے کے لیے سراج منیر کے دور کے بھرتی شدہ ۱۳ افراد کو فارغ کر دیا۔

رشید جالندھری نے اشاعت کے لیے عرصہ دراز سے بالکل تیار پڑی تقریباً ۳۵ کتابوں کے مسودات کو سرد خانے میں ڈال دیا اور جو مسودات پہلے سے موجود نہیں تھے' انہیں جالندھری صاحب نے منتخب کیا اور چھاپ دیا' بلکہ خود اپنی مرتب کردہ کتاب بھی چھاپ دی۔ جالندھری صاحب سے جب اس بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے بتایا کہ یہ تمام تراجم سراج منیر نے کروائے اور اگر ایک آدھ باقی رہ گیا تو وہ سہیل عمر نے کرایا۔ مجھے

Marfat.com

تو یہ سب کچھ ورثے میں ملا ہے اور ان تمام مسودوں کی تاخیر کی وجہ یا تو نظرثانی میں سامنے آنے والی اغلاط ہیں یا پھر اصل مصنفین سے اجازت ہی نہیں لی گئی اور ہم نے کچھ لوگوں کو اجازت کے خطوط لکھے ہیں۔ امید ہے کہ چند دنوں میں ان خطوط کا جواب مل جائے گا۔

اس کے علاوہ رشید احمد جالندھری پر الزام ہے کہ انہوں نے درج ذیل کتابیں چھاپ دیں اور باقی آئندہ کے پروگرام میں رکھ دیں۔

☆ تاریخ فلسفہ اسلام۔ ڈی بوائر۔ ترجمہ عابد حسین، جب ادارہ ثقافت اسلامیہ نے یہ کتاب شائع کی، یہ ہندوستان سے چھپی ہوئی مل رہی تھی اور اردو بازار کے ایک ناشر ہندوستانی ترجمے کا عکس چھاپ چکے تھے۔ ماجد فخری کی تاریخ اسلام اور ایم ایم شریف کی اسی موضوع پر کتاب کے باوجود یہ کتاب شائع کرائی گئی۔

☆ جوہر تقویم۔ ضیاء الدین لاہوری۔ مصنف نے اب بغیر اجازت کتاب چھاپنے پر ادارہ کو قانونی نوٹس بھیج دیا ہے۔

☆ (Islam in South Asia) ۱۹۸۶ء میں ایک سیمینار میں پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ، مرتبہ ڈاکٹر رشید احمد جالندھری اور افضل حق قریشی۔

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ "ادارہ ثقافت اسلامیہ" کی زمین کی ملکیتی رجسٹریاں ادارے سے غائب کی جا چکی ہیں اور کوئی ایسا ثبوت نہیں کہ اس ادارے کے پاس کتنی زمین ہے اور کس کی ملکیت ہے۔ عام خیال یہی ہے کہ ادارہ سے منسلک مال روڈ کی یہ قیمتی اراضی کوئی اپنے نام کرا لے گا اور ایک وقت آئے گا کہ "ادارہ ثقافت اسلامیہ" کو اپنی ہی زمین پر کرایہ ادا کرنا پڑے گا۔

Marfat.com

پیپلز پارٹی کا "منور منج گروپ"

شیخوپورہ ملک کا واحد ضلع ہے جس کی سرحدیں سات دوسرے اضلاع کے ساتھ ملتی ہیں بلکہ اگر سرحد پار اضلاع کو بھی ساتھ شامل کر لیا جائے تو پھر ضلع شیخوپورہ ہندوستانی اضلاع گرداسپور، امرتسر اور پاکستانی اضلاع لاہور، قصور، اوکاڑہ، فیصل آباد، حافظ آباد، گوجرانوالہ اور نارووال کے درمیان پھیلی ہوئی ایک مستطیل پٹی کی مانند نظر آتا ہے۔ دریا کی گذرگاہ اور آب پاشی کی غرض سے نکالی گئی نہروں کی وجہ سے یہ علاقہ دنیا کا سب سے بہتر باسمتی چاول پیدا کرنے والا علاقہ ہے۔

لیکن آج یہ علاقہ مختلف نوعیت کے بہترین مجرم پیدا کرنے والا علاقہ ہے۔ سرکاری و غیر سرکاری اعداد و شمار اور رپورٹوں کے مطابق صوبہ پنجاب کے شمال مشرقی ضلع شیخوپورہ کو ملک کا سب سے بڑا جرائم پیشہ علاقہ قرار دیا جاتا ہے۔ ۸۰ء کے عشرے میں ایک حساس ادارے کی تیار کردہ تحقیقاتی رپورٹ کے مطابق ضلع شیخوپورہ کو "خطرناک ترین" علاقہ گردانا گیا تھا اور رپورٹ میں اس علاقہ کے خطرناک ہونے کی وجوہات بیان کرتے ہوئے لکھا گیا تھا کہ علاقہ میں بڑھتی ہوئی وارداتوں، جرائم پیشہ گروہوں، خطرناک اسلحہ اور سرحد پار سمگلنگ کی بڑی وجہ اس ضلع کی دریائے راوی کے ساتھ ساتھ چلتی ہندوستانی سرحد ہے۔

بیک وقت ۹ اضلاع کے درمیان واقع ہونے کی وجہ سے اور جنوبی سرحد کے ساتھ ساتھ دریا کے باعث اس ضلع کو سینکڑوں میل تک پھیلا ہوا "بیلہ" بھی میسر ہے، جسے جرائم پیشہ گروہوں کی "قدرتی پناہ گاہ" تصور کیا جاتا ہے۔ ۱۹۲۲ء (جب سے شیخوپورہ ضلع بنا ہے) سے لے کر ۱۹۹۷ء تک کی تاریخ اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ قرب و جوار کے جرائم پیشہ لوگوں کی بڑی اکثریت اپنے علاقوں میں جرائم کرنے کے بعد شیخوپورہ کا رخ کرتی رہی ہے۔

Marfat.com

ضلع شیخوپورہ کی تاریخ لکھتے ہوئے کئی انگریز مورخوں نے ضلع کے باسیوں کے جرائم پیشہ مزاج کا خصوصی حوالہ دیا ہے۔ ۱۹۳۰ء کی ایک تاریخی دستاویز میں ایک انگریز مورخ لکھتا ہے کہ ضلع کے اکثر لوگوں کا رجحان چھوٹے موٹے جرائم کی طرف ہے اور اس رجحان کی شدت بیلہ سے ملحقہ علاقوں میں زیادہ ہے۔ یہ لوگ اگر خود جرم نہ کر سکیں تو وابستگی بحال رکھنے کے لیے جرائم پیشہ لوگوں کو پناہ گاہیں ضرور مہیا کرتے رہتے ہیں۔

جرم کرنے کی یہ پرانی روایت دن بدن مضبوط ہوتی گئی اور جرائم کی عمومی شرح میں زیادہ شدت ہندوستانی سرحد سے ملحقہ علاقوں میں آئی۔ ۱۹۵۰ء کے دوران اس ضلع میں آباد کاری کا سلسلہ شروع ہوا اور مہاجرین کو زمینیں الاٹ کی جانے لگیں۔ ضلع میں آنے والے مہاجرین میں اکثریت کا تعلق جاٹ، راجپوت اور ارائیں برادریوں سے تھا جبکہ ان برادریوں کے لوگ پہلے سے آپس کی دشمنیاں بھی رکھتے تھے۔ دریا کے کنارے زمینوں کی الاٹ منٹ کے بعد ان کی دشمنیاں رنگ لانے لگیں اور مخالفین کے مال و متاع کی چوری کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کو قتل کرنے کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ آج بھی اگر اعداد و شمار اکٹھے کیے جائیں تو شہری علاقوں اور ترقی یافتہ قصبات کی نسبت دیہات اور خصوصاً سرحدی پٹی کے دیہات میں جرائم کی شرح بہت بلند ہے۔ مثال کے طور پر ضلع کے مشرقی حصہ "نارنگ منڈی" میں ہر سال ۲ سو سے زائد افراد کو قتل کر دیا جاتا ہے، ان کے گھر جلا دیے جاتے ہیں، مال مویشی اور زمینوں پر قبضہ کے بعد مقتولین کی عورتوں کے ساتھ زبردستی شادیاں رچا لی جاتی ہیں۔ تقریباً ایک درجن کے قریب دیہات اس علاقے میں ایسے مل جاتے ہیں جو پرانی دشمنیوں کی بھینٹ چڑھے اور آج کھنڈرات کی صورت میں موجود ہیں۔

ان خونی دشمنیوں کے مرکزی کردار عموماً اپنی پناہ سیاست کے میدان میں حاصل کرتے ہیں اور دیہاتی علاقوں میں اپنی اپنی بھرتی کردہ "فوجوں" کو ایک دوسرے کے مدمقابل چھوڑ کر خود شہروں میں جا بستے ہیں۔ چونکہ ان سیاست بازوں کا اصل "زور" دیہاتی علاقوں میں ہوتا ہے، اس لیے انتخابات میں یہ لوگ دیہات کے انتخابی حلقوں کو چنتے ہیں اور اپنے اپنے مسلح آدمیوں کی مدد سے پولنگ اسٹیشنوں پر قبضہ کر کے کامیابی حاصل کرتے ہیں۔ اقتدار ملنے کی صورت میں اپنی مسلح فوج کو سرکاری تحفظ فراہم کیا جاتا ہے اور طاقت استعمال کرتے ہوئے ان پر قائم ماضی کے مقدمات ختم کرا دیے جاتے ہیں جبکہ اپنے ان جرائم پیشہ حواریوں کو کھلی چھٹی دے دی جاتی ہے کہ وہ کرائے کے قاتلوں اور ڈکیتوں سے دولت حاصل کریں جبکہ ان مسلح افراد کے ایک حصے کو شہروں کی چونگیوں کے ٹھیکے لے کر

Marfat.com

دیے جاتے ہیں۔ اس طرح علاقہ میں بدمعاشی کا ایک سرکل چلتا رہتا ہے۔

ایک تحقیقاتی ادارے کی طرف سے اکٹھے کیے گئے اعداد و شمار کے مطابق پشاور کے بعد شیخوپورہ دوسرا بڑا علاقہ ہے جہاں سب سے بڑے پیمانے پر منشیات کا دھندہ ہوتا ہے۔ منشیات کی ایک بہت بڑی مقدار سرحد پار سمگل کی جاتی ہے جبکہ سرحد کے علاقوں سے ٹرکوں وغیرہ پر لائی گئی ہیروئن اور چرس سٹور کر کے دوسرے اضلاع میں فروخت کی جاتی ہے۔ شیخوپورہ کا وہ علاقہ جو نئے بننے والے ضلع حافظ آباد کے علاقہ نوشہرہ ورکاں کے ساتھ ملحق ہے، وہاں ایک اندازے کے مطابق بیس دیہات میں ہیروئن اور چرس سرعام فروخت ہوتی ہے۔ نوشہرہ کے علاقہ چھنی میں تو صورتحال یہاں تک جا پہنچی ہے کہ ہیروئن فروخت کرنے والے مسافر بسیں روک کر ہیروئن کی پڑیاں فروخت کرتے ہیں۔

علاقہ چھنی میں ایک سابقہ ممبر قومی اسمبلی کے تقریباً تین سو افراد پیدل، سائیکلوں اور موٹر سائیکلوں پر ہیروئن فروخت کرتے ہیں۔ ہیروئن فروخت کرنے والے ان افراد کا لباس تقریباً ایک جیسا ہوتا ہے۔ ایک ہیروئن فروش عموماً جینز کی پتلون یا تنگ پائنچوں والی شلوار پہنتا ہے اور ہمیشہ اپنے گلے میں دو تھیلے لٹکائے رکھتا ہے۔ اس کے ایک تھیلے میں کلاشنکوف کی گولیاں اور دوسرے میں کلو سے دو کلوگرام تک اعلیٰ کوالٹی کی ہیروئن ہوتی ہے جبکہ دائیں ہاتھ میں غیر ملکی قیمتی کلاشنکوف اور بائیں ہاتھ میں سناروں کے استعمال کی چھوٹی ترازو اور دس گرام سے پانچ سو گرام تک کے باٹ ہوتے ہیں۔ یہ لوگ عموماً گشت کرتے رہتے ہیں اور "سودا" بیچتے پھرتے ہیں۔ ہر گاؤں میں ان ہیروئن فروشوں کی نگرانی اونچی جگہوں پر بیٹھے دوربینوں والے افراد کرتے ہیں جن کے پاس پولیس سے چھینے ہوئے وائرلیس سیٹ اور موبائل ٹیلی فون ہوتے ہیں جو کسی بھی وقت اپنے ان آدمیوں کو روپوش ہو جانے کا حکم دے دیتے ہیں۔ واضح رہے کہ دو سال پہلے اس علاقہ میں ایک حساس ادارے نے آپریشن کیا تھا جو کہ ان جرائم پیشہ لوگوں کے پاس جدید ترین آلات مواصلات اور اسلحہ ہونے کی وجہ سے مکمل طور پر ناکام ہوگیا تھا۔

خاندانی دشمنیوں کا جو سلسلہ شیخوپورہ کے مشرقی حصہ "نارنگ منڈی" میں شروع ہے اور جس کے نتیجے میں درجنوں دیہات ویران ہو چکے ہیں، یہی سلسلہ ضلع شیخوپورہ کے مغربی کنارے میں بھی پوری شدت کے ساتھ جاری ہے۔ مثال کے طور پر خانقاہ ڈوگراں کے ایک نواحی گاؤں میاں والی ڈوگراں میں باہمی دشمنیوں کے باعث قتل و غارت گری کے بعد یہ صورتحال ہے کہ اس وقت اس گاؤں میں ایک بھی مرد باقی نہیں۔ مردوں کی اکثریت

Marfat.com

اول تو قتل ہو چکی ہے، بہت بڑی تعداد جیلوں میں پڑی ہے اور جو باقی بچے ہیں وہ سرحد کے قبائلی علاقوں میں پناہ حاصل کر کے راکٹ لانچروں اور دوسرے جدید اسلحہ کے استعمال کی تربیت حاصل کر رہے ہیں جبکہ ان مفروروں کی ایک معقول تعداد گوجرانوالہ کے علاقہ واہنڈو، سکھانہ باجوا اور نارنگ منڈی کے سرحدی دیہات میں روپوش ہے، جبکہ گاؤں میں عورتیں اور چھوٹے بچے رہتے ہیں۔ اکثر اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی ایک خاندان کے بچے اور عورتیں ہلکے ہتھیاروں پستول اور کاربین وغیرہ سے مخالفین پر حملہ کر دیتے ہیں۔

ضلع شیخوپورہ میں جرائم کی تاریخ اور موجودہ صورتحال کا ذکر کرتے ہوئے سب سے پہلے شیخوپورہ شہر کا ذکر ضروری محسوس ہوتا ہے، کیونکہ علاقے میں ہونے والے جرائم کے سوتے اس شہر سے پھوٹتے ہیں۔ تقریباً ۵ لاکھ نفوس پر مشتمل اس شہر کا مکمل کنٹرول جرائم پیشہ افراد کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ جرائم پیشہ افراد دیہات میں پھیلی اپنی دشمنیاں سنبھالتے ہیں اور شہر میں عالیشان کوٹھیاں بنا کر رہتے ہیں، مختلف اڈوں اور بازاروں سے بھتہ وصول کرتے ہیں اور اگر ان کا تعلق کسی سیاسی جماعت سے ہو اور اگر ان میں سے کوئی ایک کسی اسمبلی کا رکن ہو اور اس کی سیاسی جماعت اقتدار میں ہو تو پھر یہ لوگ شہر کی چونگیوں کے ٹھیکے حاصل کرتے ہیں اور سرکاری اداروں سے بھتہ وصول کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک سال پہلے تک شہر کے باسی دو سیاست دان جو قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے رکن تھے، اپنی اپنی اسمبلیوں کی مناسبت سے شہر میں موجود وفاقی اور صوبائی محکموں اور اداروں سے ماہانہ بھتہ وصول کرتے تھے۔

اس وقت شیخوپورہ شہر میں پانچ بڑے گروپ سرگرم عمل ہیں جو تمام کے تمام مختلف سیاسی پارٹیوں سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے سربراہ ہر دور میں قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے رکن منتخب ہوتے آئے ہیں۔ اور چار گروپوں کے سربراہ، سابق ارکان اسمبلی اور وزیر پیپلز پارٹی کی سابقہ حکومت میں شامل تھے۔ ان پانچ مسلح گروپوں میں سے تین گروپ باقاعدہ خونی دشمنیوں کی تاریخ رکھتے ہیں جبکہ دو گروپ نئے ہیں جو صرف شہر کی حد تک فعال ہیں اور ان کا کاروبار ابھی تک شہر کے خالی پلاٹوں پر قبضہ، محصول چونگیوں اور سرکاری اور سرکاری اداروں سے بھتہ کی وصولی تک محدود ہے جبکہ باقی تین گروپوں کے سینکڑوں افراد دشمنیوں میں قتل ہو چکے ہیں اور ان کے دھندوں میں منشیات و اسلحہ کی خرید و فروخت بھی شامل ہے۔

منور منج گروپ

شیخوپورہ شہر میں سرگرم عمل سب سے بڑا اور مسلح گروپ منج خاندان کا ہے۔ اس

Marfat.com

گروپ کا سربراہ منور منج سابق رکن قومی اسمبلی ہے۔ منور منج جو سابقہ قومی اسمبلی کی انسداد منشیات کی سٹینڈنگ کمیٹی کا عہدیدار تھا' ۱۴ اپریل ۹۵ء کو شیخوپورہ سے پکڑی جانے والی ہیروئن اور چرس کی بھاری مقدار کی "ملکیت" کے الزام میں کئی ماہ جیل میں رہا۔

منور حسین منج کا تعلق راجپوت خاندان سے ہے' اس کا دادا اللہ دتہ بھارت کے ضلع امرتسر کا ایک معمولی کاشتکار تھا۔ منج خاندان پر الزام لگایا جاتا ہے کہ امرتسر میں بھی اس خاندان کی شہرت "رسہ گیر" کے طور پر تھی۔ منور منج کا والد فقیر حسین اور دادا اللہ دتہ تھوڑی سی زرعی اراضی کے مالک تھے جو خود کھیتی باڑی کرتے تھے۔ تقسیم کے بعد منج خاندان ضلع گوجرانوالہ کے تھانہ نوشہرہ ورکاں کے ایک گاؤں تتلے حکیم حیدر علی میں آباد ہوا۔ اس خاندان کو ہندوستان والی اراضی کے بدلے میں تھوڑی سی زمین تتلے حکیم حیدر علی میں الاٹ ہوئی جہاں انہوں نے کاشتکاری شروع کی۔

منج خاندان کے افراد نے گوجرانوالہ کے علاقہ میں بھی چھوٹے موٹے جرائم کو ذریعہ روزگار بنایا اور مویشی چوری کے ساتھ ساتھ نہری پانی بھی چوری کرنے لگے۔ ان کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ وہ نہر کا تمام پانی چوری کر لیتے اور محکمہ انہار کے ملازمین ان کے گاؤں میں نہ جاتے۔ آہستہ آہستہ اس خاندان کے افراد نے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا جبکہ کئی افراد مقامی سیاست دانوں کے مسلح افراد میں شامل ہوگئے۔ منج خاندان کا علاقے کے سیاستدانوں کے ساتھ دشمنی کا آغاز ہوا۔ مخالف سیاست دانوں نے مسلح آدمیوں کے ساتھ تتلے حکیم حیدر علی پر حملہ کیا تو منج خاندان ۷۰ء میں تتلے حکیم حیدر علی کو چھوڑ کر شیخوپورہ شہر میں چلے آئے۔ منور منج جو شیخوپورہ کالج میں زیر تعلیم تھا' اس نے طلبہ سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔

منج خاندان کی سیاست میں پہلی کامیابی ۷۹ء میں ہوئی جب منور منج بلدیہ کا کونسلر منتخب ہوا۔ اس کے بعد ۸۳ء میں بھی منور منج کونسلر منتخب ہوگیا' ۸۵ء کے انتخابات میں منور منج نے صوبائی اسمبلی کے رکن کے لیے انتخابات میں حصہ لیا۔ ان انتخابات سے ہی منور منج خاندان کی دشمنی شروع ہوئی۔ گورنمنٹ گرلز سکول شیخوپورہ کے پولنگ اسٹیشن پر منور منج کے بھتیجے نے مدمقابل بلوچ خاندان کو گالیاں دیں اور نوبت ہاتھا پائی تک پہنچ گئی۔ تھوڑی دیر بعد منور منج کا چھوٹا بھائی اپنے مسلح ساتھیوں کے ہمراہ پولنگ اسٹیشن پر پہنچا اور اس نے بلوچوں کو مارنا شروع کر دیا۔ اس جھگڑے میں ایک بلوچ نے خنجر نکال کر منور منج

کے بھائی پر حملہ کر دیا۔ منور منج کا بھائی موقع پر ہلاک ہوگیا اور بلوچ تمام پولنگ اسٹیشنوں سے بھاگ گئے۔

بلوچوں کے فرار کے بعد منج خاندان کے لوگوں نے تمام پولنگ اسٹیشنوں پر جعلی ووٹ ڈالے اور انتخابات میں کامیابی حاصل کر لی۔ بلوچ خاندان کی طرف سے سابقہ چیئرمین بلدیہ اقبال ڈار سامنے آیا' کچھ عرصہ بعد دونوں گروپوں میں صلح ہوگئی۔ بلوچوں سے صلح کے بعد منور منج نے میجر شاہ نامی شخص کے ساتھ مل کر ایک کار خریدی اور اسے کرائے پر چلانے لگا۔

ایک دن ایسا ہوا کہ بلوچ خاندان کو فیصل آباد تاریخ بھگتنے جانا تھا' کچھ دن پہلے منور منج عمرہ کرنے سعودی عرب چلا گیا جس دن بلوچ خاندان فیصل آباد کچہری میں جانے والا تھا۔ اس دن میجر شاہ اپنی گاڑی سمیت بلوچوں کے گھر پہنچا اور انہیں پیش کش کی کہ وہ اس کی کار میں چلیں۔ دوسری طرف منور منج کے بھائیوں نے مقامی تھانہ میں منور منج کی پجارو اور کلاشنکوف کی گمشدگی کا مقدمہ درج کرا دیا۔ اسی دن ایک پجارو میں مسلح افراد نے بلوچوں کی کار کو راستہ میں روک کر فائر کھول دیا۔ بلوچ خاندان کے ۷ افراد ہلاک ہوئے اور باچہ بلوچ نامی ایک شخص زندہ بچ گیا' بعد میں باچہ خان نے اپنا چھوٹا سا گروپ بنا لیا اور منور منج کی تلاش شروع کر دی۔

اس دوران منج خاندان کے افراد نے باچہ پر کڑی نگاہ رکھی۔ ۸۷ء میں باچہ خان منور منج کے آدمیوں سے فرار ہونے لگا تھا کہ دھر لیا گیا۔ منور منج خاندان بلوچ خاندان کے اس شخص کی تلاش میں تھا جس نے ۸۵ء کے انتخابات کے موقع پر منور منج کے چھوٹے بھائی کو خنجر مار کر ہلاک کیا تھا۔ باچہ بلوچ کو منور منج کے آدمیوں نے چھ سات دن تک نامعلوم مقام پر رکھا اور پھر اچانک ایک دن منج خاندان کے آبائی گاؤں تتلے حکیم حیدر علی لے گئے۔ تتلے میں باچہ بلوچ کو منور منج کے مقتول بھائی کی قبر پر لے جایا گیا اور قبر پر کھڑا کر کے اس کے جسم کا قیمہ کر دیا گیا۔ مقتول کی مسخ شدہ لاش کئی دن تک قبرستان میں پڑی رہی۔

منور منج کے ایم پی اے بننے کے بعد اس کے گروپ نے تتلے حکیم حیدر علی میں واقع ملک ریاست علی (صدر پی پی شہید بھٹو گروپ) کی فروخت شدہ اراضی پر قبضہ کر لیا۔ اس کے علاوہ ساہو کی ملیاں نامی ایک گاؤں میں بھی تین مربع اراضی پر منج خاندان نے قبضہ کر لیا۔ ڈپٹی کمشنر شیخوپورہ کی تیار کردہ رپورٹ کے مطابق منور منج ایک بہت چالاک

Marfat.com

شخص ہے جو ضلع کے جرائم پیشہ گروپوں کی مکمل پشت پناہی کرتا ہے لیکن اپنے ملوث ہونے کا نشان تک نہیں چھوڑتا۔

۹۰ء کے انتخابات میں منور منج نے طاہرالقادری کی "پاکستان عوامی تحریک" کے ٹکٹ پر انتخابات میں حصہ لیا اور اسلامی جمہوری اتحاد کے امیدوار نے اسے شکست دے دی۔ ۹۳ء میں منور منج پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل ہوگیا۔ منور منج کے حلقہ سے مشتاق اعوان سابقہ سینئر وزیر پنجاب نے بھی قومی اسمبلی کی ٹکٹ کے لیے درخواست دی لیکن غلام مصطفٰی کھر کی طرف سے منور منج کی حمایت پر مشتاق اعوان کو ٹکٹ نہ دیا گیا۔ ۹۳ء میں منور منج نے قومی اسمبلی کا انتخاب جیت لیا جبکہ مشتاق اعوان بھی صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوگئے۔ مشتاق اعوان اور منور منج کے درمیان شروع دن سے مخالفت چل نکلی اور شیخوپورہ میں ان کے دائرہ کار کی تقسیم اس طرح ہوئی کہ شہر میں واقع صوبائی حکومت کے اداروں سے مشتاق اعوان کے آدمی ماہانہ بھتہ وصول کریں گے جبکہ وفاق کے زیرانتظام محکموں اور اداروں سے منور منج کے آدمی بھتہ وصول کریں گے۔ بھتہ کی وصولی کا یہ کام ۱۴ اپریل ۹۵ء تک دونوں ارکان اسمبلی کے درمیان چلتا رہا لیکن منور منج کی منشیات کے ایک کیس میں گرفتاری کے بعد مشتاق اعوان پوری طرح شہر پر حاوی ہوگیا اور وفاقی اداروں سے وصول ہونے والا بھتہ بھی اعوان گروپ کو ملنے لگا۔

۱۴ اپریل ۹۵ء، شیخوپورہ میں انٹی نارکوٹکس حکام اور مقامی پولیس نے ناکہ لگا کر منور منج کی گاڑی میں سے ۳۵ کلوگرام ہیروئن اور ۳۰ کلوگرام چرس برآمد کرلی۔ گاڑی کے ڈرائیور محمد صدیق نے اقرار کرلیا کہ یہ گاڑی اور ہیروئن منور منج کی ملکیت ہے۔ منور منج نے بعدازاں ہائی کورٹ سے ضمانت قبل از گرفتاری کرا لی جو بعد میں منسوخ کردی گئی اور منور منج کو گرفتار کرلیا گیا۔ چند ماہ جیل میں گزارنے کے بعد ایک بار پھر منور منج ضمانت پر رہا ہوگیا۔

منور منج نے اکتوبر ۹۳ء سے ۱۴ اپریل ۹۵ء تک شیخوپورہ شہر کے سینکڑوں پلاٹوں پر اپنے آدمیوں سے قبضہ کرایا اور اپنے مسلح آدمیوں کی ایک پوری فوج کو شہر سے بھتہ اکٹھا کرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ اس عرصہ میں شیخوپورہ میں ہونے والی ڈکیتی کی تمام وارداتوں میں منور منج کے آدمی ملوث رہے جبکہ شیخوپورہ کے ایس ایس پی الطاف مجید کے ساتھ بھی منج کے خصوصی تعلقات تھے' جس کے باعث ضلع شیخوپورہ میں منور منج اور اس کے مسلح آدمیوں کے خلاف کوئی مقدمہ درج نہ کیا جاتا۔

Marfat.com

منور منج کے خلاف درج ہونے والے مقدمات

۱ - مقدمہ نمبر ۷۲/ ۱۱۰ مورخہ ۷۲ -۰۳ -۲۸ جرم ۳۳۲/ ۳۵۳‘ ۸۶ ۔/ ۳۴۱ تھانہ شیخوپورہ۔

۲ - مقدمہ نمبر ۸۱/ ۵۵۱ مورخہ ۸۱ -۱۱ -۱۲ جرم ۳۰۷/ ۳۰۲/ ۱۴۹/ ۱۴۸ تھانہ شاہدرہ لاہور۔

۳ - مقدمہ نمبر ۸۲/ ۱۰۳ مورخہ ۸۲ -۰۷ -۲۱ جرم ۶۵ -۲۰ -۱۳ اے او تھانہ نوشہرہ ورکاں گوجرانوالہ۔

۴ - مقدمہ نمبر ۸۲/ ۳۷۱ مورخہ ۸۲ -۰۷ -۲۱ جرم ۲۵ -۲۰ -۱۳ اے او تھانہ سٹی شیخوپورہ۔

۵ - مقدمہ نمبر ۸۲/ ۳۰۳ مورخہ ۸۲ -۰۷ -۲۱ جرم ۳۰۷ ب تھانہ کرشن نگر لاہور۔

۶ - مقدمہ نمبر ۸۲/ ۱۳۲ مورخہ ۸۲ -۰۳ -۳۰ جرم ۳۰۲ ت پ تھانہ بھائی پھیرو ضلع قصور۔

۷ - مقدمہ نمبر ۸۶/ ۲۱۵ مورخہ ۸۶ -۰۴ -۰۹ جرم ۵۰۶ ب ت تھانہ سٹی شیخوپورہ۔

۸ - مقدمہ نمبر ۸۶/ ۲۱۶ مورخہ ۸۶ -۰۴ -۰۹ جرم ۵۰۶ ب ت تھانہ سٹی شیخوپورہ۔

۹ - مقدمہ نمبر ۸۸/ ۲۷۶ مورخہ ۸۸ -۱۱ -۲۷ جرم ۳۰۲/ ۱۴۸/ ۱۴۹ تھانہ نشاط آباد فیصل آباد۔

۱۰ - مقدمہ نمبر ۹۰/ ۷۷ مورخہ ۹۰ -۰۷ -۲۷ جرم ۳۵۳/ ۳۰۷‘ ۱۴۸/ ۲۲۵ تھانہ سٹی اے ڈویژن شیخوپورہ۔

۱۱ - مقدمہ نمبر ۹۰/ ۴۷۲ مورخہ ۹۰ -۰۹ -۲۶ جرم ۷۹ -۰۴ -۱۱ تھانہ سٹی اے ڈویژن شیخوپورہ۔

۱۲ - مقدمہ نمبر ۹۲/ ۲۹۰ مورخہ ۹۲ -۰۷ -۰۷ جرم ۱۸۸ تھانہ لوئر مال لاہور۔

۱۳ - مقدمہ نمبر ۸۹/ ۲۸۹ مورخہ ۸۹ -۰۵ -۲۵ جرم ۳۶۴/ ۱۴۸/ ۱۴۹/ تھانہ صدر فاروق آباد۔

۱۴ - مقدمہ نمبر ۹۰/ ۲۷۷ مورخہ ۹۰ -۱۲ -۱۸ جرم ۳۳۷/ ۲۷۹/ -۰۰ تھانہ صدر شیخوپورہ۔

Marfat.com

۱۵ - مقدمہ نمبر ۹۴ ، ۳۹۲ مورخہ ۹۴ -۰۸ -۰۴ جرم ۸ ، ۳۹۵ ، ۴۳۶ ، ۳۹۵ ‘ ۵۰۵ ، ۴۲۷ ‘ ۴۸ ، ۱۴۹ ‘ ۱۶ ایم پی او تھانہ بی ڈویژن شیخوپورہ۔

منور منج کے علاوہ قبضہ گروپوں میں شامل شیخوپورہ کا ایک بڑا گروپ جماعت اسلامی کے ایک سربراہ ایم این اے کی سربراہی میں چلتا ہے۔ شیخوپورہ شہر کے تمام قیمتی اور بڑے بڑے پلاٹ اس گروپ کے قبضہ میں ہیں‘ جب کہ آج کل یہ گروپ زیر زمین ہے۔

۳۵ ارب کے سندک پراجیکٹ میں گھپلے

تمام تر حکومتی رکاوٹوں کے باوجود یہ امید پیدا ہوگئی تھی کہ گزشتہ سال، ۲۱ برس سے جاری قومی اہمیت کا منصوبہ "سندک پراجیکٹ" اپنا کام شروع کر دے گا لیکن گزشتہ سال نومبر کے اوائل میں وزیراعظم بے نظیر بھٹو نے اس کی افتتاحی تقریب ملتوی کر دی اور بعد ازاں ۲۴ نومبر کو وفاقی حکومت نے پراجیکٹ کی امداد بند کر دی۔ امداد روکنے کے فیصلہ کے وقت حکومت نے پراجیکٹ انتظامیہ کو عندیہ دیا کہ حکومت اس کو پرائیوٹائز کرنا چاہتی ہے۔ بعد ازاں وزیراعظم کے مشیر برائے خزانہ وی اے جعفری نے سندک پراجیکٹ کو "بے پیندے کا کنواں" قرار دے کر اعلان کیا کہ اسے نجی تحویل میں دینا ہی بہتر فیصلہ ہوگا۔ جس وقت یہ فیصلہ کیا گیا اس وقت پراجیکٹ کو کام شروع کرنے کے لیے ۲ ارب ۱۳ کروڑ ۵۰ لاکھ روپے کی ضرورت تھی اور اس کی بھٹیاں چل رہی تھیں۔ واضح رہے کہ سمیلٹنگ کی بھٹیاں ایک دفعہ گرم کرنے کے بعد مسلسل تین ماہ تک ضرور چلانا ہوتی ہیں بصورت دیگر کروڑوں روپے مالیت کی اینٹیں تبدیل کرنا پڑتی ہیں۔ شروع میں جب بھٹیاں چلائی گئیں تو ماہرین کا خیال تھا کہ خام مال لگاتار چھ ماہ بھٹیوں کو مہیا کیا جاتا رہے گا لیکن یہ خیال درست ثابت نہ ہوسکا اور خام مال صرف ۲۲ دن تک چل سکا اور اس کے بعد انتظامیہ کو خالی بھٹیاں جلانا پڑیں جس کی وجہ سے بغیر کسی پیداواری عمل کے ایندھن کی ایک بڑی مقدار ضائع ہوتی رہی۔ تقریباً ایک ہفتہ بعد فیصلہ کیا گیا کہ بھٹیاں بند کر دی جائیں اور جب تک حکومتی امداد نہیں کھلتی دیگر کام روک کر بھٹیوں کی اینٹیں تبدیل کر دی جائیں۔

امداد بند کرنے سے کچھ عرصہ پہلے حکومت نے سندک پراجیکٹ کے لیے ۳۰ کروڑ روپے کا بندوبست کیا تھا جس میں سے ۹ کروڑ روپے ٹیکس اور ڈیوٹی کی مد میں خرچ ہوگیا۔ بے نظیر حکومت نے صرف دو ارب ساڑھے تیرہ کروڑ بچانے کے لیے ۳۵ ارب کے اس

Marfat.com

پراجیکٹ اور پاک چین ماہرین کی ۲۱ سالہ محنت پر پانی پھیر دیا۔

جب کوئٹہ میں سندک پراجیکٹ انتظامیہ کے طور پر موجود پراجیکٹ ڈائریکٹر اور دیگر انجینئروں سے بات کی گئی تو انہوں نے کہا کہ سندک پراجیکٹ کو جہاں حکومتی "اقدامات" کے باعث خدشات لاحق ہیں وہاں مقامی بلوچ سرداروں کی طرف سے بھتہ' اغواء برائے تاوان اور ڈکیتی کی وارداتوں کو بھی بڑا دخل ہے۔ انتظامیہ کے مطابق سندک پراجیکٹ کے لیے ۵۵ کلومیٹر دور واقع ایک کنواں سے پانی لانا پڑتا ہے جس پر گزشتہ کئی ماہ سے ایک بلوچ سردار قابض ہو چکا ہے جو منہ مانگی رقم "کرایہ" کے طور پر طلب کرتا ہے۔

سندک پراجیکٹ کے ایک اہم عہدے دار نے بتایا اس پراجیکٹ کو بہت زیادہ منافع بخش بنایا جا سکتا تھا اور اس سلسلے میں پراجیکٹ انتظامیہ ایران کے ساتھ بات چیت کر رہی تھی کہ جو مشینری چین سے ۶ ہزار کلومیٹر کا یکطرفہ فاصلہ طے کر کے منگوائی جاتی ہے وہ صرف ۲۵۰ کلومیٹر کا فاصلہ طے کر ایران سے سستی منگوائی جا سکتی ہے جبکہ اس مقصد کے لیے سڑک پہلے ہی سے موجود ہے۔ لیکن حکومتی اقدامات کے بعد یہ واضح ہو چکا ہے کہ اب سندک پراجیکٹ اپنی موت آپ مر جائے گا۔ ۲۱ سال کی محنت کے بعد انجینئر اور کارکنان اس قابل ہوئے تھے کہ پراجیکٹ پیداوار دے لیکن اس کا گلا دبا دیا گیا۔

اس وقت پراجیکٹ کے سٹاک میں ۱۵۰۰ ٹن کا ذخیرہ موجود ہے جو بعد میں نکالا گیا ہے۔ لیکن اب پراجیکٹ کے پاس پیسے نہیں کہ وہ بھٹیاں چلا سکے۔ اس پراجیکٹ کا سب سے بڑا فائدہ ضلع چاغی کے ان پسماندہ باسیوں کو ہونا تھا جنہیں گزشتہ برسوں میں تربیت دی گی۔ بلوچستان اسمبلی میں یہ آرڈیننس بھی پاس ہوا تھا کہ سندک میں کام کرنے والے پاکستانی کارکنوں میں ۸۰ فی صد چاغی کے رہائشی ہوں گے۔

پس منظر اور حقائق

۷۰ء کے عشرے کے شروع میں پاکستانی وزارت معدنی ترقی کے سائنس دانوں کی ایک ٹیم تیل کی تلاش میں صوبہ بلوچستان کے صحرائی ضلع چاغی میں گئی' جہاں شروع میں اسے سونے چاندی اور تانبے جیسی دھاتوں کے چھوٹے چھوٹے ذخیرے ملے جنہیں زمین کی تہہ سے نکالنے کے لیے ان کی اصل قیمت سے زیادہ لاگت کی مشینری اور افرادی قوت درکار تھی۔ ۱۹۷۴ء میں وزارت معدنی ترقی کی ایک تحقیقاتی ٹیم کو تیل کی تلاش کے دوران "سندک" اور دوسرے دیہات میں سونے' چاندی اور تانبے سمیت دیگر دھاتوں کے وسیع

Marfat.com

ذخائر ملے، جو پہلے سے دریافت شدہ قیمتی دھاتوں کے چھوٹے ذخائر سے کئی سو گنا بڑے اور سطح زمین کے قریب تھے۔

ان ذخائر کی دریافت کے بعد ذوالفقار علی بھٹو حکومت نے وزارت معدنی ترقی میں الگ شعبہ قائم کیا جس کو وسائل ترقیاتی کارپوریشن کا نام دیا گیا، جس کا مقصد یہ تھا کہ منصوبہ بندی کر کے ان دھاتوں کو کس طرح ذریعہ آمدنی بنایا جا سکتا ہے۔ ۱۹۷۴ء سے ۱۹۷۷ء تک بھٹو حکومت نے اس منصوبے پر تقریباً ۴ ارب روپے خرچ کیے اور چاغی کے نواحی علاقوں میں درجنوں ایسے پلانٹ نصب کیے گئے جو نسبتاً کم گہرائی میں موجود دھاتوں کو نکال سکتے تھے۔ بھٹو حکومت کے خاتمے کے بعد ضیاء الحق کی فوجی حکومت نے مذکورہ بالا منصوبے کی طرف توجہ نہ دی۔ بھٹو دور میں شروع ہونے والا کام بھی رک گیا اور وزارت معدنی ترقی تقریباً بے بس ہو کر رہ گئی۔ اگرچہ اس دوران حکومت کے پاس کوئی ایسی جدید ٹیکنالوجی موجود نہ تھی جس سے خام مال کی صورت میں زمین سے نکالی گئی قیمتی دھاتوں کو علیحدہ علیحدہ کیا جاتا شاید حکومت اس خام مال کو سٹاک کر کے بیچنا چاہتی تھی لیکن اسے مہلت نہ مل سکی۔

ضیاء حکومت کے آخری برسوں میں معدنی وسائل کی وزارت کی طرف سے اچانک اس پراجیکٹ کی طرف توجہ بڑھی اور بعض حکومتی کوششوں کے بعد ۱۹۸۷ء میں چین کی حکومت نے پاکستان کو پیش کش کی کہ وہ بلوچستان کے ان علاقوں سے سونے، چاندی اور تانبے وغیرہ کی دھاتوں کو زمین سے نکالنے اور انہیں صاف کر کے علیحدہ علیحدہ دھاتوں کی شکل میں ڈھالنے کے لیے تیار ہے لیکن شرط یہ ہوگی کہ اسے کل حاصل شدہ دھاتوں کا چالیس فی صد حصہ دیا جائے۔ اس کے علاوہ تمام مشینری حکومت چین مہیا کرے گی جب کہ اس کی تنصیب، جگہ اور اضافی عملہ کے اخراجات پاکستان کو برداشت کرنا ہوں گے۔ حکومت پاکستان نے چین کی پیش کش قبول کر لی اور ۱۹۸۹ء میں چین کی میٹالوجیکل کنسٹرکشن کمپنی (MCC) اور سندک میٹلز لمیٹڈ (SML) کے درمیان معاہدہ طے پا گیا اور منصوبے کا نام "سندک پراجیکٹ" تجویز کیا گیا۔

۱۹۹۱ء میں دونوں ممالک کی مذکورہ بالا کمپنیوں کے درمیان معاہدے کو قابل عمل بنایا گیا اور طے یہ ہوا کہ چین کی ایم سی سی ۱۹۹۵ء تک اس پراجیکٹ کو مکمل کرے گی اور اس دوران زمین کی تہہ سے نکالی جانے والی خام دھاتیں سمیلٹنگ پلانٹ میں علیحدہ علیحدہ کی جائیں گی اور ان تمام کا چالیس فی صد حصہ حکومت چین کو ملے گا جب کہ ساٹھ فیصد

Marfat.com

پاکستان کو اور اس دوران ایم س سی کے سائنس دان اور تربیت یافتہ کارکن پاکستانی کارکنوں اور انجینئروں کو اس قابل بنائیں گے کہ وہ خود پلانٹ کو سنبھال سکیں۔

معاہدے میں یہ بھی طے پایا کہ چار سال کی مدت ختم ہو جانے کے بعد ایم سی سی اس پلانٹ کو حکومت پاکستان کے حوالے کر دے گی اور اپنے کارکنوں کو یہاں سے نکال لے گی۔ پیداوار شروع ہونے کے بعد جو ساٹھ فیصد حصہ پاکستان کو ملنا تھا اس کا تخمینہ لگایا گیا تو پاکستان کے حصے میں سالانہ اڑھائی کروڑ ڈالر کی خطیر رقم آتی تھی۔ مسلسل پیداوار کے چار سال بعد پاکستان کو اس پراجیکٹ اور اس کی پیداوار کے تنہا مالک ہونے کی حیثیت سے سالانہ ساڑھے پانچ کروڑ ڈالر کا فائدہ ہونا تھا جب کہ پراجیکٹ میں ۱۲۸۸ ہنر مندوں کو براہ راست اور ۱۱۰۰۰ سے زائد نیم ہنر مند افراد کو بالواسطہ ملازمت کے مواقع ملنا تھے۔

لیکن ابتدا ہی میں پراجیکٹ کے مکمل ہونے کی رفتار میں رکاوٹیں پڑنا شروع ہو گئیں اور نواز شریف دور میں سندک پراجیکٹ تقریباً بند ہو کر رہ گیا اگرچہ اس دوران سندک پراجیکٹ کو حکومتی چشم پوشی کے باوجود بیرون ملک فرموں سے قرضے ملتے رہے کیونکہ سمیلٹنگ کی تنصیب کا کام جاری تھا۔ واضح رہے کہ کئی غیر ملکی سرمایہ دار کمپنیاں اس پراجیکٹ کو قرضوں کی صورت میں بھاری مالی امداد دیتی تھیں۔

۹۳ء میں بے نظیر بھٹو کے دوبارہ برسراقتدار آنے کے بعد وفاقی حکومت نے سندک پراجیکٹ کو نئے سرے سے شروع کیا اور حکومتی امداد جو کئی برسوں سے بند تھی جاری کی۔ نواز شریف کے دور حکومت میں سندک پراجیکٹ کو بعض حوالوں سے شدید نوعیت کے نقصانات کا سامنا کرنا پڑا۔ جن میں سرفہرست برسر اقتدار بلوچ سرداروں کی طرف سے یہاں پر کام کرنے والے کارکنوں سے ہر تنخواہ میں "بھتہ" وصولی کی رسم کا آغاز تھا جو آج تک پورے زور و شور کے ساتھ جاری ہے اور اس وقت حالت یہ ہے کہ سندک پراجیکٹ پر کام کرنے والا ہر کارکن اپنی تنخواہ میں سے ۵ فی صد حصہ بطور "بھتہ" مقامی سرداروں کو ادا کرتا ہے۔ "بھتہ" کی یہ رسم صرف کارکنوں کی تنخواہوں تک محدود نہیں رہی بلکہ سندک پراجیکٹ کی حدود میں جاری تعمیراتی کام کے ٹھیکیداروں سے بھی بھاری رقوم بھتہ کی وصول کی جاتی ہے۔

بھتہ وصول کرنے والوں میں برسر اقتدار پیپلز پارٹی کے ایک مقامی ایم۔ این۔ اے پوری طرح شامل تھے جو ہر ماہ دو سے اڑھائی کروڑ روپیہ بھتہ وصول کرتے۔ بھتہ وصولی کی وجہ سے ان دنوں تعمیرات کا تقریباً ۲۰ فی صد کام بند پڑا ہے جب کہ کارکنوں کی

Marfat.com

ایک بڑی تعداد یہاں سے بھاگ رہی ہے جن کو بھتہ دینے سے انکار پر اغوار کر لیا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ ملا راکٹی نے بھی سندک پراجیکٹ کے دو چینی انجینئروں کو اغواء کیا تھا۔

بے نظیر دور میں ۱۲ ارب سے شروع کیے گئے سندک پراجیکٹ کے سمیلٹنگ پلانٹ اور رہائشی کالونیوں سمیت دیگر کاموں میں تقریباً ۲۵ ارب روپے خرچ ہو چکے ہیں۔ بعد کے ایک معاہدے کے میں طے پایا کہ پراجیکٹ میں پیداواری عمل یکم اگست ۹۵ء کو مکمل طور پر شروع ہو جائے گا۔ اس معاہدے میں یہ بھی شامل تھا کہ شروع میں تین ماہ تک آزمائشی پیداوار کا عمل ہوگا۔ یکم نومبر سے پیداواری عمل شروع نہ ہوسکا یہ قرار پایا تھا کہ اگر یکم نومبر سے پیداواری عمل شروع نہ ہو سکا تو حکومت پاکستان سندک پراجیکٹ میں سرمایہ کاری کرنے والی ملکی و غیر ملکی کمپنیوں کو تقریباً ۵۰ لاکھ ڈالر ماہانہ "سود" ادا کرے گی۔ جبکہ دو ماہ سے زیادہ تاخیر ہونے کی صورت میں اس جرمانہ نما سود کی رقم میں ۹ ہزار ڈالر روزانہ اضافہ ہوتا جائے گا۔ اس سے پہلے حکومت نے دسمبر ۹۴ء میں احکامات جاری کیے تھے کہ سندک پراجیکٹ کے اعلیٰ انتظامی افسران فوری طور پر پراجیکٹ کے مسائل کا جائزہ لے کر حکومت کو رپورٹ کریں کہ کب تک پیداواری عمل شروع ہو جائے گا۔ پورا ایک سال گزر جانے کے بعد سندک پراجیکٹ کی اعلیٰ انتظامیہ کوئٹہ اور دیگر شمالی علاقوں میں ٹھیکیداروں سے حاصل شدہ "کمیشن" سے چھٹیاں مناتی رہی۔ جب حکومت کی طرف سے سختی کے ساتھ باز پرس کی گئی تو جواب ملا کہ ڈرائیور، کلرک، اکاؤنٹنٹ اور آڈٹ سٹاف والے منصوبے کے پیچیدہ مسائل کو حل کرنے کے لیے موقع پر موجود ہیں۔

مارچ ۹۵ء میں وفاقی حکومت نے دوبارہ وضاحت طلب کی کہ منصوبے کا جنرل مینجر کوئٹہ میں بیٹھا کیا کر رہا ہے جب کہ اس کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ دیگر اعلیٰ سٹاف کو لے کر موقع پر جائے اور صورت حال کا جائزہ لے کر حکومت کو مطلع کرے۔ حکومت کے اس فیصلے کو سی این ای سی نے بھی سراہا لیکن پراجیکٹ انتظامیہ نے ۱۴ افراد پر مشتمل جونیئر سٹاف اور غیر متعلقہ افراد کو سندک بھیج دیا کہ وہ حالات کا "جائزہ" لیں اور خود لاکھوں روپے کا فنڈ استعمال کر لیا جو حکومت نے جائزہ لینے کے لیے مختص کیا تھا۔ اس دوران حکومت کو جو رپورٹ پیش کی گئی اس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ سندک پراجیکٹ میں استعمال ہونے والی چینی مشینری ناقص ہے اور یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ یہ مشینری چین کے ساتھ پیداواری شراکت کے چار سال بھی پورے کر سکے گی جبکہ معاہدے کے وقت چین کی کمپنی ایم سی سی نے حکومت پاکستان کو تحریری ضمانت دی تھی کہ سندک پراجیکٹ میں نصب کی

جانے والی مشینری لگاتار ۸۰ سال تک کام کرتی رہے گی بصورت دیگر ایم سی سی ذمہ دار ہو گی۔

Marfat.com

قائداعظم یونیورسٹی کی زمین کے گھپلے

قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد کی ۱۲۵ ایکڑ زمین سابق وزیراعظم بے نظیر بھٹو کے حکم پر حکومتی ممبران پارلیمنٹ کو الاٹ کر دی گئی۔ اس زمین کی مارکیٹ قیمت ۶۰ لاکھ روپے سے ایک کروڑ روپے فی کنال تھی۔ جبکہ زمین الاٹ کرانے والے ممبران پارلیمنٹ کو کہا گیا کہ وہ صرف ۳۰ لاکھ روپے میں ایک کنال زمین حاصل کر سکتے ہیں۔ جبکہ یونیورسٹی کے سٹاف کو ایک لاکھ روپے کے عوض ایک کنال اراضی الاٹ کرانے کی اجازت دی گئی۔ دوسری طرف جن لوگوں نے یونیورسٹی زمین پر پلاٹ الاٹ کرائے تھے انہوں نے بلیک مارکیٹ میں ان پلاٹوں کو غیر قانونی طور پر فروخت کر کے ناجائز منافع کما لیا۔

قائد اعظم یونیورسٹی سٹاف ہاؤسنگ سوسائٹی کو ۱۹۸۵ء میں کواپریٹو سوسائٹی ایکٹ ۱۸۶۰ء کے تحت رجسٹرڈ کیا گیا تھا۔ ہاؤسنگ سوسائٹی نے کیپٹل ڈویلپمنٹ اتھارٹی سے درخواست کی کہ وہ سوسائٹی کو اس بات کی اجازت دے کہ سوسائٹی یونیورسٹی کی زمین پر ایک رہائشی سکیم بنا کر رہائشی مقاصد کے لیے الاٹ کی جانے والی زمین اپنے ممبران کو الاٹ کر سکے۔ لیکن یونیورسٹی ہاؤسنگ سوسائٹی کی اس درخواست کو کیپٹل ڈویلپمنٹ اتھارٹی ہر بار مسترد کرتی رہی۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی رہی کہ قائداعظم یونیورسٹی دارالحکومت کی حدود میں ہے لہٰذا یہاں قانونی طور پر رہائشی سکیموں کی اجازت نہیں۔

یونیورسٹی انتظامیہ نے ہمیشہ کہا کہ وہ اپنے فاضل علاقے میں قومی سطح کا کوئی بھی تعلیمی یا تحقیقی ادارہ نہیں بنائے گی۔ اس کے بعد جب یونیورسٹی انتظامیہ اس بات پر راضی ہوئی کہ اس زمین کو استعمال میں لایا جائے تو اس کے ساتھ ہی انتظامیہ نے یہ کوششیں شروع کر دیں کہ اس الاٹ شدہ زمین کو رہائشی استعمال میں لایا جائے۔ ۱۹۹۵ء کے شروع میں یونیورسٹی ہاؤسنگ سوسائٹی نے کیپٹل ڈویلپمنٹ اتھارٹی کو یہ تجویز دی کہ اس کے ممبران

Marfat.com

کو ۲۵۰ پلاٹ الاٹ کیے جائیں اور ان کا سائز مختلف ہو۔ سی۔ ڈی۔ اے نے اس درخواست کو بھی ماننے سے انکار کر دیا کیونکہ قانون میں ایسی کوئی شرط نہیں تھی کہ یہ پلاٹ کسی خاص سوسائٹی کو الاٹ کر دیے جائیں۔

پھر اچانک ۱۸ جون ۱۹۹۵ء کو اس فیصلے کی نفی کی گئی اور قائد اعظم یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے اعلان کر دیا کہ کیپٹل ڈویلپمنٹ اتھارٹی کو اس سکیم پر کوئی اعتراض نہیں اور اس جگہ پر ہاؤسنگ سوسائٹی بنانے کے لیے حکومت سے اجازت حاصل کر لی گئی۔ ۲۲ جون ۱۹۹۵ء کو وزیراعظم کی طرف سے اجازت نامہ حاصل کیا گیا اور اس مقصد کے لیے ۱۴۰۰ ایکڑ کا رقبہ مخصوص کر دیا گیا اور فوری طور پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ اس میں سے ۱۲۰ ایکڑ زمین کی فوری الاٹ منٹ کر دی جائے گی جبکہ باقی ماندہ زمین اضافی گھروں کی ضرورت کے تحت چھوڑ دی جائے گی۔

اس مبینہ الاٹ منٹ کے خلاف قائداعظم یونیورسٹی کے دو اساتذہ اور مقامی صحافیوں اور غیر سرکاری تنظیموں کے افراد نے ایک مہم شروع کی، لیکن یونیورسٹی حکام کی طرف سے اس پر کوئی کاروائی نہ کی گئی کیونکہ مبینہ طور پر یہ حکام خود بھی اس منصوبے میں شریک تھے جبکہ اسلام آباد میں موجودہ بعض سیاست دانوں اور اراکین اسمبلی نے بھی اس منصوبہ کی مخالفت کی کیونکہ با اثر حکومتی اراکین اسمبلی نے انتہائی سستے داموں زمین حاصل کر کے اسے کروڑوں روپے میں فروخت کرنا شروع کر دیا تھا۔

غیر قانونی طور پر شروع کی گئی اس ہاؤسنگ سکیم پر جب بیرونی تنقید کا دباؤ بڑھا تو یونیورسٹی شاف ممبران نے الائی سیاستدانوں سے مل کر عجیب و غریب اعتراضات تیار کر لیے۔ ان اعتراضات میں ایک یہ بھی شامل تھا کہ قائداعظم یونیورسٹی ایک مکمل طور پر خود مختار ادارہ ہے اور باہر سے آنے والے اس کے معاملات میں رخنہ اندازی نہیں کر سکتے۔ ہاؤسنگ سوسائٹی کے لیے منظور کی گئی زمین ایک طے شدہ معاملہ ہے جس کو دوبارہ نہیں چھیڑا جا سکتا جبکہ اس اسکیم کو برابری کے تحت سپورٹ کیا جانا چاہیے کیونکہ یہ سوسائٹی نچلے درجے کے شاف اور غریب پروفیسروں کو تحفظ دے رہی ہے اور تنقید کرنے والے ان غریب عوام کا بالکل نہیں سوچ رہے جو اس سکیم سے فائدہ حاصل کرنے والوں میں شامل ہیں۔

جبکہ اس اسکیم میں پلاٹ حاصل کرنے کے خواہش مند ارکان اسمبلی ہزار مربع گز اور بارہ سو مربع گز کے پلاٹ حاصل نہیں کرنا چاہتے بلکہ ان کی خواہش پر انہیں پندرہ سو

Marfat.com

مربع گز کے پلاٹس الاٹ کیے گئے اور جب اس "سیاسی الاٹ منٹ" کے بعد ۱۲۵ ایکڑ پر مشتمل اراضی کم پڑ گئی تو یہ بھی درخواست دی کہ باقی ماندہ ۳۰۰ ایکڑ اراضی جو کہ پہلے ہی رہائشی علاقوں کے لیے مخصوص ہے اسے بھی قائداعظم یونیورسٹی سے لے کر اراکین اسمبلی کو الاٹ کر دیا جائے۔

۱۷ جون ۱۹۹۶ء کو وفاقی کابینہ نے فیصلہ کیا کہ یونیورسٹی شاف کو اسلام آباد میں کہیں اور جگہ دے دی جائے گی جب کہ دوسری سکیم کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ نہ کیا گیا اور اس کو مبینہ طور پر اراکین اسمبلی کے لیے روک دیا۔ کابینہ کے فیصلہ کے ساتھ ہی یونیورسٹی کے کرتا دھرتا افراد نے فیصلہ کیا کہ وہ ہاؤسنگ سکیم کے پروگرام پر عمل شروع کر دیں۔ انہوں نے الاٹ شدہ پلاٹوں پر تعمیرات کا سلسلہ شروع کرا دیا اور کچھ پلاٹ فروخت کر کے رقوم حاصل کرنا شروع کر دیں۔

کیپٹل ڈویلپمنٹ اتھارٹی نے فیصلہ کیا کہ گرین ایریا کو سیکٹر ایف ۱۰ میں اور ۸ ن کو پلاٹوں میں بدل دیا جائے جن میں سے ہر پلاٹ کا رقبہ پندرہ سو مربع گز اور یہ پلاٹ اراکین کو ۱۰ لاکھ روپے فی پلاٹ کے حساب سے فروخت کیے جائیں جبکہ مذکورہ بالا پلاٹوں کی فی کس قیمت مارکیٹ میں ایک کروڑ روپے تک تھی۔

اس بات پر کسی کو اعتراض نہیں کہ ہاؤسنگ کالونیاں بنائی جائیں اور ان کو اراکین اسمبلی، یونیورسٹی، تاجروں یا بیورو کریٹس یا عام کارکنوں کے لیے مختص کیا جائے۔ زمین کی فروخت کے سلسلہ میں بھی کوئی اعتراض نہیں اور نہ ہی اس امر پر اعتراض ہے کہ یہ زمین ان لوگوں کو کیوں دی گئی۔ جب کہ اعتراض اس بات پر ہے کہ یونیورسٹی کی ملکیتی زمین پر جو رہائشی سوسائٹیاں بنائی جا رہی ہیں ان کی گنجائش قانون میں کہیں نہیں ہے اور دونوں کالونیاں اوپر بیان کیے گئے معیار پر پوری نہیں اترتیں۔ پاکستان میں عوامی املاک پر قبضہ کی ایک بڑی پرانی تاریخ ہے اور یہ دونوں مذکورہ بالا سکیمیں اقربا پروری، کرپشن اور کالے دھندے کو ظاہر کرتی ہیں۔ یہی زمین جس کی الاٹ منٹ کا معاملہ مسلسل کئی برسوں سے کیپٹل ڈویلپمنٹ اتھارٹی کے انکار کے باعث التوا میں تھا اسے اچانک منظور کر لیا گیا بلکہ اس کے لیے وزیراعظم کی منظوری بھی حاصل کر لی گئی جس یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اندرون خانہ کوئی کھیل کھیلا گیا اور "مک مکا" ہوا ۔ اس بات کا بھی قوی امکان ہے کہ کیپٹل ڈویلپمنٹ اتھارٹی کے اعلیٰ افسران کو بھاری رشوت دی گئی۔ اس کے علاوہ اراکین اسمبلی کو کی گئی غیر قانونی الاٹ منٹ بھی بھاری بدعنوانیوں کا اشارہ دیتی ہے۔ ان اراکین

Marfat.com

اسمبلی نے ان پلاٹوں سے ۸۰ فیصد سے زیادہ کمایا اور پلاٹ حاصل کرتے ہی انہیں بیچ دیا۔

حالانکہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ اس زمین کو پبلک پراپرٹی سے تبدیل کر کے پرائیویٹ پراپرٹی کا درجہ دے دیا جاتا تاکہ اس کا فائدہ محض چند افراد کو نہ ہوتا کیونکہ اس صورت میں ان طاقتور اور با اثر افراد کی دست برد سے بچا جا سکتا تھا بالکل اسی طرح جیسے گرین ایریا سیکٹر ۸ ایف یا ۸ بی لوگوں کی اپنی املاک ہیں اور ان کو چند با اثر لوگوں کے ذاتی استعمال کے لیے مختص کرنا صریحاً زیادتی تھی۔

یونیورسٹی کی زمین کے بارے میں اگر دلیل یہ ہے کہ یہ زمین یونیورسٹی کے ملازمین کو اس لیے دے دی جائے کہ وہ غریب ہیں اور قیمت ادا نہیں کر سکتے' قطعاً صحیح نہیں ہے۔ اگر اس اصول کی پیروی کی جائے تو پھر وزیراعظم سیکرٹریٹ کی زمین سیکرٹریٹ کے کلرکوں اور چپڑاسیوں کو دے دی جائے اور باغ جناح لاہور اور قومی لائبریریوں کو ان کے ملازمین میں بانٹ دیا جائے۔ سب سے اہم بات ایک با اثر گروپ کو فائدہ پہنچانا ہے اور چند با اثر اور طاقتور سیاستدانوں کو موقع فراہم کرنا ہے کہ وہ کروڑوں روپیہ کما سکیں۔ مارکیٹ سے کم قیمت پر زمین یا کوئی بھی پبلک املاک کسی کو دے دینا کرپشن اور اقربا پروری کی کھلم کھلا مثال ہے۔

Marfat.com

چوہدری ظہور الٰہی خاندان اور پی پی ایل کی کرپشن

پریس ٹرسٹ جو روز اول سے تمام حکومتوں کے لیے مسلسل درد سر بنتا چلا آ رہا تھا اور جسے اقتدار کا کھیل کھیلنے والی ہر جماعت نے ہمیشہ سے سیاسی اشو بنا کر استعمال کیا اور اسے ختم کرنے کی دھمکیاں دے کر اس کی انتظامیہ کی صلاحیت و کارکردگی کو اس بے دردی سے تہ و بالا کیا کہ اس کے زیر انتظام چلنے والے پاکستان ٹائمز اور امروز و مشرق جیسے موقر روزنامے اپنی مسلم صحافتی اقدار سے محروم ہو کر عرف عام میں "چیتھڑوں" کے زمرے میں شمار ہونے لگ گئے۔

چوہدریوں کی مالی توسیع پسندی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب بھی پریس ٹرسٹ کو ختم کر کے اس کے زیر انتظام صحافتی اداروں کو آزاد کرنے کا معاملہ اٹھتا چوہدری فیملی کے موجودہ سربراہ چوہدری شجاعت حسین پروگریسو پیپرز لمیٹڈ اور روزنامہ مشرق پر اپنے حق ملکیت کا دعویٰ لے کر اخباروں میں شور مچانا شروع کر دیتے۔ چوہدری شجاعت حسین کا یہ دعویٰ بنیادی طور پر اس حوالے سے بنتا کہ ۶۳-۱۹۶۲ء کے دوران تقریباً ڈیڑھ سال تک پی پی ایل ان کے والد مرحوم چوہدری ظہور الٰہی کے پاس رہا۔

صحافت کے پیشے سے وابستہ ہر فرد اس حقیقت سے باخبر ہے کہ پی پی ایل کے حقیقی مالک افتخار الدین مرحوم تھے۔ جنہوں نے پاکستان ٹائمز اور امروز وغیرہ کے اجرا کو عظیم مشن سمجھتے ہوئے دن رات کی محنت سے انہیں پروان چڑھایا۔ پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کے قیام اور فروغ کی خاطر انہوں نے اپنی جائیداد کا وافر حصہ بیچ کر لگا دیا اور جب اس کے ثمرات سے فیض یاب ہونے کا وقت آیا تو اکتوبر ۱۹۵۸ء میں جنرل محمد ایوب خاں کا مارشل لاء میاں افتخار الدین مرحوم کی محنت اور قربانی کے ماحاصل پر بجلی بن کر گرا اور مارشل لاء کے حکم کے تحت پروگریسو پیپرز لمیٹڈ میاں افتخار الدین مرحوم سے چھین کر حکومت کی تحویل

میں لے لیا گیا۔ ظاہر ہے مارشل لاء کے جبر اور زور کا اندھیرا پھیلانے کے عمل میں عوام الناس کو شعور و ادراک کی روشنی مہیا کرنے والا کوئی بھی ماخذ گوارا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جبکہ میاں افتخارالدین مرحوم نے سرزمین پاکستان پر "پاکستان ٹائمز" اور "امروز" وغیرہ کی شکل میں شعور کی بیداری کا جو کام شروع کیا تھا اس کے مثبت نتائج آنا شروع ہو گئے تھے۔ پی پی ایل کے حوالے سے چوہدری شجاعت حسین کے دیکھنے کی یہ چیز تھی کہ ان کے والد گرامی نے میاں افتخارالدین مرحوم کا گلا کاٹنے کے لیے جنرل ایوب خاں کے ہاتھ میں خنجر بننا قبول کر لیا تھا۔

پروگریسو لمیٹڈ کو حکومت کی تحویل میں لینے کے بعد عارضی مدت کے لیے یہاں ایڈمنسٹریٹر مقرر کیا گیا۔ حکومت کی براہ راست تحویل میں رکھ کر جنرل ایوب خاں اپنے منفی مقاصد کو لوگوں کے سامنے ننگا نہیں کرنا چاہتے تھے اس لیے انہوں نے اس ادارے کو کسی ایسے شخص کی نام نہاد ملکیت میں دینے کا فیصلہ کیا جو صحافت کے مفہوم اور اس کے اغراض و مقاصد کو جاننے کی بجائے اپنے مالی مفادات کے فروغ کے تقاضوں کو سمجھتا ہو۔ اس کے لیے سب سے پہلے قرعہ فال داؤد گروپ آف انڈسٹریز کے احمد داؤد کے نام پڑا۔ پی پی ایل کے ۱۶ لاکھ روپے کے اکثریتی حصص جو میاں افتخارالدین کے ضبط شدہ حصص تھے خود ہی ان کی مالیت ۳۳ لاکھ روپے طے کر کے احمد داؤد کو فروخت کر دیے گئے۔ دوسرے لفظوں میں احمد داؤد کو یہ حصص خریدنے کے لیے مجبور کیا گیا۔ موصوف کی اس شرط پر کہ اگر انہیں یہ سودا راس نہ آیا تو ان سے مذکورہ حصص واپس لے لیے جائیں گے۔ ایک ماہ بھی نہ گزرا تھا کہ احمد داؤد صاحب صحافت کے کاروبار سے عدم واقفیت کی بنا پر یہ بھاری پتھر چوم کر الگ ہو گئے۔ اس کے بعد جنرل محمد ایوب خاں نے پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کا کوئی مستقل بندوبست ہونے تک اسے لاہور کے اس وقت کے کارپوریشن کے میئر چوہدری محمد حسین مرحوم، حاجی اسحاق، حنیف مرحوم اور سردار احمد علی مرحوم کی مشترکہ تحویل میں دے دیا۔ تین ناموں پر پی پی ایل کے حصص رکھنے کا مقصد یہ تھا کہ کسی ایک نام کی تحویل میں دے کر اس ادارے کو واپس لینے کے ضمن میں مسائل کے پیدا ہونے کا خدشہ تھا، جبکہ یہ سارا بندوبست عارضی نوعیت کا تھا۔ ظاہر ہے جنرل ایوب خان کو پی پی ایل کی مستقل ذمہ داری سنبھالنے کی خاطر کسی ایسے شخص کی تلاش تھی جو حکومت کے سیاسی عزائم کو اپنے ذاتی مفادات کے تحفظ کا وسیلہ سمجھ کر انہیں پورا کرنے کے لیے جائز و ناجائز میں تمیز روا نہ رکھے۔ جنرل صاحب نے سمجھا کہ ان کے معیار پر چوہدری ظہور الٰہی مرحوم پورا اتریں گے

Marfat.com

جس کی ضمانت گورنر مغربی پاکستان امیر محمد خان نواب آف کالا باغ نے بھی دے دی۔
چوہدری ظہور الٰہی پی پی ایل کے حکومتی تحویل میں آنے کے بعد حالات کا جائزہ لے کر اس ضمن میں ایوب خاں کی کمزوری کا اندازہ کر چکے تھے۔ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ جنرل ایوب خاں فوری طور پر پی پی ایل کے مسئلے سے چھٹکارہ چاہتے ہیں اور اس کے لیے ان سے ہر قسم کی مراعات کا حصول مشکل نہیں۔ جنرل ایوب خاں نے جب پی پی ایل کو چوہدری ظہور الٰہی کی تحویل میں دینے کا فیصلہ امیر محمد خان کو سنایا تو انہوں نے توقع سے بڑھ کر ان کے مقاصد کی تکمیل کی انہیں یقین دہانی کرائی۔ چوہدری ظہور الٰہی نے اچانک اپنی حکمت عملی پر عمل شروع کرتے ہوئے جنرل ایوب خاں سے کہا کہ وہ اپنے چلتے ہوئے کاروبار سے فوری طور پر ایک پیسہ بھی نکالنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں جبکہ پی پی ایل کے حصص خریدنے کے لیے انہیں ۳۳ لاکھ روپے درکار ہیں۔ یاد رہے کہ چوہدری ظہور الٰہی کسی صورت میں بھی اپنے بارے میں اس تاثر کو ختم نہیں کرتے تھے کہ وہ بہت زیادہ دولت مند ہیں کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ دولتمند ہونے کے سوا ان کے پاس اپنی شخصیت کے اظہار کا کوئی دوسرا وسیلہ نہیں ہے۔ چوہدری صاحب چاہتے تھے کہ جنرل ایوب ان حصص کی خریداری کے لیے نیشنل بنک کو انہیں مطلوبہ رقم کے برابر قرض دینے کی ہدایت جاری کر دیں۔ جنرل ایوب خاں نے معمول کے مطابق نیشنل بنک کو قرضہ دینے کی ہدایت کر دی اور چودھری ظہور الٰہی نے بنک کے تمام قوانین و ضوابط کو روند کر چوبیس گھنٹوں میں ۳۳ لاکھ روپے وصول کر لیے۔ یہ قرضہ چوہدری ظہور الٰہی نے اپنی سی بی انڈسٹریز لمیٹڈ کے نام پر لیا جو پہلے ہی نیشنل بنک کے کھاتوں میں ۲۲ لاکھ کی مقروض تھی جبکہ اس کے اثاثے ۱۰ لاکھ سے زیادہ نہیں تھے۔ ۳۳ لاکھ روپے کا مطلوبہ قرض حاصل کرنے کی خاطر جو لاقانونیت اور بے ضابطگی روا رکھی گئی اس کی کچھ مثالیں درج ذیل ہیں۔

۱۔ بنک کو سی بی انڈسٹریز کی جعلی آڈٹ شدہ بیلنس شیٹس مہیا کی گئیں تھیں جس آڈٹنگ کمپنی (ایس ایم اشرف اینڈ کمپنی) کی طرف سے یہ دستاویزات جاری کی گئیں اس کا کوئی وجود تک نہ تھا۔

۲۔ سی بی انڈسٹریز لمیٹڈ کے اثاثوں کی کوئی چھان بین نہ کی گئی۔

۳۔ نیشنل بنک آف پاکستان سے بذریعہ جعلی دستاویزات یہ بات پوشیدہ رکھی گئی کہ سی بی انڈسٹریز لمیٹڈ آئی ڈی بی پی کے پاس پہلے سے لاکھوں روپے کے قرضے کے عوض رہن ہے۔

Marfat.com

۴ - ۳۳ لاکھ روپے کے قرض کی ادائیگی پہلے کی گئی جبکہ اس قرضے کو "محفوظ" کرنے کی غرض سے غلط ملط دستاویزات بعد میں تیار کی گئیں۔

۵ - سی بی انڈسٹریز لمیٹڈ کے میمورنڈم میں یہ کلاز درج نہیں تھی کہ یہ کمپنی اخباری ادارہ چلا سکتی ہے۔ جبکہ پی پی ایل کے حصص کے لیے قرضہ دیتے وقت اس بات کا دھیان رکھنا قانونی طور پر بنک کے لیے لازمی تھا۔

۶ - نیشنل بنک نے ۳۳ لاکھ روپے کا نیا قرضہ منظور کرتے وقت اس قانونی ضابطے کو یکسر نظر انداز کر دیا کہ سی بی انڈسٹریز لمیٹڈ نے پہلے سے لیے گئے قرضے کے واجبات میں سے ایک پیسہ بھی کبھی ادا نہیں کیا تھا یعنی یہ کمپنی نادہندہ چلی آ رہی تھی۔

البتہ ۳۳ لاکھ روپے کے قرض کے عوض نیشنل بنک نے پی پی ایل کے مذکورہ حصص بطور رہن اپنے قبضہ میں رکھ لیے۔ مطلب یہ کہ واجبات کی دائیگی میں نادہندہ ہونے کی صورت میں بنک مذکورہ حصص اپنے نام منتقل کرا لے گا۔ یاد رہے کہ پی پی ایل کے حصص سی بی انڈسٹریز لمیٹڈ کے نام منتقل کیے گئے تھے اس لیے کہ بنک نے قرضہ اسی کمپنی کے نام منظور کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ جب تک پی پی ایل کے مذکورہ حصص نیشنل بنک کے پاس سی بی انڈسٹریز لمیٹڈ کے مجموعی ۵۵ لاکھ روپے کے قرضے کے عوض رہن تھے۔ چوہدری ظہور الٰہی اپنی کمپنی کے حوالے سے قانونی طور پر ان حصص کی پوری ملکیت کے دعویدار نہیں ہو سکتے تھے۔ بہرکیف چوہدری ظہور الٰہی کو پی پی ایل کا ادارہ حبیب سے ایک پیسہ خرچ کیے بغیر حاصل ہوگیا اس وقت اپنی نوعیت کا ملک بھر میں سب سے بڑا ادارہ اگر کسی شخص کو راہ چلتے مفت میں حاصل ہو جائے تو حصول زر کی غرض سے قانون و اخلاق کے بجائے غلط اور ناجائز ہتھکنڈوں پر اس کا ایمان کیوں پختہ نہ ہوگا۔ چوہدری ظہور الٰہی سی بی انڈسٹریز کے نمائندے کی حیثیت سے پی پی ایل کے مینجنگ ڈائریکٹر ضرور بن گئے تاہم وہ یہ بات اچھی طرح سے جانتے تھے کہ ان کی یہ نام نہاد ملکیت ایک طرف جنرل ایوب خاں کی صوابدید کے رحم و کرم پر ہے اور دوسری جانب یہ نیشنل بنک آف پاکستان سے حاصل کردہ ۳۳ لاکھ روپے کے قرضے کی شرائط کے کچے دھاگے کے ساتھ بندھی ہوئی ہے۔ یعنی موصوف کے پاس وقت کم تھا اور پی پی ایل کے وسیع و عریض اثاثوں کو ہڑپ کرنے کے سنہری موقع کے لیے کام بہت زیادہ تھا۔ چنانچہ چوہدری صاحب مرحوم نے پی پی ایل کی ہر چیز پر ہاتھ صاف کرنے کی غرض سے جلد ہی تمام اطراف سے اس پر دھاندلی بدعنوانی اور لاقانونیت کی یلغار کر دی اور پہلے ہی روز تقریباً پندرہ تجربہ کار صحافیوں کو بیک جنبش قلم

Marfat.com

ملازمت سے الگ کر دیا۔ زیڈ اے سلہری کی ملازمت پر پروبیشن کے تین ماہ کی قدغن لگا کر انہیں مجبور کیا کہ وہ خود ہی اپنی ملازمت سے مستعفی ہو جائیں۔ یاد رہے کہ ان دنوں نجی اداروں کے ملازمین کی ملازمت کو کسی قسم کا کوئی قانونی تحفظ میسر نہیں تھا۔ چند ہفتوں بعد پی پی ایل کے معروف ہفت روزہ لیل و نہار کو بند کر کے بیسیوں کارکن ملازمت سے محروم کر دیے گئے۔ پی پی ایل کے ملازموں اور کارکنوں کو بے دریغ بے روزگاری کی موت مارنے کا ہاتھ چوہدری ظہور الٰہی نے اس مقصد کے لیے دکھایا تھا تاکہ باقی ماندہ کارکن صحافیوں اور ملازمین پر ملازمت سے برطرفی کا مستقل خوف طاری کیا جائے تاکہ ادارے کے اثاثوں کو لوٹنے کے پروگرام پر کوئی آواز نہ اٹھا سکے۔ جب کہ ان دنوں کوئی بھی چوہدری صاحب کے ان اقدامات کے خلاف قانونی تحفظ حاصل نہ ہونے کے سبب عدالتی چارہ جوئی نہیں کر سکتا تھا۔

تمام صحافی کارکنوں اور ملازمین کی طرف سے بے فکر ہونے کے بعد چوہدری ظہور الٰہی مرحوم نے پی پی ایل کے اثاثوں پر ہاتھ صاف کرنے کے لیے لمبے چوڑے پروگرام پر عمل درآمد شروع کر دیا۔ پی پی ایل کا ادارہ حاصل کرنے سے چند ماہ قبل چوہدری صاحب نے دیوالیہ قرار دی گئی کمالیہ ٹیکسٹائل ملز فیصل آباد کی ملکیتی زمین، سکریپ مشینری اور اجازت نامہ ۱۱ لاکھ پچھتر ہزار روپے میں خریدا تھا۔ اس کے ساتھ ملحق متروکہ ۴۵۰ کنال سرکاری اراضی بھی تھی جو دیوالیہ قرار دی گئی کمالیہ ٹیکسٹائل ملز کے ان اثاثہ جات کا حصہ نہیں تھی جو چوہدری صاحب نے خریدے تھے۔ اس زمین کے حصول کے لیے موصوف نے الگ چارہ جوئی شروع کی اور انڈسٹریل انڈر ٹیکنگ کے تحت اس معاہدے کے تحت کہ اس پر صرف صنعت نصب کی جائے گی اور کسی طرح سے بھی اسے کمرشلائز نہیں کیا جائے گا، یہ اراضی صرف دو لاکھ روپے میں حاصل کر لی گئی اور یہ رقم بھی غیر قانونی طور پر لیکویڈیٹر سے مل کر مذکورہ بالا گیارہ لاکھ پچھتر ہزار روپے میں سے ادا کروائی۔ ابھی ان تمام اثاثوں کا حسب معاہدہ چوہدری صاحب کی سی بی انڈسٹریز لمیٹڈ کے نام باقاعدہ انتقال بھی نہیں ہوا تھا کہ چوہدری صاحب نے یہ اثاثے سی بی انڈسٹریز کی طرف سے پی پی ایل کے نام ۶۷ لاکھ روپے میں منتقل کر دیے۔ پھر پی پی ایل کے نام پر نیشنل بنک سے ۶۷ لاکھ روپے کا قرضہ لے کر اس میں سے سی بی انڈسٹریز لمیٹڈ کے نام نیشنل بنک آف پاکستان کے واجب الادا "۵۵" لاکھ روپے کے واجبات ایڈجسٹ کروانے کے بعد ۱۲ لاکھ روپیہ نقد جیب میں ڈال لیا۔ یعنی جرم کی حکمت سے اور اپنی آگاہی کی جادوگری سے چوہدری صاحب

Marfat.com

نے قانون و ضابطے کی نرمی کا فائدہ اٹھا کر ایک ہی ہاتھ میں سی بی انڈسٹریز لمیٹڈ کے گزشتہ تمام ۲۲ لاکھ روپے کے واجبات سمیت پی پی ایل کے حصص کے لیے بطور قرض حاصل کیے گئے ۳۳ لاکھ روپے واپس ادا کرنے کے بعد ۱۲ لاکھ روپے نقد ہتھیا لیے اور بدستور پی پی ایل کی ملکیت کی کرسی پر براجمان ہونے کے علاوہ کمالیہ ٹیکسٹائل ملز کے مذکورہ بالا اثاثوں کو بھی پی پی ایل کا مالک ہونے کے سبب ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ اس ساری خوردبرد اور ہیرا پھیری کا بوجھ پی پی ایل پر ڈال دیا تاکہ بنک قرضوں کی بھرمار کے نیچے دبے ہوئے اس ادارے پر کوئی کاروباری ہاتھ نہ ڈال سکے حتیٰ کہ خود جنرل ایوب بھی یہ ادارہ ان سے لے کر کسی دوسرے کو دینے کی روایت پر عمل نہ کر سکیں۔

چوہدری ظہور الٰہی نے پھر پی پی ایل کے اثاثوں پر دوسری طرف سے حملہ کر دیا اور عنایت اللہ مرحوم کو کرتا دھرتا بنا کر روزنامہ مشرق کا اجرا کر دیا اس لیے کہ موصوف سمجھتے تھے کہ پی پی ایل یا تو ان کے اپنے ہاتھ سے ختم ہو جائے گا اور یا ان سے واپس لے لیا جائے گا۔ نسبت روڈ پر ایک بوسیدہ عمارت جو انہوں نے ان ہی دنوں ۱۹ ہزار روپے کے کلیم میں یعنی صرف نقد ۸ ہزار روپے میں ایک ضرورت مند ریٹائرڈ میجر سے خریدی تھی۔ اس عمارت کی قیمت ۵۰ ہزار روپے طے کر کے اس رقم سے اپنے عزیزوں کے نام مشرق لمیٹڈ کے حصص حاصل کر لیے اس کے علاوہ چوہدری صاحب نے اپنی گرہ سے ایک پیسہ بھی مشرق کے لیے خرچ نہیں کیا تھا۔ روزنامہ مشرق کے اجرا کے ضمن میں ہر قسم کے اخراجات کے لیے فنڈز کے حصول کا ا پ پی پی ایل کے وسائل پر لگا دیا گیا۔ روزنامہ مشرق کی پرنٹنگ پی پی ایل کے پریس سے ہونے لگی۔ اس کے ملازمین کی تنخواہوں سمیت تمام تر جمع اخراجات کی ادائیگی پی پی ایل سے ہوتی تھی۔ چند ہی ماہ میں روزنامہ مشرق کے نام پی پی ایل کے واجبات ۱۸ لاکھ روپے سے تجاوز کر گئے جو بالاخر پریس ٹرسٹ کو قبول کرنا پڑے۔ اس وقت مذکورہ بالا ۸ ہزار روپے میں خریدی گئی بوسیدہ عمارت کی ۵۰ ہزار روپے قیمت لگا کر اس رقم کے جو حصص جاری کیے گئے وہ بھی چوہدری صاحب نے پریس ٹرسٹ سے وصول کر لی تھی۔ اسی پر اکتفا نہیں بلکہ چوہدری ظہور الٰہی مرحوم نے پی پی ایل کے فنڈز سے چار لاکھ روپے سے زیادہ کی رقم اپنی ماڈرن فلور اینڈ جنرل ملز کے پلانٹ کی تعمیر میں خرچ کی اور ریکارڈ میں یہ دکھایا گیا کہ مذکورہ فلور مل کے احاطے میں پی پی ایل کے گودام تعمیر کیے گئے ہیں جبکہ اس وقت تک وہاں نہ تو کسی گودام کا وجود تھا اور نہ ہی قانونی طور پر اس احاطے میں پی پی ایل کے گودام تعمیر ہو سکتے تھے اس لیے کہ یہ زمین متروکہ

وقف جائیداد بورڈ کی ملکیت تھی جس کے ساتھ معاہدے میں زمین کا اس قسم کا استعمال ممنوع تھا۔ اخبارات کی گزشتہ پندرہ سالوں کی تمام فائلیں ردی میں بیچ دی گئیں۔

پی پی ایل کو لوٹ کھانے کی چوہدری ظہور الٰہی مرحوم کی ہوس کا یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ موصوف نے میاں افتخار الدین کی ایک فرم پاک روز لمیٹڈ کے اثاثوں پر قبضہ کرنے کا بھی منصوبہ بنا لیا تھا میاں صاحب کی باغبانپورہ میں کچھ اراضی اس فرم کے ساتھ وابستہ تھی جس کے حصول کے لیے چوہدری صاحب کی رال ٹپکنا شروع ہو گئی تھی۔ علاوہ ازیں چوہدری ظہور الٰہی مرحوم کا یہ منصوبہ بھی تھا کہ سیاسی دباؤ ڈال کر متروکہ وقف املاک بورڈ سے معاملہ کر کے پی پی ایل کی زمین مع ملبہ پانچ لاکھ روپے میں قیمت لگا کر خرید لی جائے اور پھر اسے اس وقت کے حساب سے بھی کروڑوں میں بیچ کر پی پی ایل کا پریس اور اخبارات کے دفاتر کوٹ لکھپت منتقل کر دیے جائیں۔ یعنی اگر موصوف کو کچھ مزید مہلت ملتی تو وہ باقی ماندہ پورے پی پی ایل کو ایک ہی نوالے میں ہڑپ کر جاتے اور جنرل ایوب خاں سمیت ان کا کوئی کچھ بھی بگاڑ نہ پاتا۔

چوہدری ظہور الٰہی مرحوم نے پی پی ایل کے ساتھ وابستہ بڑے سے بڑے صحافی اور پرانے کارکنوں کو کھڑے کھڑے ملازمت سے باہر نکالنے کی روایت ڈال کر خوف و ہراس کی جو فضا قائم کر دی تھی اس میں شائد ہی کس کا منہ لوٹ مار کی اس بھرمار کے خلاف کھلتا تھا۔ تاہم پی پی ایل کے ساتھ کچھ افراد کی پرانی وابستگی نے اس ادارے کے ساتھ ان کی خیر خواہی کا پختہ رشتہ قائم کر دیا تھا کچھ صحافی جن کو اپنی پیشہ وارانہ ذمہ داریوں کے سلسلے میں اکثر و بیشتر حکمرانوں کی محفلوں میں جانے کا موقع ملتا وہ چوہدری صاحب کے ہاتھوں پی پی ایل کے لٹنے پر مبنی **واقعات** کو خاص طور پر نواب آف کالا باغ سے مخفی نہ رکھ سکے۔ نواب صاحب کو جب ان واقعات کا علم ہوا تو ان کا آگ بگولا ہونا قدرتی تھا۔ دراصل یہی وجہ تھی جو نواب کالا باغ کے چوہدری ظہور الٰہی کے درپے ہونے کا باعث بنی' نواب صاحب نے جنرل ایوب خاں کو چوہدری ظہور الٰہی کے ہاتھوں پی پی ایل کا ستیاناس ہونے کے احوال سے آگاہ کیا۔ جنرل ایوب خاں نے صورت حال کی نزاکت کا اندازہ لگانے کے بعد پی پی ایل کو چوہدری ظہور الٰہی سے فوری طور پر واپس لینے کا فیصلہ کیا۔ ظاہر ہے پی پی ایل کو جس طرح سے چوہدری صاحب نے قرضوں کی بھرمار سے دیوالیہ پن کے کنارے لا کر کھڑا کر دیا تھا اس کے پیش نظر کوئی کاروباری شخص اسے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا تھا۔ ان حالات میں پریس ٹرسٹ بنانے کے سوائے جنرل ایوب خاں کے پاس کوئی چارہ

Marfat.com

نہیں تھا۔ چوہدری ظہور الٰہی کو اس بات پر آمادہ کرنے کے لیے کہ وہ پی پی ایل کے حصص پریس ٹرسٹ کو واپس کر دیں حکومت کو موصوف کی دو شرائط ماننا پڑیں ایک یہ کہ چوہدری صاحب نے پی پی ایل کے اثاثوں کو ہڑپ کرنے کے لیے جن جرائم کا ارتکاب کیا تھا ان کے خلاف کوئی قانون چارہ جوئی نہیں کی جائے گی اور دوسرے پی پی ایل کے حصص کی پریس ٹرسٹ کو منتقلی کے لیے چوہدری صاحب کے تیار کردہ تخمینے کی رقم بغیر چھان بین کے قبول کر لی جائے گی۔ چوہدری صاحب نے ۳۳ لاکھ روپے کی رقم کے ساتھ ۱۱ لاکھ روپیہ اضافی لگا کر پریس ٹرسٹ سے ۴۴ لاکھ روپے کی رقم وصول کی۔ ۴۴ لاکھ روپے کی اس رقم کی وصولی چوہدری شجاعت حسین کسی صورت کسی پر بھی ظاہر نہیں کر سکتے اس لیے کہ ایسا کرنے سے پی پی ایل اور مشرق وغیرہ پر ان کے دعووں کا جواز ختم ہو کر رہ جاتا۔ چوہدری صاحب نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اسی سلسلے میں یحییٰ خاں کے دور میں مشہور زمانہ جنرل رانی کو وسیلہ بنا کر موصوف سے اپنے نام نیشنل بنک کے واجبات میں سے ۳۷ لاکھ روپیہ بھی معاف کروا لیا۔ یاد رہے کہ پی پی ایل کی واپسی کے وقت چوہدری صاحب نے کمالیہ ٹیکسٹائل ملز کے ساتھ ملحق ۴۵۰ کنال زمین بھی واپس اپنے نام کروا لی جو بعد میں ان لوگوں نے پلاٹ بنا کر فروخت کی۔

چوہدری برادران کا ایک اور کارنامہ

نیو گارڈن ٹاؤن لاہور کے رہائشی معروف زمیندار چوہدری محمد اسلم چیمہ نے مورخہ ۲۶ جون ۹۳ء کو سول جج لاہور مسٹر عابد حسین کی عدالت میں مقدمہ درج کرایا کہ گجرات کی معروف سیاسی شخصیت چوہدری ظہور الٰہی (مرحوم) کے بھائی چوہدری منظور الٰہی' جو پنجاب اسمبلی کے سابقہ اپوزیشن لیڈر چوہدری پرویز الٰہی کے والد اور سابق وزیر داخلہ سینٹر چوہدری شجاعت حسین کے چچا اور سسر ہیں' نے ان سے ایک سال کے لیے ادھار لی ہوئی رقم مبلغ ۴۶ لاکھ روپیہ بمعہ ۱۵ فیصد سالانہ مارک اپ کے' واپس کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ عدالت سے استدعا ہے کہ وہ اس کی ادا کردہ رقم بمعہ مارک اپ واپس دلائے۔

مذکورہ بالا مقدمہ نمبری ۲۵۲/۱- ۹۳ء کے مدعی چوہدری محمد اسلم چیمہ کے مطابق وہ ایک زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتا ہے جبکہ مدعا علیہ چوہدری منظور الٰہی ایک معروف کاروباری خاندان کا فرد ہے اور سیاسی حیثیت کا حامل ہے۔ چوہدری منظور الٰہی نے نیشنل انڈسٹریل کوآپریٹو فنانس کارپوریشن سے اپنے کاروبار کے لیے قرض حاصل کیا اور اس قرض کی ضمانت کے طور پر اپنی ذاتی جائیداد مذکورہ فنانس کارپوریشن کے پاس بطور رہن رکھی۔

۱۹۹۱ء میں ملک کی تمام کوآپریٹو فنانس کارپوریشنیں سیاست دانوں سمیت دیگر کاروباری اداروں اور افراد کے ہاتھوں دیوالیہ ہوگئیں تو چوہدری منظور الٰہی نے اپنی سیاسی و کاروباری حیثیت کے تحفظ کو پیش نظر رکھتے ہوئے نیشنل کوآپریٹو فنانس کارپوریشن سے حاصل کردہ قرض جلد از جلد واپس کرنے کا فیصلہ کیا' جس کے لیے انہیں بھاری رقم کی ضرورت تھی۔ چوہدری برادران نے این آئی سی ایف سی سے تیس کروڑ روپے قرض حاصل کیا تھا۔ لہٰذا اس قرض کو واپس کرنے کے لیے چوہدری منظور الٰہی کو بھاری رقم درکار تھی۔ چوہدری منظور الٰہی نے اسلم چیمہ کے بقول کچھ مشترکہ دوستوں کی معرفت ان سے

رابطہ کیا اور ۴۶ لاکھ روپیہ ادھار مانگا اور اس رقم پر ۱۵ فیصد سالانہ کے حساب سے مارک اپ کی ادائیگی کی پیش کش کی۔ جبکہ چوہدری منظور الٰہی کو نیشنل انڈسٹریل فنانس کارپوریشن سے لیے ہوئے قرض کی ادائیگی کرنا تھی' اس لیے انہوں نے قرض حاصل کرنے کے لیے اور حکومت کے نامزد کردہ لون کمیشن سے نپٹنے کے لیے' ایسے سرمایہ داروں کو ترجیح دی جن کی رقوم نیشنل انڈسٹریل فنانس کارپوریشن میں جمع تھیں۔ اتفاق سے چوہدری محمد اسلم چیمہ کے بھی مبلغ ۲۳ لاکھ روپے سپیشل انٹرسٹ ریسیٹس کی صورت میں مذکورہ فنانس کارپوریشن میں جمع تھے۔ اسلم چیمہ سے چوہدری منظور الٰہی نے درخواست کی کہ وہ ۲۳ لاکھ روپیہ نقد اور ۲۳ لاکھ روپیہ فنانس کارپوریشن کے سپیشل انٹرسٹ ریسیٹس کی صورت میں انہیں دیں تاکہ وہ لون کمیشن کے سامنے سرخرو ہو سکیں۔ ۴۶ لاکھ روپے کی مذکورہ رقم ۱۵ فیصد مارک اپ پر ایک سال کے لیے ادھار مانگی گئی تھی اور یہ طے ہوا کہ چوہدری منظور الٰہی پوری رقم اکتوبر ۹۲ء تک اسلم چیمہ کو ادا کر دیں گے۔ محمد اسلم نے فوری طور پر ۲۳ لاکھ روپیہ نقد اور باقی ۲۳ لاکھ روپے سپیشل انٹرسٹ ریسیٹس نمبر ۳۹۵۳۰۲' ۳۹۵۳۴۲' ۳۹۵۳۴۰' ۳۹۵۳۴۱ اور ۳۹۵۳۳۹ کی صورت میں چوہدری منظور الٰہی کے نیشنل انڈسٹریل فنانس کارپوریشن میں اکاؤنٹ نمبر ۲۵۷ میں جمع کرا دیے۔ یہ رقم ۸ اکتوبر ۱۹۹۱ء کو ان رسیدوں سے کریڈٹ ایڈوائس کے ذریعے مندرجہ بالا اکاؤنٹ میں جمع کرائی گئی۔ اس طرح چوہدری منظور الٰہی اپنی رہن شدہ جائیداد واگزار کرانے کے قابل ہوئے۔

اکتوبر ۹۱ء میں حسب وعدہ چوہدری محمد اسلم چیمہ نے جب چوہدری منظور الٰہی سے مبلغ ۴۶ لاکھ روپیہ بمعہ ۱۵ فیصد سالانہ مارک اپ (۶ لاکھ ۹۰ ہزار روپے) کا مطالبہ کیا تو انہوں نے اس معاملے کو مختلف حیلے بہانوں سے موخر کرنا شروع کر دیا۔ چوہدری منظور الٰہی نے قرض کی واپسی کی طے شدہ مدت میں دو ماہ کی توسیع کی درخواست کی اور ساتھ یہ وعدہ بھی کیا کہ وہ توسیع کی اس مدت کا بھی مارک اپ رقم کے ساتھ ادا کریں گے جسے چوہدری اسلم چیمہ نے قبول کر لیا' لیکن بالآخر توسیع کی یہ مدت بھی گزر گئی لیکن چوہدری منظور الٰہی نے رقم واپس نہ کی۔ اسلم چیمہ کی طرف سے بعض قریبی رشتہ داروں اور دوستوں کے حوالے سے رقم کی واپسی کے مطالبات چوہدری برادران کو موصول ہوتے رہے اور اسی دوران ایک اور ماہ گزر گیا۔

جنوری ۹۳ء کے آخری ہفتہ میں چوہدری منظور الٰہی نے حبیب بنک لمیٹڈ ٹمبر مارکیٹ لاہور میں اپنے اکاؤنٹ نمبر ۱۹۰۷۷۳ کے تحت تین چیک چوہدری اسلم چیمہ کے

Marfat.com

حوالے کیے۔ ان چیکوں پر آنے والی تاریخوں کا اندراج کیا گیا اور وجہ یہ بیان کی گئی کہ ان درج کردہ تاریخوں سے چند دن پہلے مطلوبہ رقم اس اکاؤنٹ میں جمع ہونے والی ہے جس کے بعد یہ تینوں چیک کیش ہو سکیں گے۔ چوہدری منظور الٰہی کی طرف سے جو چیک اسلم چیمہ کو دیے گئے ان کی تاریخیں اور رقوم درج ذیل ہیں:

۱-	۹۳-۱-۳۰	رقم	۱۳ لاکھ روپے
۲-	۹۳-۲-۱۰	رقم	۲۳ لاکھ روپے
۳-	۹۳-۲-۲۸	رقم	۱۰ لاکھ روپے

مذکورہ بالا چیک دینے کے بعد گویا چوہدری منظور الٰہی نے اس بات کا اعتراف کر لیا تھا وہ چوہدری اسلم چیمہ کے ۴۶ روپیہ کے مقروض ہیں' حالانکہ ان چیکوں کی اصلیت آگے جا کر سامنے آنا تھی۔

حبیب بنک لمیٹڈ نمبر مارکیٹ لاہور کی شاخ سے چوہدری منظور الٰہی کے دستخطوں سے ۴۶ لاکھ روپے کے جو تین چیک اسلم چیمہ کو جاری ہوئے تھے' ان کے ذریعے صرف اصل زر یعنی ۴۶ لاکھ روپے ادا ہونا تھے جبکہ اسلم چیمہ کے بقول چوہدری منظور الٰہی نے وعدہ کیا وہ مذکورہ رقم کا طے شدہ سالانہ مارک اپ ۲۸ فروری ۹۳ء سے پہلے مدعی کو علیحدہ سے ادا کرے گا۔

چوہدری اسلم چیمہ نے مذکورہ چیک الائیڈ بنک آف پاکستان (جہاں اس کا اکاؤنٹ تھا) میں جمع کرا دیے' جہاں سے اس بنک نے مقررہ تاریخوں پر ادائیگی کے لیے چوہدری منظور الٰہی کے بنک کو یہ چیک ارسال کیے۔ چند دن بعد اسلم چیمہ کو اس کے بنک نے اطلاع دی کہ چوہدری منظور الٰہی نے ان چیکوں پر رقم کی ادائیگی روک دی تھی' لہٰذا اسلم چیمہ کے بنک نے انہیں یہ چیک واپس کر دیے۔ اس کے بعد اسلم چیمہ کے بقول انہوں نے دوبارہ چوہدری منظور الٰہی سے رابطہ کیا اور اپنی رقم کا بمعہ طے شدہ مارک اپ کے مطالبہ کیا تو اس بار چوہدری منظور الٰہی نے نہ صرف یہ رقم واپس کرنے سے انکار کر دیا بلکہ اسے اپنی سیاسی حیثیت کے حوالے سے سنگین نتائج کی دھمکیاں دیں۔

چوہدری اسلم چیمہ نے پہلے تو عدالتی مداخلت کے بغیر اپنے دوستوں اور شرکائے کار کی مدد سے اس رقم کی واپسی کے لیے اپنی سی کوششیں کیں لیکن اسے کامیابی نہ ہو سکی۔ جب اسے رقم کی واپسی کی کوئی امید نہ رہی تو اس نے سینئر سول جج مسٹر عابد حسین کی عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا۔ اس موقع پر مدعی اسلم چیمہ نے درخواست کی کہ ۴۶ لاکھ

Marfat.com

روپے کی اصل زر اور اس کے طے شدہ مارک اپ کی یکم اکتوبر ۹۲ء سے ادائیگی کے لیے عدالتی ڈگری جاری کی جائے اور اس کے علاوہ اسے مذکورہ قانونی چارہ جوئی کا خرچہ بھی مدعا علیہ چوہدری منظور الٰہی سے لے کر دیا جائے۔

سینئر سول جج مسٹر عابد حسین کی عدالت نے ۲۷ جون ۹۳ء اور ۲۹ جون ۹۳ء کو عدالتی سمن جاری کر دیے اور اس کیس کی ابتدائی سماعت کی تاریخ ۱۷ جولائی ۹۳ء مقرر کی گئی۔ مدعا علیہ چوہدری منظور الٰہی کا وکیل ۱۷ جولائی ۹۳ء کو عدالت میں حاضر ہوا تو عدالت نے اس کو مدعا الیہ کی طرف سے جواب دعویٰ کرنے کی ہدایت کرتے ہوئے کیس کی سماعت ۲۴ جولائی ۹۳ء تک ملتوی کر دی۔

۲۴ جولائی ۹۳ء کو ضابطہ فوجداری کے قاعدہ نمبر ۳، حکم نمبر ۳۷ اور (Limitation Act) کی دفعہ ۵ کے تحت ایک درخواست عدالت میں دائر کی گئی، کیس کی سماعت جاری رہی اور مدعا علیہ کی طرف سے وقت گزر جانے کے بعد دائر کی جانے والی متعدد درخواستوں کو ۱۶ جون ۹۴ء کو نمٹا دیا گیا۔ مدعا علیہ چوہدری منظور الٰہی کو اس مقدمے کے دفاع کی اجازت نہ دی اور یکطرفہ طور پر شہادت ریکارڈ کر لی گئی۔

مدعی اسلم چیمہ استغاثہ کے گواہ نمبر ایک کی حیثیت سے عدالت میں پیش ہوا اور اس نے استغاثہ کے گواہ نمبر دو حبیب بنک نمبر مارکیٹ لاہور کے منیجر جاوید عباسی پر اپنی جرح مکمل کی۔ مدعی اسلم چیمہ نے بنک کے تینوں چیکوں کے بارے میں مصدقہ دستاویزات عدالت میں پیش کیں اور ساتھ ان چیکوں کی مصدقہ فوٹو کاپیاں بھی پیش کی گئیں۔ ساتھ ہی استغاثہ کے ان دونوں گواہوں کے حلفیہ بیان بھی قلمبند کیے گئے۔ استغاثہ کے دونوں مذکورہ گواہوں پر مدعا علیہ کی جانب سے کوئی جوابی جرح نہ ہوئی، کیونکہ مقدمہ کی کارروائی عدالت کے حکم پر یکطرفہ طور پر چل رہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ مدعا علیہ اپنی صفائی میں کوئی بھی شہادت عدالت میں پیش کرنے سے قاصر رہا، کیونکہ اس کا یہ حق عدالت ختم کر چکی تھی۔ اس موقع پر یکطرفہ کارروائی کے عدالتی حکم کے خلاف مدعا علیہ نے ایک اپیل لاہور ہائی کورٹ میں دائر کر دی جس کو لاہور ہائی کورٹ کے جج مسٹر جسٹس مشتاق احمد خان نے رد کر دیا۔

سینئر سول جج مسٹر عابد حسین نے اپنے فیصلے میں لکھا کہ زبانی اور دستاویزی شہادتوں سے اس دعوے کے مندرجات کی مکمل تصدیق ہوتی ہے جس سے مدعی کے موقف کو مسترد کیے جانے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ لہٰذا عدالت کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ

Marfat.com

وہ مدعی کے موقف کو سچ تسلیم کرے اور اس کے حق میں ۴۶ لاکھ روپے کی ڈگری جاری کرے۔ عدالت نے مزید کہا کہ جہاں تک مارک اپ کی ادائیگی کے معاملہ کا تعلق ہے، فریقین کے درمیان شرح مارک اپ طے ہونے سے متعلق کوئی تحریری ثبوت ریکارڈ پر موجود نہیں، خاص طور پر اس حوالے سے بھی کہ مدعا علیہ نے مدعی کو جو چیک پیش کیے تھے، ان کے ذریعے بھی صرف اصل زر کی ادائیگی کا بندوبست ہونا تھا۔ اس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان چیکوں میں اصل زر کے ساتھ مارک اپ کے اضافہ کا اندراج نہیں۔ جبکہ دوسری طرف جب چوہدری منظور الٰہی معاہدے کے باوجود اسلم چیمہ کو رقم کی ادائیگی سے کتراتا رہا اور آخر جب اس نے دوستوں کے اصرار سے تنگ آکر ایسے چیک دینے کا ارادہ کیا جن کے بارے میں وہ جانتا تھا کہ وہ کبھی کیش نہیں ہو سکیں گے تو کیا اس صورت میں وہ کسی مارک اپ کے معاہدے کو مدنظر رکھ سکتا تھا"۔

تاہم عدالت نے یہ بھی قرار دیا کہ مدعی آخری چیک پر درج شدہ تاریخ یعنی ۲۸ فروری ۹۳ء سے لے کر پوری رقم کی ادائیگی تک کے عرصے کے لیے ملک کے بنکوں میں رائج شرح مارک اپ کے حصول کا بھی مستحق تھا۔ اپنے فیصلہ کے آخر میں عدالت نے لکھا کہ مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں عدالت مدعی کے حق میں ۴۶ لاکھ روپے کی ڈگری یکطرفہ طور پر جاری کرتی ہے اور اس کے ساتھ ۲۸ فروری ۹۳ء سے لے کر ڈگری شدہ رقم کی مکمل ادائیگی تک کے عرصے کے لیے بنک کی شرح کے مطابق مارک اپ کی ادائیگی کا بھی حکم دیتی ہے۔

مذکورہ بالا ڈگری کے اجراء کے بعد مدعی محمد اسلم چیمہ نے اس پر عمل درآمد کروانے کے لیے عدالت سے دوبارہ رجوع کیا تو عدالت نے ۵ جنوری ۹۵ء کو آرڈر نمبر ۲۱ اور قاعدہ نمبر ۳ مجموعہ ضابطہ فوجداری کے تحت چوہدری منظور الٰہی کی جائیداد قرق کر کے اس کی نیلامی کے ذریعے اسلم چیمہ کی رقم کی ادائیگی کا بندوبست کرنے کا حکم دیا۔ فرد تعلیقہ حسب آرڈر نمبر ۲۱ قاعدہ نمبر ۱۲ ضابطہ دیوانی کے تحت سینئر سول جج عابد حسین نے محمد اسلم چیمہ ولد محمد بخش بنام چوہدری منظور معرف Cebee انڈسٹریز پرائیویٹ لمیٹڈ راوی روڈ لاہور کو ۴۶ لاکھ روپے بمعہ ۲۸ فروری ۹۳ء سے لاگو مارک اپ کے ادا نہ کرنے کی صورت میں حکم جاری کیا کہ منظور الٰہی کی درج ذیل جائیداد کو قرق کر لیا جائے اور پھر اس کی نیلامی کے بعد رقم اسلم چیمہ کو ادا کی جائے۔

۱۔ Cebee انڈسٹریز اے، ۷۵ راوی روڈ لاہور۔

Marfat.com

۲۔ کوٹھی چوہدری منظور الٰہی واقع ظہور الٰہی روڈ ۳۱ر۳۰' گلبرگ ii لاہور۔

۳۔ ماڈرن فلور ملز واقع ۳۹ شالیمار لنک روڈ لاہور۔

۴۔ فیکٹری ڈیکورا کارپٹ واقع ۳۹ شالیمار لنک روڈ لاہور۔

اس دوران مذکورہ بالا عدالت نے قرقی کے جو وارنٹ جاری کیے' ان میں ۴۶ لاکھ روپے اصل زر' مارک اپ کی مد میں ۱۵ لاکھ ۴۷ ہزار ایک سو ۲۶ روپے' خرچہ مقدمہ ہذا ۴۲ ہزار ۵ سو ۷۲ روپے تھے۔ اس طرح عدالت کے حکم کے بموجب چوہدری منظور الٰہی کے ذمہ یکم جنوری ۹۵ء تک اسلم چیمہ کی کل رقم ۶۲ لاکھ ۱۶ ہزار ۷ سو ۲۸ روپے تھی جبکہ تقریباً ایک سال پورا گزر جانے کے باوجود چونکہ ابھی تک قرقی کے وارنٹ اور لاتعداد بار وارنٹ بلا ضمانت گرفتاری کے اجراء کا کوئی بھی مثبت نتیجہ نہیں نکل سکا تھا اور محتاط اندازے کے مطابق اس وقت اسلم چیمہ کی کل رقم بمعہ مارک اپ ۸۱ لاکھ روپے سے تجاوز کر چکی ہے۔

چوہدری محمد اسلم چیمہ نے بتایا کہ اس وقت اس کی رقم بمعہ مارک اپ ۸۲ لاکھ روپے کے قریب ہے لیکن ابھی تک حکومت یا عدالتیں چوہدری برادران سے ایک روپیہ بھی وصول نہیں کر سکیں۔ انہوں نے مزید بتایا وہ سینیٹر چوہدری شجاعت حسین سے ملے تو چوہدری شجاعت نے دھمکی دی کہ اس وقت حکومت ہمارے خلاف ہے جس کی وجہ سے تم ہم سے پیسے وصول کر لو گے لیکن جب ہم اقتدار میں آئیں گے تو نہ صرف ایک ایک پائی تم سے وصول کریں گے بلکہ تمہارا مکمل "حساب" چکا دیں گے۔

چوہدری خاندان اور قرضہ جات کی روایت

چوہدری ظہور الٰہی خاندان کے کاروباری و مالی معاملات کے متعلق پہلی مکمل تحقیقات میاں نواز شریف نے' وزیر اعلیٰ پنجاب کی حیثیت سے کرائیں۔ نواز شریف کی طرف سے خفیہ طور پر کرائی جانے والی ان تحقیقات کا مقصد پنجاب کی سیاست میں تیزی سے ابھرتے ہوئے اپنے سیاسی حریف خاندان کا محاسبہ کرنا تھا۔ میاں نواز شریف کی یہ تحقیقات آج بھی ایف آئی اے' انٹی کرپشن پنجاب اور پنجاب پولیس کے ریکارڈ میں محفوظ ہیں۔ اس تحقیقاتی ریکارڈ کے مطابق چوہدری ظہور الٰہی (مرحوم) کے بیٹے سینیٹر چوہدری شجاعت حسین سمیت پھالیہ شوگر ملز لمیٹڈ کے تمام ڈائریکٹروں پر الزام ہے کہ انہوں نے جعل سازی' دھوکہ دہی' اور غلط بیانی سے آئی پی سی سے ۳۰ کروڑ روپے کا قرضہ حاصل کیا

(اس الزام کی پاداش میں چوہدری شجاعت حسین اور چوہدری پرویز الٰہی گرفتار بھی کیے جا چکے ہیں)۔

چوہدری پرویز الٰہی کے مطابق ۱۹۸۸ء میں پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت نے آئی سی پی کی انتظامیہ پر دباؤ ڈال کر مذکورہ قرضے کی فراہمی روک دی تھی۔ چنانچہ مجبوراً ان لوگوں کو نیشنل انڈسٹریل کوآپریٹو فنانس کارپوریشن سے ۳۰ کروڑ روپیہ قرض لینا پڑا۔ جن دنوں چوہدری برادران نے نیشنل انڈسٹریل کوآپریٹو فنانس کارپوریشن سے پھالیہ شوگر ملز کے لیے ۳۰ کروڑ روپیہ قرض حاصل کیا انہی دنوں چوہدری برادران نیشنل انڈسٹریل فنانس کارپوریشن کے تقریباً ۱۰ کروڑ روپے کے نادہندہ تھے اور یہ رقم چوہدری برادران پر ۸۰ء سے واجب الادا چلی آ رہی تھی۔ جس کی ادائیگی کے بغیر ہی انہوں نے مزید ۳۰ کروڑ روپے حاصل کر لیا۔

چوہدری خاندان کے سربراہ چوہدری ظہور الٰہی (مرحوم) نے ایوب خان کے زمانہ اقتدار میں نیشنل بنک قوانین کو نظرانداز کرتے ہوئے ۳۳ لاکھ روپے قرض لیا۔ انہوں نے یہ قرض اپنی اولین انڈسٹری سی بی انڈسٹریز لمیٹڈ کے نام پر حاصل کیا اور مزے کی بات یہ ہے کہ مذکورہ انڈسٹریز اس وقت بھی نیشنل بنک ہی کے مختلف کھاتوں میں ۴۴ لاکھ روپے کی مقروض تھی، جب کہ اس وقت اس کے کل اثاثے ۱۰ لاکھ سے بھی کم تھے۔ چوہدری ظہور الٰہی کو قرض دینے میں حکومت کے "تعاون" کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس وقت سی بی انڈسٹریز کے اثاثوں کی کوئی چھان بین نہ کی گئی۔ نیشنل بنک کو سی بی انڈسٹریز لمیٹڈ کی جعلی آڈٹ شدہ بیلنس شیٹیں مہیا کی گئیں۔ اور جس آڈٹنگ کمپنی کی طرف سے یہ دستاویزات مہیا کی گئیں اس کا اصل میں کوئی وجود نہ تھا۔

پی پی ایل کا ادارہ حاصل کرنے کے بعد چوہدری ظہور الٰہی نے دیوالیہ قرار دی گئی کمالیہ شوگر ملز فیصل آباد کی ملکیتی زمین، سکریپ مشینری اور اجازت نامہ ۱۱ لاکھ روپے میں خریدا۔ اس کے ساتھ ملحق ۴۵۰ کنال اراضی بھی دیوالیہ قرار دی گئی تھی، جو کہ کمالیہ ملز کا حصہ نہ تھی جو چوہدری ظہور الٰہی نے خریدی تھی۔ مذکورہ اراضی کے حصول کے لیے چوہدری ظہور الٰہی نے کوششیں کیں اور حکومت کو یقین دلایا کہ اس زمین کو کمرشل نہیں کیا جائے گا۔ بعد میں یہ زمین صرف ۲ لاکھ روپے میں خرید لی اور رقم بھی غیر قانونی طور پر مذکورہ بالا ۱۱ لاکھ روپے کے سودے میں سے ادا کی گئی۔ ابھی ان تمام اثاثوں کا حسب معاہدہ سی بی انڈسٹریز کے نام انتقال نہیں ہوا تھا کہ چوہدری ظہور الٰہی نے یہ اثاثے سی بی انڈسٹریز کی طرف سے پی پی ایل کے نام ۲۷ لاکھ روپے میں منتقل کر دیے۔ اس کے بعد پھر پی پی ایل

کے نام پر نیشنل بنک ہی سے ۲۷ لاکھ روپے کا قرضہ لے کر اس میں سے سی بی انڈسٹریز لمیٹڈ کے نام نیشنل بنک آف پاکستان کے واجب الادا ۵۵ لاکھ روپے کے واجبات ادا کر دیے اور یوں ۱۲ لاکھ روپے کے اضافی "آمدن" چوہدری ظہور الٰہی کو حاصل ہوئی۔

چوہدری فیملی نے چونکہ سی بی انڈسٹریز لمیٹڈ کے نام پر ۶۱ء ہی میں قرضے حاصل کرنا شروع کر دیے تھے اس لیے انہوں نے ہمیشہ حکومت وقت کو خوش رکھنے کا انداز اپنایا' تاکہ کسی مالی بے ضابطگی کے بعد کی حکومتی باز پرس سے بچا جا سکے۔

۶۱ - ۱۹۶۰ء میں سی بی انڈسٹریز نے بنک آف بہاولپور سے چوہدری مجید کی وساطت سے جو اس وقت مذکورہ بنک کا منیجر تھا' ۸ لاکھ روپے کا قرض بنک کے ضابطے پورے کیے بغیر حاصل کیا۔ الائیڈ بنک جس نے ابھی ملک میں اپنا کام شروع کیا تھا' کی نیلا گنبد لاہور برانچ سے سی بی انڈسٹریز کے نام پر تین لاکھ روپے قرض حاصل کیا گیا۔ اسی دوران زرعی ترقیاتی بنک سے بھی دس لاکھ روپے کا قرض سی بی انڈسٹریز کے نام پر حاصل کیا۔ جب کہ کسی بھی مالیاتی ادارے پر یہ واضح نہ ہونے دیا گیا کہ سی بی انڈسٹریز نے کن کن اداروں سے قرض لے رکھا ہے۔ ۱۹۶۱ء میں ماڈرن فلور ملز لمیٹڈ کے نام پر پکک سے فلور ملنگ پلانٹ کی تنصیب کے لیے لاکھوں روپے کا قرض لیا گیا۔ ۱۹۶۶ء میں اسی پلانٹ کی توسیع اور تجدید کی خاطر اتنا ہی قرض دوبارہ حاصل کیا گیا۔

۸۴ء میں متروکہ وقف املاک بورڈ کے چیئرمین نے اپنے ایک محکمانہ خط میں اعتراف کیا کہ پرویز الٰہی ٹیکسٹائل ملز (ملکیتی سی بی انڈسٹریز) کے قبضے میں متروکہ بورڈ کی ۱۵ کنال اراضی ہے جس کے ایک حصے پر مل مالکان نے غیر قانونی طور پر ۳۱ عدد رہائشی کوارٹرز تعمیر کر لیے تھے۔ اس کے علاوہ پکی ٹھٹھی میں ۲۹ کنال اراضی کا معاملہ بھی سنگین نوعیت اختیار کر گیا۔ کیونکہ اس زمین کو چوہدری برادران نے بیک وقت کئی مالیاتی اداروں کے پاس قرض کے بعد رہن رکھا ہوا تھا۔ نیشنل انڈسٹریز فنانس کارپوریشن سے حاصل کردہ ۳۰ کروڑ روپے قرض کا معاملہ عدالت میں ہے جب کہ چوہدری برادران نواز شریف کی مسلم لیگ (ن) میں کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔

Marfat.com

روزگار سکیم میں نواز شریف اور بینظیر کی کرپشن

سیاستدانوں نے ملک کے بے روزگار نوجوانوں کی قرضہ سکیم "یوتھ انوسٹمنٹ پروموشن سوسائٹی" پر ہلہ بول دیا اور گزشتہ ایک سال کے دوران، جعلی شناختی کارڈوں اور بغیر کسی ٹھوس ضمانتی ثبوت کے، اڑھائی ارب روپے انفرادی اور اجتماعی قرضوں کی آڑ میں حاصل کر لیے۔ "یوتھ انوسٹمنٹ پروموشن سوسائٹی" کی ۹ سالہ تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا کہ کسی وفاقی حکومت نے قرضہ حاصل کرنے والوں کے لیے شروع دن سے عائد جائیداد کے ثبوت اور ٹھوس ضمانتوں کی پابندی ایک سال کے لیے ختم کر دی۔

پیپلز پارٹی کے جیالوں اور پی ایس ایف کے نوجوانوں کو بڑی مقدار میں قرضوں کی فراہمی کے بعد قرض دہندہ مالیتی اداروں کو شدید مالی بحران کا سامنا ہے کیونکہ بے نظیر دور حکومت میں ان کے جاری کردہ قرضوں کی واپسی کی شرح ۸۰ فیصد سے گر کر ۶۸ فیصد تک آ پہنچی۔ حکومتی تعاون کے ساتھ جیالوں کی اس لوٹ مار اور قرضوں کی واپسی کی شرح بہت نیچے گر جانے کے باعث "یوتھ انوسٹمنٹ پروموشن سوسائٹی" کو فنڈز دینے والے مالیاتی اداروں نے بھی راہ فرار اختیار کر لی۔

نیشنل ڈویلپمنٹ فنانس کارپوریشن اور فیڈرل کوآپریٹو بینک، جو مذکورہ ادارے کو فنڈز مہیا کرنے والے بڑے مالیاتی ادارے تھے، انہوں نے نئے مالی سال کے آغاز سے فنڈز کی فراہمی روک دی تھی۔ اس صورتحال میں "یوتھ انوسٹمنٹ پروموشن سوسائٹی" کو فنڈز کی فراہمی کا سارا بوجھ سمال بزنس فنانس کارپوریشن پر آن پڑا۔

سمال بزنس فنانس کارپوریشن کو بے نظیر حکومت نے ہدایت جاری کی کہ وہ اپنے دیگر منصوبوں میں کمی کر کے "یوتھ انوسٹمنٹ پروموشن سوسائٹی" کو ہر صورت میں دو ارب تیس کروڑ روپے کی سالانہ گرانٹ مہیا کرے۔

Marfat.com

۱۹۹۶ء کے شروع میں سمال بزنس فنانس کارپوریشن کے ایک اعلیٰ اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ وفاقی حکومت کو مجبور کیا جائے کہ وہ نئے سال کے آغاز سے اپنے کارکنوں کو دی گئی جائیداد کے ثبوت اور شخصی ضمانتوں کی رعایت واپس لے' قرضے واپس نہ کرنے والے عناصر کی پشت پناہی نہ کرنے کی یقین دہانی کرائے اور سمال بزنس فنانس کارپوریشن کی طرف سے قرضہ خوروں کی جائیداد کی قرقی جیسے اقدامات میں رکاوٹ نہ ڈالے۔ لیکن سرمایہ کاری کے وفاقی وزیر آصف علی زرداری نے سمال بزنس کارپوریشن کی تجویز رد کر دی اور قرضوں کے حصول کے لیے کوئی شرط عائد نہ کی گئی۔

سمال بزنس کارپوریشن کے ذرائع نے بتایا کہ نیشنل ڈویلپمنٹ فنانس کارپوریشن اور فیڈرل کوآپریٹو بینک کے انکار کے بعد سمال بزنس فنانس کارپوریشن کے لیے مشکلات پیدا ہوگئیں کیونکہ وفاقی حکومت کی طرف سے جائیداد کے ثبوت اور ٹھوس شخصی ضمانتوں کی بجائے پیپلز پارٹی کے عام کارکنوں کی ضمانت منظور کرنے کے غیر تحریری حکم کے بعد سیاستدانوں اور پی ایس ایف کے نوجوانوں کی بڑی تعداد نے ۲ لاکھ روپے کے انفرادی قرضوں کو نظرانداز کر کے ۲۰ لاکھ روپے کے اجتماعی قرضوں کو فرضی ناموں اور جعلی شناختی کارڈوں کی مدد سے حاصل کرنا شروع کر دیا۔

ایک سال تک وسیع پیمانے پر لوٹ مار کے بعد بے نظیر حکومت نے جائیداد کے ثبوت اور ٹھوس شخصی ضمانت کی رعایت کا فیصلہ واپس لے لیا اور "یوتھ انوسٹمنٹ پروموشن سوسائٹی" کو ہدایت جاری کی کہ وہ نئے مالی سال سے قرضہ حاصل کرنے والوں کی جائیداد اور شخصی ضمانتوں کے ثبوت کے بغیر قرضہ جاری نہ کرے۔

۱۹۸۷ء میں مرحوم وزیراعظم محمد خان جونیجو نے مارشل لاء دور میں سیاسی کارکنوں کی "افزائش" کے لیے "بے روزگار نوجوانوں" کے نام کا سہارا لے کر نئے مسلم لیگی کارکنوں اور اعلیٰ تعلیمی اداروں میں "برسرپیکار" ایم ایس ایف کے نوجوانوں کی مالی امداد کے لیے ۵۰ ہزار روپے کے انفرادی اور ۵ لاکھ روپے کے اجتماعی قرضوں کا اعلان کیا تھا۔ جو ادارہ اس مقصد کے لیے قائم کیا گیا اس کا نام "یوتھ انوسٹمنٹ پروموشن سوسائٹی" رکھا گیا' یہ شرط البتہ رکھی گئی کہ قرضہ حاصل کرنے والا چند درجن مجوزہ کاموں کے لیے شخصی ضمانت پر قرضہ حاصل کر سکتا ہے۔ جونیجو مرحوم کے دور تک اس نئی اسکیم سے قرضہ حاصل کرنے والوں کی تعداد بہت کم تھی۔ اسی تعداد کے تناسب سے "یوتھ انوسٹمنٹ پروموشن سوسائٹی" سے قرضہ حاصل کرنے والوں کے لیے قرضہ کی واپسی کے وقت مارک اپ کی شرح ۸ فیصد

Marfat.com

رکھی گئی۔

۱۹۸۸ء میں جب پیپلز پارٹی کی حکومت آئی تو اس نے "یوتھ انوسٹمنٹ پروموشن سوسائٹی" کو مزید فعال بنانے کے ارادے سے قرضے کی انفرادی شرح یعنی ۵۰ لاکھ روپے کو بڑھا کر ایک لاکھ روپے اور اجتماعی قرضے کی شرح ایک لاکھ روپے سے بڑھا کر ۱۰ لاکھ روپے کر دی۔ جبکہ واپسی کے وقت مارک اپ کی شرح میں اضافہ نہ کیا گیا اور وہ دو سال گزر جانے کے باوجود ۸ فیصد پر ہی قائم رہی۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق پیپلز پارٹی کے اس دور میں "یوتھ انوسٹمنٹ پروموشن سوسائٹی" سے تقریباً ۱۵ ہزار نوجوانوں نے ڈیڑھ ارب سے زائد کے قرضے حاصل کیے اور قرضے کی واپسی کی شرح ۸۰ اور ۸۵ فیصد کے درمیان رہی۔ صرف صوبہ سندھ میں "یوتھ انوسٹمنٹ پروموشن سوسائٹی" سے آسان شرائط پر قرضے حاصل کیے گئے۔ جب کہ پنجاب میں نواز شریف حکومت ہونے کی وجہ سے وفاق کی طرف سے اس پروگرام میں کوئی خاص سرگرمی کا مظاہرہ نہ کیا گیا۔

"یوتھ انوسٹمنٹ پروموشن سوسائٹی" کا سیاسی استعمال ۹۰ء میں میاں نواز شریف کی حکومت سے شروع جب ایم ایس ایف کے نوجوانوں اور مسلم لیگی سیاستدانوں نے دھڑا دھڑ قرضے حاصل کرنا شروع کر دیے۔ نواز حکومت نے ملک کے بیشتر مالیاتی اداروں کو پابند کر دیا کہ وہ "یوتھ انوسٹمنٹ پروموشن سوسائٹی" کو فنڈز مہیا کریں۔

اس دوران سوسائٹی کو ملنے والے سالانہ فنڈز ایک ارب روپے تھے۔ میاں نواز شریف دور میں پہلی بار "یوتھ انوسٹمنٹ پروموشن سوسائٹی" سے قرضہ حاصل کرنے والوں کی طرف سے جعلی شناختی کارڈوں کا استعمال شروع ہوا۔ بعد میں پنجاب میں خصوصاً جعلی شناختی کارڈوں کے ساتھ جعلی ضمانت نامے، جعلی سروس سرٹیفکیٹ، انکم ٹیکس کے جعلی سرٹیفکیٹ، جعلی مہروں کے ساتھ تیار کیے گئے اور ان کی مدد سے "یوتھ انوسٹمنٹ پروموشن سوسائٹی" سے بھاری قرضے حاصل کیے گئے۔ اس دوران قرضہ حاصل کرنے والے مسلم لیگی افراد اور ایم ایس ایف کے نوجوانوں کی اکثریت بیرون ملک منتقل ہوگئی جس سے قرضوں کی واپسی رک گئی۔

میاں نواز شریف حکومت کے خاتمے کے بعد "یوتھ انوسٹمنٹ پروموشن سوسائٹی" کے معاملات کی جانچ پڑتال شروع ہوئی اور معین قریشی کی نگران حکومت نے سوسائٹی کے قرضوں پر مارک اپ کی شرح ۸ فیصد سے بڑھا کر ۱۱ فیصد کر دی۔ اس کے علاوہ نگران حکومت نے قرضوں کو محفوظ بنانے کے لیے اور مستحق لوگوں تک قرضوں کی فراہمی آسان

Marfat.com

اور یقینی بنانے کے لیے قرضہ حاصل کرنے والوں کے لیے مطلوبہ قرضے کی دس فیصد رقم کا خود سے پیشگی بندوبست کرنے کی پابندی عائد کر دی۔ نیز شخصی ضمانت کی شرط کو بھی سخت کر دیا گیا۔ جب کہ سوسائٹی کو فنڈز دینے والے مالیاتی اداروں کو اختیار دیا گیا کہ وہ ہر دو ماہ باقاعدگی کے ساتھ قرضے حاصل کرنے والوں کی درخوستوں کی پڑتال کریں، نامکمل اور غیر تسلی بخش درخواستوں کو مسترد کر دیں اور کوشش کریں کہ ایسے افراد کو قرضہ جاری کیا جائے جو مستحق اور واپسی کی اہلیت رکھتے ہوں۔

۹۳ء میں پیپلز پارٹی کی دوسری بار حکومت قائم ہوئی تو بے نظیر سمیت دوسرے پارٹی رہنماؤں کی طرف سے یہ بیان جاری کیے گئے کہ پارٹی کے "پسے" ہوئے کارکنوں کی بہبود پر بھرپور توجہ دی جائے گی اور ان کی ہر ممکن امداد کی جائے گی۔ ساتھ ہی قرضہ اسکیموں سے آسان شرائط پر قرضہ جاری کرنے کے اعلانات بھی کیے گئے۔ اس سلسلے میں پیپلز پارٹی کی حکومت کی سب سے پہلی نظر "یوتھ انوسٹمنٹ پروموشن سوسائٹی" پر پڑی جو نواز شریف دور میں دیوالیہ ہونے تک پہنچ گئی تھی اور اب معین قریشی حکومت کے اقدامات کے باعث اس کی حالت سنبھل چکی تھی۔

۸ جنوری ۹۴ء کی وفاقی وزیر داخلہ نصیراللہ بابر نے کہا کہ وفاقی حکومت ملک بھر کے پڑھے لکھے بیروزگار نوجوانوں کو تیرہ سو روپے فی کس "بیروزگاری الاؤنس" دے گی۔ وفاقی وزیر داخلہ کے بقول وفاقی حکومت نے اس مد میں ۱۲ ارب روپے مختص کر دیے ہیں۔ چند دنوں کے بعد پیپلز پارٹی کے اعلیٰ عہدیداروں کا ایک اجلاس ہوا جس میں وزیراعظم بے نظیر بھٹو نے بھی شرکت کی۔ دوران اجلاس جہانگیر بدر، ناہید خان، این ڈی خان، سلمان تاثیر اور دیگر رہنماؤں نے وزیراعظم بے نظیر بھٹو سے مطالبہ کیا کہ حکومت کا اعلان کردہ "بیروزگاری الاؤنس" پیپلز پارٹی کے پڑھے لکھے اور مارشل لاء دور کے "محروم" نوجوانوں کے لیے فائدہ مند نہیں ہوگا۔ ایک ارب روپے کی رقم کو پیپلز پارٹی اور پی ایس ایف سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں تک محدود رکھا جائے۔ اس کے بعد اجلاس میں متفقہ طور پر فیصلہ کیا گیا کہ ایک ارب روپے کی یہ رقم "یوتھ انوسٹمنٹ پروموشن سوسائٹی" کے ذریعے پیپلز پارٹی کے بے روزگار نوجوانوں کو دی جائے گی۔ تقریباً آٹھ ماہ میں ایک ارب روپے کی یہ خطیر رقم پیپلز پارٹی کے جیالوں میں ۲ لاکھ روپے کے انفرادی اور ۲۰ لاکھ روپے کے اجتماعی قرضوں کی صورت میں تقسیم کر دی گئی۔ جس کے بعد "یوتھ انوسٹمنٹ پروموشن سوسائٹی" کے پاس فنڈز نہ رہے کہ وہ مزید جیالوں کو قرضہ فراہم کرتی۔

Marfat.com

۹۴ء کے آخر میں وفاقی حکومت نے ایک ہنگامی اجلاس میں یہ فیصلہ کیا کہ "یوتھ انوسٹمنٹ پروموشن سوسائٹی" کو دی جانے والی گرانٹ میں اضافہ کیا جائے۔ لہٰذا فوری طور پر "یوتھ انوسٹمنٹ پروموشن سوسائٹی" کی سالانہ گرانٹ ایک ارب اٹھارہ کروڑ پچاس لاکھ روپے سے بڑھا کر، دو ارب تیس کروڑ روپے کر دی گئی۔ یوتھ انوسٹمنٹ کے صوبائی سربراہوں کو غیر تحریری ہدایت جاری کر دی گئی کہ وہ قرضوں کی منظوری کے وقت پیپلز پارٹی کے کارکنوں، ایم این اے، ایم پی اے اور سینیٹرز حضرات کا خصوصی خیال رکھیں۔ آج سے پیپلز پارٹی سے تعلق رکھنے والے امیدواروں کے قرضہ فارموں پر پی پی کے رہنماؤں کی تصدیق دیکھی جائے، ان سے جائیداد یا شخصی ضمانت کا ثبوت طلب نہ کیا جائے۔ دسمبر ۹۴ء سے لے کر ۹۶ء کے آغاز تک ان ہدایات پر "صدق دل" سے عمل ہوتا رہا اور یوں قرض حاصل کرنے والوں کی جو تعداد جون ۹۴ء میں تقریباً ۴۵ ہزار اور قرض کی رقم تقریباً ساڑھے چار ارب روپے تھی، وہ ۹۶ء کے آغاز تک بڑھ کر تقریباً ۶۵ ہزار قرض داروں اور ساڑھے چھ ارب روپے کی رقم تک پہنچ گئی۔

اس دوران ۶۰ فیصد لوگوں نے جعلی شناختی کارڈوں اور دیگر جعلی دستاویزات پر قرضہ حاصل کیا اور ان کی بڑی تعداد بیرون ملک خصوصاً یورپ منتقل ہوگئی۔ کیونکہ ایک سال کی چھوٹ کے بعد قرضوں کی واپسی شروع ہوتی ہے اور ابھی تک جعلی قرضے حاصل کرنے والوں کے ردعمل کا اندازہ نہیں ہوسکا۔ لیکن پھر بھی قرضوں کی واپسی کی شرح ۸۰ فیصد سے گر کر ۶۸ء۲۰ فیصد تک پہنچ گئی ہے۔

۹۵ء کے دوران پیپلز پارٹی اور پی ایس ایف کے رہنماؤں کی طرف سے اپنے دفاتر اور رہائش گاہوں پر "قرضہ دلاؤ کمیٹیاں" کام کرتی رہیں جو ۲۰ یا ۲۵ فیصد کمیشن حاصل کر کے لوگوں کو فوری قرضے دلواتی رہیں۔ امیدوار قرضے کی رقم کا چیک وصول کرتے ہی کمیشن کی رقم مذکورہ رہنماؤں کے حوالے کر دیتے تھے۔ پیپلز پارٹی کے رہنماؤں کی اس مداخلت کو دیکھتے ہوئے "یوتھ انوسٹمنٹ پروموشن سوسائٹی" کے اعلیٰ عہدیداروں نے بھی کمیشن حاصل کر کے قرضوں کی فراہمی کو آسان بنایا۔ ۹۵ء کے سال میں اڑھائی ارب روپے سے زائد قرضہ حاصل کرنے والوں میں ۹۰ فیصد لوگ پیپلز پارٹی کے رہنماؤں کی وساطت سے آئے۔ جبکہ بقیہ دس فیصد افراد کو "یوتھ انوسٹمنٹ پروموشن سوسائٹی" کے عہدیداروں نے قرض دلوایا۔ ان افراد میں اکثریت کے شناختی کارڈ اور دستاویزات جعلی تھیں۔

پی ایس ایف کے ایک لیڈر نے مجھے بتایا کہ مارشل لاء دور میں پیپلز پارٹی کے

Marfat.com

کارکنوں نے جو بے لوث قربانیاں دی ہیں اس کے صلہ میں ان لوگوں کو بھی کچھ ملنا چاہیے اور زندہ رہنے کے لیے ان افراد کی امداد ضروری ہے۔ اگر میاں نواز شریف اور ان کے حواری ملک کے تمام بینکوں، کواپریٹو سوسائٹیوں اور ترقیاتی و مالیاتی اداروں سے بھاری قرضے حاصل کر سکتے ہیں تو پیپلز پارٹی کے غریب کارکن "یوتھ انوسٹمنٹ پروموشن سوسائٹی" سے معمولی نوعیت کے قرضے کیوں نہیں لے سکتے۔

دسمبر ۹۵ء میں وزیراعظم بے نظیر بھٹو نے ایف آئی اے کو ہدایت کی کہ وہ سمال بزنس فنانس کارپوریشن اور "یوتھ انوسٹمنٹ پروموشن سوسائٹی" میں جاری بدعنوانیوں اور گھپلوں کی تحقیات کرے۔ اس سلسلے میں ایف آئی اے حکام کی طرف سے ایک تحقیقاتی کمیٹی بھی تشکیل دی گئی۔ فروری ۹۶ء کے شروع میں ایف آئی اے کی اس تحقیقاتی کمیٹی کو تحقیقات سے روک دیا گیا۔ وزیر اعظم کے شوہر آصف علی زرداری نے پیپلز پارٹی کے ایم این اے اور سینیٹر حضرات کی خواہش پر "یوتھ انوسٹمنٹ پروموشن سوسائٹی" میں گھپلوں کی تحقیق کرنے والی ایف آئی اے کی ٹیم کو اپنی تحقیقات کچھ عرصہ کے لیے موخر کرنے کا حکم دے دیا۔

"یوتھ انوسٹمنٹ پروموشن سوسائٹی" پنجاب کے سربراہ شاہد احمد نے بتایا کہ سیاستدان کے دباؤ سے انکار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ہمارے نظام میں یہ فطری امر ہے کہ برسر اقتدار سیاسی پارٹی کے ارکان اپنے کام کروانے کے لیے اداروں پر سیاسی دباؤ ڈالتے ہیں۔ لیکن قرضوں کی منظوری اور امداد دینے والے مالیاتی ادارے اپنا مفاد بھی مدنظر رکھتے ہیں۔ کرپشن تو ہر جگہ موجود ہے اور میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ "یوتھ انوسٹمنٹ پروموشن سوسائٹی" میں کرپشن نہیں ہوئی جبکہ ہمارے پاس جعلی شناختی کارڈ چیک کرنے کا کوئی موثر طریقہ کار موجود نہیں ہے۔

Marfat.com

Marfat.com

تاریخ اور سیاست پر تخلیقات کی بہترین کتابیں

سو عظیم آدمی	مائیکل ہارٹ ترجمہ عاصم بٹ	250 روپے
مختصر تاریخ عالم	ایچ جی ویلز	200 روپے
پاکستان ٹوٹ جائے گا؟	منیر احمد	250 روپے
تاریخ پنجاب	سید محمد لطیف	500 روپے
تاریخ لاہور	سید محمد لطیف	300 روپے
آگرہ اکبر اور اس کا دربار	سید محمد لطیف	230 روپے
شیر شاہ سوری اور اس کا عہد	کالکا رنجن	250 روپے
ہندی مسلم تہذیب	قاضی جاوید	170 روپے
ہندوستان	ول ڈیورانٹ	160 روپے
بلوچ	م ک پیکولین	120 روپے
ہند میں انگریز ریاست	پینڈرل مون	80 روپے
انسانی تمدن کی داستان	باری علیگ	80 روپے
تاریخ عالم پر ایک نظر	جواہر لعل نہرو	160 روپے
تلاش ہند	جواہر لعل نہرو	250 روپے
میری کہانی	جوہر لال نہرو	280 روپے

Marfat.com

تاریخ کیا کہتی ہے	ڈاکٹر مبارک علی	35 روپے
غلامی اور نسل پرستی	ڈاکٹر مبارک علی	35 روپے
المیہ مشرقی پاکستان اور ذوالفقار علی بھٹو	وسیم گوہر	200 روپے
لیبیا سازش کیس	افضل توصیف	100 روپے
احمد شاہ ابدالی	گنڈا سنگھ	200 روپے
سفرنامہ مارکو پولو	مارکو پولو	180 روپے
سفرنامہ ہند	خالدہ ادیب خانم	180 روپے
سقراط	کوداسین	90 روپے
مہاراجہ رنجیت سنگھ	نریندر کرشن	100 روپے
ابن رشد و فلسفہ ابن رشد	رینان	180 روپے
گواہی	وسیم گوہر	120 روپے
سفرنامہ ابن بطوطہ	ابن بطوطہ	200 روپے
اسلامی تاریخ و تہذیب	باری علیگ	90 روپے

Marfat.com